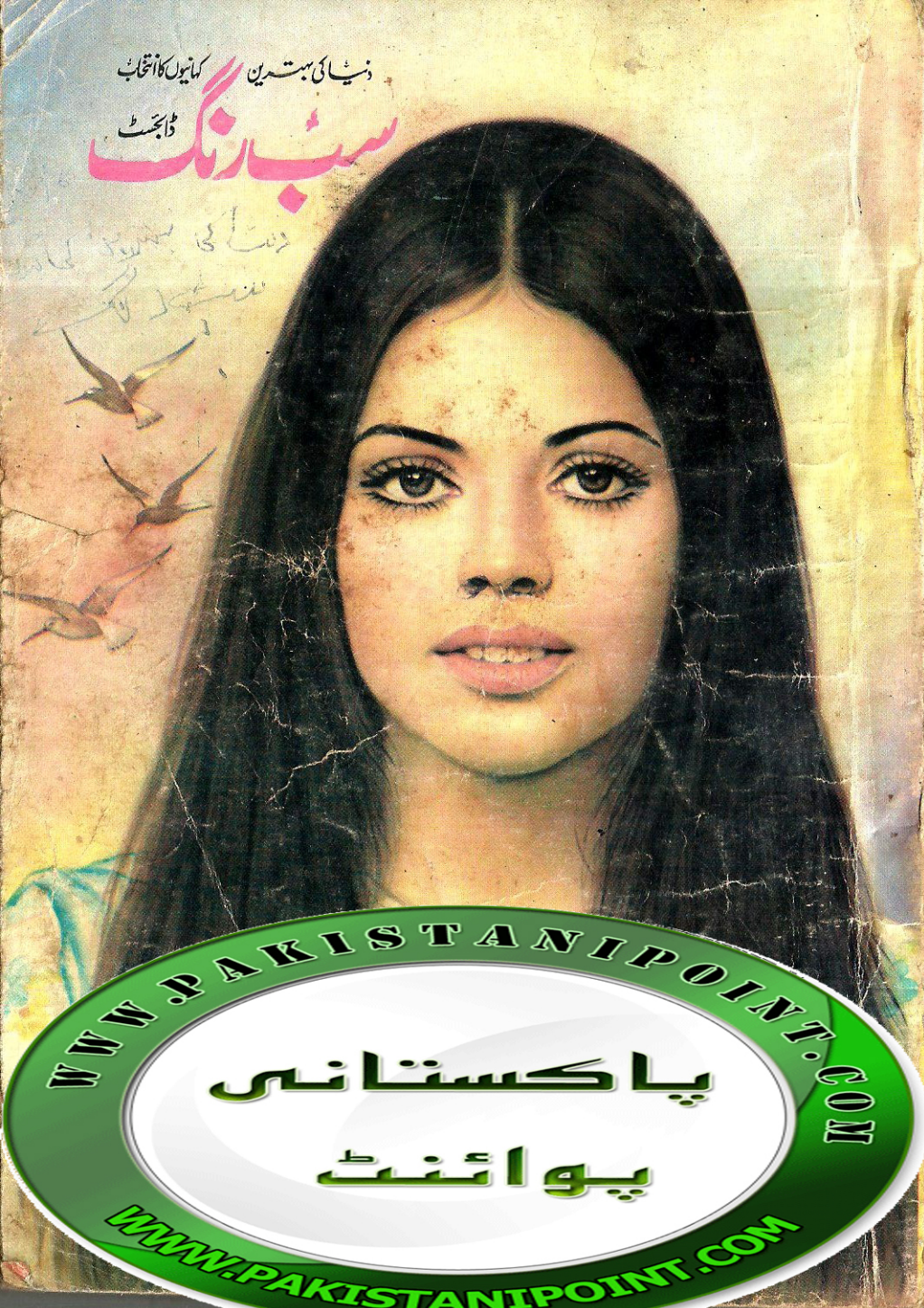

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی
پوائنٹ
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

۹/۱۱ علم کی قبا / ذاتی صفحہ
اداریہ / شکیل عادل زادہ

لکھنؤ کے ایک عاشق مزاج بادشاہ کے شبستان کا احوال
اودھ کی رنگین راتوں کے قصے تاریخ کے سچے واقعات
۱۲ جانِ عالم کا پری خانہ
الیاس سیتا پوری

سب رنگ کی منتخب کہانیاں اُردو ادب کا عطر ہیں
اس ماہ کے لیے شعور انوار کا انتخاب ۳ یادگار کہانیاں
۳۹ نفسِ امّارہ
علی عباس حسینی

ناراض وقت کے لیے ایک دلچسپ چٹکلا
دو شریر بوڑھوں کی شوخیاں
۷۶ گرانی الاؤنس
جاوید مرتضیٰ

فنّ اور فنّ کار
۸۶ اقبال مہدی
غازی صلاح الدین / شکیل عادل زادہ

تاریک برِاعظم کا افسوں سب رنگ کا تحیر خیز پُراسرار سلسلہ
ایک عزب نوجوان کی خوں رنگ سرگزشت
۸۸ اقابلا
جابر بن یوسف الباقر

شمارہ - ۴ ○ جلد - ۵ ○ فی پرچہ - ۳ روپے ○ زرِ سالانہ - ۳۳ روپے ○ سرِورق طباعت - ایلیٹ پبلشرز لمیٹڈ ○ پبلشر - شکیل عادل زادہ نے شرف الدین بگھیو کے اہتمام میں

فون نمبر ــــ ۲۲۵۸۴۴ تار کا پتہ ــــ "سب رنگ کراچی"

خُداکی بستی کے خالق کی ایک اور دل کش کہانی
اُس نوجوان کی داستان جو ہر جگہ مطلوب ہے
٤٦ ضرورت ہے
شوکت صدّیقی

تیسری مُنتخب کہانی؟
ہمارے خاندان کا ایک واقعہ
٥٥ آرسی مصحف
ھیرانند سوز

روشنی کے لیے روشن باتیں
مُنصُور حلاج سوانح، کرامتیں
٦١ انا الحق
ضیا تسنیم بلگرامی

غم زدوں کے لیے ایک تمثیلی کہانی
عالمی شہرت یافتہ ادیب ہنری سلاسر کی ایک مُنفرد کہانی
١١٠ عہد برآ
شم جمیل

سب رنگ کا سب سے مقبُول سلسلہ
ایسے واقعات جو پہلے نہیں لکھے گئے، ایک شخص کی ہولناک آپ بیتی
١٢٠ انکا
جمیل احمد خان

خوش ذوق قارئین کے لیے دُنیا کی ایک عظیم کہانی
اس ماہ کی خاص کہانی
١٤٦ قبر کی دُنیا
ضیاء الرّشید

ان ہیرالڈ پریس ضیاالدین روڈ کراچی سے چھپوا کر ۵ سی ۴/۱۳ ناظم آباد سے شائع کیا ○ پتہ ۔ ۴۷-۴۸ پریس چیمبرز، آئی آئی چندریگر روڈ کراچی ○ ذیلی دفتر ۔ لطیف ہاؤس کرشن پورہ پشاور
رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

نیا
پام روز
ٹائیلٹ صابن
آپکے
رنگ و رُوپ کی
حفاظت کرتا ہے
PALMROSE
گرمی، سردی، خشکی اور دھول سے آپ کی جلد کو
نقصان پہنچ سکتا ہے۔ نیا پام روز ٹائیلٹ
صابن ہر موسم میں آپ کی جلد کی حفاظت کرتا
ہے اور گلاب کے پھول کی مانند نرم، ملائم
اور شگفتہ بھی رکھتا ہے۔ نیا پام روز آپ کے
رنگ و روپ اور چہرے کی دلکشی و رعنائی کے لئے
لاجواب ہے۔ نئے روپ اور نئے نکھار کے لئے
آج ہی نیا پام روز ٹائیلٹ صابن استعمال کیجئے۔
آپ پام روز کی نئی دلفریب خوشبو کو بھی یقیناً پسند کریں گے
کریسنٹ پاک انڈسٹریز لمیٹڈ۔ کراچی، چٹاگانگ

علم کی قبا

اگر کاغذ ایجاد نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟
اگر کاغذ ایجاد نہ ہوتا تو ہم صدیوں پہلے کے کسی سماج میں ہوتے۔ نہ علوم و فنون کی یہ ترقی ہوتی نہ دُنیا کی یہ خیرہ کن سجاوٹ ہوتی۔ بات بڑی ابتدائی ہے لیکن اُسے دُہرانے کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔ جب سے مشرقی پاکستان کا سقوط اور بنگلا دیش کا قیام عمل میں آیا ہے، اس ملک میں کاغذ کا قحط پڑ گیا ہے۔ اِس سانحے کو دو سال سے زیادہ مدّت گزر گئی۔ روز یہ مسئلہ سنگین ہوتا جا رہا ہے۔

یہ کہہ کے دل کو تسلّی نہیں دی جا سکتی کہ کاغذ عالمی بُحران کی زد پر ہے۔ دُنیا کے دوسرے ملکوں کے پاس ذرائعِ ابلاغ کی کثرت ہے، وہ اپنا کام کسی اور طرح چلا لیں گے۔ اُنھیں اس شدّت کا اندازہ نہیں ہو گا کہ ترقی یافتہ ممالک کے پاس پہلے ہی کتابوں کا عظیم ذخیرہ موجود ہے۔ ہمارے پاس کیا ہے؟ ہم نے تو ابھی گھٹنوں گھٹنوں چلنا اور تُتلا کے بولنا شروع کیا ہے۔ ایسے ابتدائی زمانے میں کاغذ نایاب ہو جائے تو کیا ہو گا؟ جن لوگوں کو بچڑے کے مشکل سے اس عمل پر راضی کیا گیا ہے، ان کا دل اُچاٹ ہو جائے گا۔ چھ کروڑ لوگوں کو کہاں کہاں اور کب تک فلمیں دکھائی جائیں گی اور نغمے سُنوائے جائیں گے۔

درسی کتب نایاب ہیں اور اتنی گراں ہو گئی ہیں کہ عام آدمی کی دسترس سے باہر ہیں۔ تخلیق کا کام مندا پڑ گیا ہے۔ رسالے اور اخبار سسک رہے ہیں۔ کاغذ حاصل کرنا تخلیقی اور علمی مراحل سے مشکل مرحلہ بن گیا ہے۔ اگر یہی صورت کچھ اور وقت جاری رہی تو خطرناک سماجی شگاف پڑ جائیں گے وہ معاشرہ جو تیک رَوی سے اپنی منزل کی طرف گام زن نظر آتا ہے، ٹھہر جائے گا۔ اس جمود کی ہولناکی کا تصوّر کیجیے۔

کاغذ کی افراط اس قدر ہونی چاہیے کہ علمی، فنی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کو خوب کُھل کھیلنے کا موقع ملے۔ گلی گلی سے اخبار نکلیں، گھر گھر سے علمی مجلّے شائع ہوں، کوچے کوچے کتابیں تخلیق ہوں، کسی تہذیب کی سب سے قیمتی متاع کتابیں ہوتی ہیں۔ کتابیں جتنی زیادہ ہوں گی، اتنا ہی وہ معاشرہ اپنی قدر و منزلت اقوامِ عالم میں بڑھائے گا اور ہمیشہ غالب رہے گا۔

یہ تخلیقی جوشش کاغذ پر منتقل نہیں ہو گا تو سَرد پڑ جائے گا۔ اور یہ ایک المیہ ہو گا۔ نظریات، عقاید اور ارتقا کی جنگ کاغذ کے ذریعے لڑی جاتی ہے، انقلاب کاغذ ہی کے ذریعے لایا جاتا ہے۔

آج سے دو سال پہلے کسی طرف سے یہ خوش آیند خبر آئی تھی کہ گنتے کے پھوگے سے پاکستان میں اخباری کاغذ کا کارخانہ قائم کیا جا رہا ہے۔ وہ خبر ایک افواہ ہی ثابت ہوئی۔ کاغذ کا کارخانہ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا شکر، سُوت اور فولاد کا۔ نئی زندگی کا سفر کاغذ کے بغیر کیسے طے ہو گا۔ دو سال میں کاغذ سے ہونے والے قومی نقصان کا اندازہ لگایا جائے تو بڑی اذیت ناک حقیقتیں سامنے آئیں گی۔ بدقسمتی سے ایسے کسی سروے کا دستور اس ملک میں نہیں ہے۔ کاغذ ہماری بنیادی ضرورتوں میں شامل ہے، حیرت ہے اس مسئلے پر اتنی کم توجہ کیوں دی جا رہی ہے؟ آنے والی نسل کو دینے کے لیے ہمارے پاس کیا رہ جائے گا۔

تازگی دلکشی بانکپن
گرمیوں کا نیا پیرہن
گل احمد لان
اب کی گرمیوں میں آپکا حسن انتخاب
گل احمد ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

سب رنگ کا شمار ادبی رسالوں میں ہوتا ہے یا نہیں؟

یہ پہیلی بڑی دلچسپ ہے۔ آئیے آج اسے بوجھیں۔ بہت دنوں سے اس معمے نے مختلف اخبارات و رسائل کو اُلجھایا ہوا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ڈائجسٹ ادبی رسالوں کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس احاطے میں ان کا داخلہ ممنوع ہے کیونکہ وہ چٹخارے دار اور بارہ مسالے کی چیزیں شائع کرتے ہیں۔ میں دوسرے ڈائجسٹوں کی بات نہیں کرتا اور نہ میں ڈائجسٹ پرچوں کا ترجمان یا نمائندہ ہونے کا دعوے دار ہوں۔

میں اپنی بات کرتا ہوں۔ سب رنگ کے اجرا کے وقت ڈائجسٹ لفظ کا اضافہ اس لیے کر دیا گیا تھا کہ یہ ماہنامہ اپنی ہیئت اور حلیے کے اعتبار سے مروجہ ڈائجسٹ رسالوں سے مطابقت رکھتا تھا اور اس طرح صرف اپنے لیے لکھوائی ہوئی یا ترجمہ کی ہوئی تحریروں کی اشاعت کی پابندی سے بھی مستثنیٰ ہو جاتا تھا۔ لفظ ڈائجسٹ کی روایت سے اچھے مضامین اور اچھی کہانیاں منتخب کرنے کی رعایت حاصل کر لی گئی تھی۔ ابتدائی دنوں میں ہر نئے کام کی طرح سب رنگ کو اپنا درجہ اور معیار مقرر کرنے میں دشواری پیش آئی۔ کچھ اوٹ پٹانگ قسم کی حرکتیں بھی ہوئی ہوں گی مگر جلد ہی ان پر قابو پا لیا گیا اور رفتہ رفتہ تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ پھر اس نے قارئین کے خوف سے بے نیاز ہو کے اپنی پسند کی چیزیں بھی پیش کرنے کی جسارت کی اور ایسی تحریریں اور ایسے نام بھی متعارف کرائے جنھیں لوگ اس حلیے کے رسالوں میں چھپتے ہوئے دیکھتے تھے۔ یہ جسارتیں جس قدر سراہی گئیں اس کا اندازہ اشاعت کے غیر معمولی اضافے سے کیا جا سکتا ہے۔ سب رنگ نے اردو کی موجودہ صحافتی تاریخ میں ایک حیرت انگیز مثال قائم کی۔ اب اگر سب رنگ کی لوح سے ڈائجسٹ کا لفظ خارج کر دیا جائے تو پرچے کے تن و حسن، مقبولیت میں کیا فرق واقع ہو گا؟ اہلِ بینش ہی جواب دے سکتے ہیں۔ ایک لفظ کتنا اثر کرتا ہے۔ پھر شاید سب رنگ کو کوچۂ ادب میں داخلے کا پروانہ عطا ہو جائے۔

تو میں نے سب رنگ کے ساتھ ڈائجسٹ لفظ کے الحاق کی صراحت کر دی لیکن میں ایک اور بات کہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس لفظ کی طلاق کے بعد بھی سب رنگ کا شمار ادبی رسائل میں نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی کچھ منطقی اور فلسفیانہ وجوہ ہیں۔ اس مختصر صفحے میں ان پر بحث کرنا ممکن نہیں ہے تاہم موٹی موٹی باتیں عرض کی جا رہی ہیں۔ سب رنگ ایک ادبی رسالہ نہیں ہے کیونکہ یہ ویسا نہیں ہے جیسے ادبی رسائل ہمارے ہاں شائع کرنے کا رواج ہے۔ اس کا سانچہ وہ نہیں ہے جو ادب کے جدید عالموں نے مستند قرار دیا ہے۔ اس کا حلیہ وہ نہیں ہے جو ادبی رسائل کے لیے لازم ہے۔ کوئی قدر تو مشترک ہو۔ اس میں ادبی رسائل سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ اور ثقہ، مبہم، خشک تحریریں شائع نہیں کی جاتیں جو ادبی رسائل کا طرۂ امتیاز ہے۔ سب رنگ فوٹو آفسٹ طباعت میں السٹریشن کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ ایک اختلاف نہیں، بہت سے اختلاف ہیں۔ سب رنگ کے پاس کثیر عملہ ہے اور اس کے منتظمین کو باریک بینی کی بُری عادت ہے اور اس کے مدیر کو ہر وقت یہ خوف ستاتا ہے کہ اس کی منتخب سطروں کی ترسیل ہو رہی ہے یا نہیں؟ سب رنگ معاوضہ بھی دیتا ہے۔ یہ بڑے نام کے ادیبوں کی تخلیقات مروت میں بھی شائع نہیں کرتا۔ سب رنگ کے مدیر کے بڑے ادیبوں کے ساتھ ویسے بھی تعلقات نہیں اور اسے گزارش کرنے کی جرات بھی نہیں کہ ان تھوڑے بہت تعلقات پر بھی حرف آ جائے گا۔ سب رنگ میں شاعری بھی نہیں کی جاتی، اردو ادب جس کے بغیر مکمل نہیں۔ اس میں جرم و سزا، پُراسرار موضوعات اور ڈرانے دھمکانے والی تحریریں شائع ہوتی ہیں جن کا ہماری زندگی سے تعلق مسلّم ہے مگر ادب سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اس میں ادب کی بحثیں نہیں ہوتیں اور میر کی شاعری کے بعدِ ششم پر آزادانہ تنقید نہیں کی جاتی۔ اس میں غالب کے پرنسے نہیں اڑائے جاتے۔ سب رنگ کا مدیر فاقہ نہیں کرتا جو ادب کے لیے کرنا پڑتا ہے جو ادب کی ریاضت ہے۔ سب رنگ کیوں اتنی تعداد میں نکلتا ہے؟ یہ بھی ایک وجہِ نزاع ہے۔ سب رنگ میں ادبی رسائل سے منتخب کر کے جو کہانیاں شائع کر دی جاتی ہیں، ایک ادبی رسالے کے مدیر سرِ دبیر کا ارشاد ہے کہ وہ چٹخارے دار رسالے کے ساتھ چل جاتی ہیں گر یوں تو اُن میں کوئی جان نہیں ہوتی۔ یہ ان تحریروں کے ساتھ سراسر ظلم ہے کہ سب رنگ میں شائع ہو کے وہ اپنا مقام کھو دیتی ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ ایک خاص بات یہ ہے کہ سب رنگ کا مدیر شکیل عادل زادہ ہے جو عجیب پاگل شخص ہے جس نے ادب کے کوچے پر شب خون مارا ہے۔ یہ شخص شب و روز بھوت کی طرح اپنے کام سے چمٹا رہتا ہے۔ اس کے بال بھی چھوٹے ہیں، یہ شراب پی کے اُچھلتا کودتا بھی نہیں اور ادبی محفلوں میں اس کا گزر نہیں ہوتا۔ یہ ادیبوں اور شاعروں کی انجمنِ ستائشِ باہمی کا رکن بھی نہیں۔ اس کی تحریریں موسمی ہیں، ادبی رسالے سدا بہار تحریریں شائع کرتے ہیں۔ سب رنگ صحافت ہے، ادبی رسائل ادب ہیں۔

اور ادب کیا ہے؟ دنیا کی مختلف تہذیبوں اور زبانوں میں اس کے کچھ بھی معانی ہوں مگر ہمارے ملک اور اردو میں ادب وہی ہے جو ادبی رسائل میں شائع ہوتا ہے۔ سب رنگ ادبی رسالہ نہیں، پس اس کی تحریریں بے ادب ہیں۔ ادب کی یہی تعریف ہمارے ہاں کی جاتی ہے۔ سو دوستو! آپ اور میں سب نئے خیال کے لوگ ہیں۔ یہ حکیمانہ باتیں ہیں، میں وہی کچھ شائع کرتا رہوں گا جو آپ کی سمجھ میں آئے گا اور آپ وہی پڑھتے رہیں گے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔ اپنا کارواں تو شان و شوکت سے جاری ہے۔ میں نے یہ رسالہ آپ کے لیے نکالا ہے، میں اسے آپ سے دور کرنا نہیں چاہتا۔ میں اسے ادبی رسالہ بنانا نہیں چاہتا۔ یہ ایک ادبی پرچہ قطعاً نہیں ہے۔ مجنوں گورکھپوری، جمیل جالبی، شوکت صدیقی، ابن انشا، اشفاق احمد، مرزا ادیب، احسان دانش، سید وقار عظیم، الطاف علی بریلوی، ابراہیم جلیس، کمانڈر انور اور دوسرے بزرگ، یہ لوگ مروت میں جھوٹ بولتے ہیں۔ میں ان کے پیغامات اور تاثرات اسی لیے شائع نہیں کرتا۔

ہاں اس ملک میں چند لوپٹی ڈائجسٹ بھی نکلتے ہیں جو غلطی سے یہاں شائع ہونے لگے ہیں کہ وہی ان کی بے تکلفیوں اور شوخیوں کے لیے موزوں جگہ ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کر دیا ہے کہ میں دوسرے ڈائجسٹوں کے اعمال کا سزاوار نہیں۔ میں نے تو اپنی بات کی ہے۔

عشق کی باتیں اگلے ماہ۔ یہ عشق ہی تو جی کو جلاتا ہے، جو جی میں آیا کہے جاتا ہوں۔

اس بار میری دید کے ٹکٹ میں پچاس پیسے کا اضافہ ہو گیا ہے۔ گویا اب یہ تماشا آپ پچاس پیسے زائد ادا کر کے دیکھیں گے۔ گرگ گرانی کا یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ مسئلہ عالم گیر ہے۔ سب رنگ کا تعلق بھی اسی دنیا سے ہے۔ عزیزم افضال مہدی کا کہنا ہے، ہم کیا کریں۔ ہاں ہم کیا کریں، دنیا ترقی پہ ہے۔ ہر چیز اوپر کی طرف جا رہی ہے۔ ہم کیوں پیچھے رہیں۔ اگر آپ کو اس کھیل سے لطف آتا ہے تو اسے دل و جان سے قبول کیجیے ورنہ دل و جان سے انکار کر دیجیے۔ ہم بھی اپنی دکان بڑھا لیں گے۔ کس کا جی خوش ہوتا ہے کہ وہ ناپسندیدہ فیصلے کرے، ناراضیاں مول لے۔ تاہم بنگلا دیش کی طرح حقیقتیں تسلیم کرنی پڑتی ہیں۔

رات۔۔ اپنا سفر ختم کر رہی تھی، پچھلے پہر کا سناٹا آخری سانسیں لے رہا تھا۔ لکھنؤ کے گلی کوچے سنسان اور اداس تھے۔
کسی کسی لمحے کہیں دور سے شہر کوتوال کے قرنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی، فضا ابر آلود تھی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں ذرا ذرا وقفے سے پھوار بھی شامل ہو جاتی تھی۔ اسی عالم میں گولہ گنج کی طرف سے ایک بگھی آتی دکھائی دی۔ بھاری بھرکم بڑے توند والا شہر کوتوال چوکنا ہو گیا بگھی کے پہیوں اور گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ اس نے اپنے گھوڑے کو ایک دکان کی آڑ میں کھڑا کر لیا اور بگھی کی آہٹ پہ کان لگا دیے۔ شہر کوتوال نے اپنے گھوڑے کی لگام نہایت مستعدی سے یوں پکڑ لی جیسے گھڑ دوڑ کے سوار مستعد اور چوکس لگام پکڑے گھڑ دوڑ کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں۔ ذرا دیر بعد دو گھوڑوں والی بگھی سڑک پر نمودار ہوئی اور شہر

Pakistanipoint
Waqar
Azeem
WaqarAzeem
Pakistanipoint.Com

جان عالما
پنی خاتر

★ الیاس سیتاپوری

زلزال کسی بپھرے کی طرح اپنا گھوڑا دوڑا کے سڑک کے بیچوں بیچ راستہ روک کر
کھڑا ہو گیا۔ کوچوان نے اچانک جو راسیں کھینچیں تو گھوڑے بھسل سے گئے اور ان کی
نعلوں کی رگڑ سے درختوں کے سائے میں سڑک سے چنگاریاں سی اڑنے لگیں۔

کوزلال نے کوچوان کو نیچے اتار لیا۔ پوچھا۔ "اس رات کی تنہائی اور سناٹے
میں تم کسے اور کہاں لیے جا رہے ہو؟"

کوچوان ذرا بھی نہ گھبرایا۔ بولا: "ارے بھائی غلام رضا! دیکھو یہ اپنے کوتوال صاحب کیا پوچھ رہے ہیں؟"

آواز کے فوراً بعد ایک چھبیس ستائیس سالہ شخص بگھی سے نیچے اُتر پڑا اور شہر کوتوال کا چہرہ بگھی کی لالٹین کی روشنی میں غور سے دیکھنے لگا۔ کوتوال نے درشت لہجے میں کہا: "ہمارے سوالات کے مختصر جواب دو اور دیکھو خبردار جو تم میں سے کسی ایک نے بھی بھاگ نکلنے کی کوشش کی تو میں اسے اپنے طمنچے سے ہلاک کر دوں گا۔"

کوتوال نے طمنچے کی نال کا رُخ کوچوان کے سینے کی طرف کر دیا۔

"اے بھائی شہر کوتوال صاحب!" بگھی سے اُترنے والے نے نہایت بے خوفی اور اطمینان سے کوتوال کو مخاطب کیا: "یہ اپنا طمنچہ چھپالو، ہمارے سامنے اس کی نمائش مت کرو، ورنہ تم جانو اس کا کیا انجام ہوگا!"

شہر کوتوال اس ہتک آمیز طرزِ تخاطب کو برداشت نہ کر سکا، اس نے اس اجنبی کا گریبان پکڑ لیا۔ اجنبی نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن لڑکھڑا گیا اور اس کے کاندھے پر پڑی ہوئی چادر سڑک پر گر گئی۔ اس شخص نے پھرتی سے چادر اُٹھا کے پھر کاندھے پر ڈال لی اور غصے میں شہر کوتوال کو ڈانٹا: "کوتوال صاحب! تم ہمیں پہچانتے نہیں ہو، بخدا اگر تم ہمیں پہچان لیتے تو ایسی ناشائستہ اور گنوار حرکت قطعی نہ کرتے!"

کوتوال پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا، اجنبی کا گریبان اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا، ایک سخت جھٹکے سے اسے ایک بار پھر لڑکھڑا دیا۔ بولا: "میں بگھی کی تلاشی کے بغیر تمھیں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دوں گا!"

کوچوان معنی خیز لہجے میں بولا: "بھائی غلام رضا! ضد نہ کرو کوتوال صاحب کو تلاشی لے لینے دو لیکن تلاشی لینے سے پہلے کوتوال صاحب کو یہ ضرور بتا دو کہ اس بگھی میں جا کون رہا ہے؟"

غلام رضا نے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کی، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کوتوال کی گرفت ڈھیلی کرنے میں مشغول تھیں۔ بولا: "کوتوال صاحب! میرا گریبان تو چھوڑو، اس بگھی میں ولی عہد مرزا واجد علی بہادر کا معروضہ جا رہا ہے!"

"معروضہ؟ کیا مطلب؟ یہ معروضہ کیا شے ہوتی ہے؟" کوتوال نے گریبان چھوڑ دیا۔

غلام رضا نے جواب دیا: "یہ ایک خاص محلاتی اصطلاح ہے جسے ولی عہد بہادر نے خود وضع فرمایا ہے، معروضے سے مُراد وہ ذاتِ خاص ہوتی ہے جس سے ولی عہد بہادر عشق فرما کر طلب فرماتے ہیں۔ اس بگھی میں بی جان طوائف کی خوبرو بیٹی ننھی جان ہے اور ہم بڑی کوششوں کے بعد اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں!"

کوتوال مسکرایا: "اچھا تو یہ معاملہ ہے گویا تم لوگ ننھی جان کو اس کی مرضی کے خلاف جبراً لیے جا رہے ہو، یہ جرم ہے اور میں اس شہر کا کوتوال کس طرح یہ گوارا کر سکتا ہوں کہ میرے علم اور موجودگی میں اتنا بڑا جرم انجام پا سکے۔" اس کے بعد اس نے کوچوان کو حکم دیا: "کوچوان! اس بگھی کو تھانے لے چلو!"

غلام رضا نے دھمکی دی: "یہ معاملہ ولی عہد بہادر کا ہے، آپ برخاست کر دیے جائیں گے!"

شوریدہ پشت کوتوال نے درشت لہجے میں جواب دیا: "بادشاہ سلامت کے ہوتے ہوئے یہ ولی عہد بہادر کیا بیچتے ہیں، اگر تمھاری جگہ وہ خود ہوتے تو میں انھیں بھی دھر لیتا، قانون سب کے لیے یکساں ہے کیا ولی عہد بہادر کیا ایک مزدور!"

غلام رضا نے کھسیائی خوش اخلاقی سے کہا: "اپنی اپنی سمجھ کا پھیر ہے کوتوال صاحب، ورنہ جس قانون کا آپ ذکر کر رہے ہیں، وہ بھی ولی عہد بہادر کے بزرگوں ہی کا بنایا اور نافذ کیا ہوا ہے!"

"ٹھیک ہے!" کوتوال نے ایک موٹی اور غلیظ سی گالی بھی دی: "کیا تم نے قرآنِ پاک میں نہیں پڑھا کہ اگلی بہت ساری قومیں اس لیے تباہ و برباد ہو گئیں کہ ان میں عدل و انصاف مفقود ہو گیا تھا اور قوم کے بڑے لوگوں نے خود کو اس سے مبرا اور بالا سمجھ لیا تھا!"

کوچوان نے آگے بڑھ کر کوتوال کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑانے لگا: "حضرت معاملہ ولی عہد بہادر کی عزت آبرو کا ہے، جس خدا نے عدل و انصاف کا حکم دیا ہے، اسی نے یہ بھی تو کہا ہے کہ مسلمانو! تم ایک دوسرے کے عیوب کی پردہ پوشی کرو، یہ معروضہ جسے آپ تھانے لے جانا چاہتے ہیں، ولی عہد بہادر کی عزت آبرو کا راز ہے، اس کی پردہ دری نہ فرمائیں!"

کوتوال نے پیر پیچھے ہٹا لیے، غلام رضا نے کوتوال کی ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال دیا۔ بولا: "حضرت! کچھ لے دے کے معاملہ ختم کریں!"

کوتوال نرم پڑ گیا، غلام رضا نے کُرتے کی جیب سے ایک قیمتی ہار نکالا اور کوتوال کی طرف بڑھا دیا۔ کوتوال نے قدرے تامل کے بعد ہار لے لیا اور مٹھی بند کر لی۔ بگھی کی طرف جاتا ہوا بولا: "ذرا اس معروضے کی ایک جھلک تو دیکھ لوں!"

کوتوال نے طمنچہ پھر سنبھال لیا اور بگھی کے پردے کے قریب پہنچ کر حکم دیا: "ذرا پردہ سرکاؤ اور معروضے کو میرے سامنے پیش کرو!"

اس حکم نے ان دونوں کو پس و پیش میں ڈال دیا۔ ولی عہد بہادر لاکھ مضبوط حیثیت کے مالک سہی لیکن یہ تو بہت بعد کی بات تھی۔ کوتوال تو اس وقت ان دونوں کو ذلیل و رسوا کر سکتا تھا اور یہ اطمینان بھی نہ تھا کہ کمزور طبیعت اور حسن پرست ولی عہد اس معاملے کی ذمے داری قبول بھی کرتے یا نہیں، بہت ممکن تھا کہ وہ ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر پیچھے ہٹ جائیں۔

غلام رضا بگھی کے پردے کی طرف بڑھتا ہوا بولا: "معروضے کی رونمائی کوئی مشکل کام تو نہیں لیکن حیا سوز ضرور ہے، حکمِ حاکم مرگِ مفاجات، بسم اللہ آگے بڑھیے!"

کوتوال نے پھر گالی دی، بولا: "معروضے کو بگھی سے نیچے اُتارو، میرے سامنے کھڑا کرو!"

غلام رضا نے پردے میں منہ ڈال کے آواز دی: "ننھی جان! ذرا نیچے تشریف لے آئیں، ہمارے کوتوال صاحب آپ کو ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں!"

کوتوال سراپا اشتیاق بنا بگھی کے پردے کی طرف دیکھ رہا تھا، تھوڑی دیر بعد

اس کہانی کے تاریخی پس منظر کے لیے مستند ماخذ کتابوں سے مدد لی گئی ہے
پری خانہ (واجد علی شاہ) ○ جانِ عالم (مولانا شرر لکھنوی) ○ واجد علی شاہ (محمد تقی احمد) ○ تاریخ ممتاز (قلمی) (واجد علی شاہ) ○ مثنوی حزنِ اختر (واجد علی شاہ) ○ قیصر التواریخ (کمال الدین حیدر) ○ شبابِ لکھنؤ (محمد احمد علوی) ○ مارکوئس آف ڈلہوزی (سر ولیم ولسن ہنٹر) ○ واجد علی شاہ اور ان کا عہد (رئیس احمد جعفری)

بگھی کے پائیدان پر ایک پیر نمودار ہوا، پھر دوسرا پیر اور اس کے بعد چھم سے ایک مہ پارہ پائیدان سے اُتر کر زمین پر کھڑی ہو گئی۔ سفید چادر میں لپٹی ہوئی، پیروں میں چاندی کی پازیب تھی۔ کوتوال نے چادر کھینچ کر ایک طرف ڈال دی۔ غلام رضا "اللہ کی امان" کہتا ہوا چونک پڑا۔ کوچوان اپنے گھوڑوں کی طرف دبک گیا۔ ننھی جان ان سب کے سامنے بے نقاب کھڑی تھیں۔ مشکل سے اٹھارہ کا سن، گداز جسم، چہرہ قدرے بیضوی، رنگ دمکتا ہوا نور جیسا، باریک و بیشانی چادر کی لپیٹ میں اُتر چکا تھا اور وہ حسن قیامت کا پردہ پوش تھا۔ اب وہ وحشت اور گھبراہٹ کے تموج میں زیر زبر ہو رہا تھا۔ کوتوال کے منہ میں پانی بھر آیا۔ دونوں کو مخاطب کیا: "آؤ کے بیٹھو! میں کل اپنے طور پر یہ تصدیق ضرور کروں گا کہ مہتاب کا یہ ٹکڑا فی الواقع ولی عہد بہادر کا معروضہ ہے یا تم دونوں اس گوہرِ گرانمایہ کو کسی اور سرکار میں لیے جاتے ہو۔ اگر معاملہ ولی عہد بہادر کا نہ ہوتا تو بخدا میں وہ پہلا شخص ہوتا جو اس کا مزہ چکھے بغیر کہیں اور نہ جانے دیتا!"

اب تو ننھی جان بھی برداشت نہ کر سکیں۔ نہایت مترنم آواز میں گویا ہوئیں۔

"آگ لگے ایسے انتظام کو جہاں سرکار دربار کے نمک خوار دیدہ دلیری سے نمک حرامی کرتے پھریں۔ کوتوال صاحب! تمھیں اس وقت اختیار ہے کہ ہمیں جتنا چاہو ذلیل کر لو کیونکہ یہ تمھاری باری ہے لیکن جب ہماری باری آئے گی تو ہم بھی تمھیں اچھی طرح دیکھ لیں گے!"

کوتوال نے ننھی جان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولا: "تمھارے غصّے میں بھی ایک ادا ہے، تمھیں اختیار ہے جو چاہو کہو۔ یوں تو حسینوں کی ہر وقت اور ہمیشہ باری رہتی ہے، اس وقت بھی تمھاری باری ہے جو چاہو سزا دے لو، میں حاضر ہوں۔" اس کے بعد اس نے ننھی جان کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اپنے گھوڑے کی طرف جاتا ہوا بولا: "اب تم لوگ جا سکتے ہو لیکن خبردار جو تم نے حضور ولی عہد بہادر سے میرا ذکر کیا!"

ذرا دیر وہاں سناٹا طاری رہا اور جو جہاں کھڑا تھا، وہیں دم بخود کھڑا کوتوال کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر جب ہوش آیا تو ننھی جان نے دوپٹا اور چادر پھر لپیٹ لی اور بگھی میں جا بیٹھیں۔ کوچوان اور غلام رضا برابر بیٹھ گئے اور بگھی حضور باغ کی طرف روانہ ہو گئی۔

اس وقت ولی عہد بہادر حضور باغ کے بیچوں بیچ بنے ہوئے محل فلک سیر میں قیام فرما تھے۔ ننھی جان کے ہجر میں انھوں نے دیوانوں جیسی حالت بنا رکھی تھی، بڑے بڑے بالوں کی لٹیں منہ پر پڑی تھیں۔ پوری رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی، ہر ہر آہٹ پر چونک پڑتے اور فلک سیر کی کھڑکیوں سے باہر کا جائزہ لینے لگتے، کبھی سرد آہیں بھرتے، کبھی اوندھے منہ مسہری پر گر جاتے اور آنسوؤں سے تکیہ تر کر دیتے۔ فلک سیر میں جگہ جگہ فانوس اور کنول روشن تھے۔ محل کے مختلف گوشوں میں ولی عہد بہادر کی محبوبائیں اُداس اور سوگوار اس بات کی منتظر تھیں کہ دیکھیے اس عالمِ تنہائی اور لمحاتِ ہجر میں کسے یاد فرمایا جاتا ہے لیکن ولی عہد بہادر ان میں سے کسی ایک پر بھی ملتفت نہ تھے۔ ننھی جان کو انھوں نے کبھی دیکھا بھی نہ تھا لیکن غلام رضا نے اس کے حسن کی تعریف میں وہ سماں باندھا تھا کہ ولی عہد بہادر نادیدہ عاشق ہو گئے تھے اور غلام رضا کو اس خدمت پر مامور کر دیا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو ننھی جان کو حاضر کیا جائے۔ ننھی جان کی ماں بی جان کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کی بیٹی پر ولی عہد بہادر نادیدہ عاشق ہو گئے ہیں تو انھوں نے بہت بُرا مانا اور لال پیلی ہوتی ہوئی غلام رضا پر برس پڑیں۔ بہت کچھ بُرا بھلا کہنے کے بعد دریافت کیا تھا کہ "آخر یہ ولی عہد بہادر چاہتے کیا ہیں؟"

غلام رضا نے جواب دیا تھا: "بی جان! تم یقین کرو، ولی عہد بہادر کے دل میں ننھی جان کے عشق کی وہ بھٹی سلگی ہے کہ اگر تم ذرا سی بھی عقل مندی سے کام لو تو مالا مال ہو سکتی ہو!"

"نہ بابا!" بی جان کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی تھیں: "اب میں اتنی بچّہ بھی نہیں جیسے تم لیں بہلا پھسلا لو۔ میں تو سیدھی سی یہ بات جانتی ہوں کہ ولی عہد بہادر کو تو لڑکیوں اور عورتوں کی ہوس ہے، اچھی سے اچھی اور حسین سے حسین لڑکی جاتی ہے، ولی عہد بہادر کچھ عرصے اس سے خوب اچھی طرح دل بہلاتے ہیں اور پھر جب طبیعت سیر ہو جاتی ہے تو کسی نئے گل کی جستجو کرتے ہیں۔ نہ بابا میں تیری باتوں میں نہیں آؤں گی، تو ٹھنڈے ٹھنڈے اپنی راہ لے۔"

اس طرح غلام رضا نے بی جان کو راضی کرنے میں بیس دن لگا دیے لیکن مقصد حاصل نہ ہوا۔ اُدھر ننھی دیر ہو رہی تھی اور کام بنتا نظر نہ آتا تھا۔ ولی عہد بہادر کا سینہ تنور بنتا جا رہا تھا اور وہ ننھی جان کی طرف سے مایوس ہوتے جا رہے تھے۔ ادھر ننھی جان کا یہ حال تھا کہ وہ محل سرا میں پہنچنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی، اس کے لیے یہ کتنے فخر کی بات تھی کہ سلطنتِ اودھ کا ولی عہد اس کے نادیدہ عشق میں مبتلا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ماں غلام رضا کی باتیں مان لے لیکن بی جان اسے اپنی روزی کا ٹھیکرا سمجھتی تھی اور اُسے یقین تھا کہ ننھی جان محل میں گئی اور وہ دانے دانے کو محتاج ہوئی۔ جب ننھی جان نے یہ دیکھا کہ معاملہ اُلجھتا جا رہا ہے تو اس نے ایک دن ماں سے چھپ کر غلام رضا سے کہہ دیا کہ "تم کل رات پچھلے پہر آ جائیو، میں تمھارے ساتھ نکل چلوں گی۔"

غلام رضا نے پوچھا تھا: "لیکن اپنی ماں سے کیا کہو گی؟"

ننھی جان نے جواب دیا تھا: "وہ اس وقت افیون کی پینک میں انٹا غفیل پڑی ہوں گی!"

ننھی جان نے جو کہا تھا، دوسرے دن رات کے پچھلے پہر کر دکھایا۔ اسے کوتوال پر بڑا غصہ آیا اور اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ولی عہد بہادر سے اس کمین کوتوال کو سزا ضرور دلواؤں گی!

دو گھوڑوں کی بگھی جیسے ہی حضور باغ میں داخل ہوئی، ولی عہد بہادر نے بے اختیار باہر نکل کے داروغۂ محل سرا سے پوچھا: "کیا ننھی جان آ گئیں؟"

داروغۂ محل سرا نجم النساء نے گول مول جواب دیا: "غالباً۔ ان کے سوا اس وقت کون آ سکتا ہے!"

تھوڑی دیر بعد یہ بگھی فلک سیر کے دروازے پر رُک گئی۔ کوچوان کے پاس سے غلام رضا کود کر اُتر پڑا اور بڑبڑاتا ہوا بولا: "بس یہ حضور ولی عہد کا منہ تھا جو یہ ناچیز لحاظ کر گیا اور شہر کوتوال کی گالیاں سہہ گیا، ورنہ قسم ہے جناب امیر کی طیش تو اتنا آیا تھا کہ اگر گپتی ساتھ ہوتی تو کوتوال نابکار کے اسی جگہ دو ٹکڑے کر دیتا!"

ولی عہد بہادر ننھی جان کے تصور میں گم تھے، غالباً غلام رضا کی بات سنی

ہی نہیں، وارفتگی میں بگھی کے پردے کے قریب پہنچ کر آواز دی: "جانِ جاناں ننھی جان کیا تم اندر موجود ہو؟"

اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو غلام رضا ولی عہد بہادر کے قریب پہنچ گیا اور مسکرا کر تمسخرانہ شان سے کہا: "بھلا ایسا بھی کہیں ممکن ہے کہ حضور کا یہ جاں نثار اپنے ذمے کوئی خدمت لے اور اسے انجام نہ دے، حاشا و کلا ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا!"

ولی عہد بہادر نے حالتِ اضطراب میں بگھی کا پردہ الٹ دیا اور اضطراری لہجے میں سوال کیا: "جو ہم پوچھتے ہیں تم اس کا تو جواب دیتے نہیں، بس فضول باتیں کیے جاتے ہو، ہم پوچھتے ہیں کہ آخر ہماری ننھی جان کہاں ہیں!"

فلک سیر کے باہر روشن ہر رنگوں کی روشنی میں سکڑی سمٹی ننھی جان نظر آ گئی۔ ولی عہد بہادر نے پائدان پر چڑھ کے ننھی جان کو اتار لیا، بولے "واہ جناب! یہ ایک ہی رہی، ہم تو جناب کے عشق میں پاگل ہو رہے ہیں اور ہفتوں سے خواب کی کیفیت سے لاعلم ہیں اور آپ ہیں کہ ناز و غمزے سے ہماری ہلاکت کے سامان مہیا کر رہی ہیں!"

داروغۂ محل سر انجم النسا بیگم نے کہا: "ولی عہد بہادر! بندی آپ پر قربان، سمجھدار عاشق اپنے عشق کا یوں اظہار نہیں کرتے، اس سے محبوبۂ ستم ایجاد کو ستانے کا ایک حربہ ہاتھ آ جاتا ہے، آپ ننھی جان کو اندر لے جائیں اور ہجر و مفارقت کی ساری کسر نکال لیں!"

غلام رضا نے پوچھا: "حضور کا اس ناچیز کے لیے کیا حکم ہے؟"

ولی عہد بہادر سراپا مجسمۂ احسان مندی بن گئے، مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "اس وقت تم جا سکتے ہو، طلوعِ آفتاب کے بعد ہم کسی وقت بھی تمھیں بلا لیں گے اور اس عظیم خدمت کا عظیم صلہ عطا کریں گے!"

اس کے بعد ولی عہد بہادر نے ننھی جان کو گود میں اٹھا لیا اور پیار کرتے ہوئے فلک سیر میں گم ہو گئے۔

ولی عہد بہادر کو جب ننھی جان سے کوتوالِ شہر کی ناشائستہ حرکت کا علم ہوا تو انھیں غصّے کے بجائے صدمہ پہنچا، ننھی جان کو تسلی دیتے ہوئے کہا: "ہم چاہیں تو اس نابکار کو اسی وقت برخاست کرا دیں لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ معاملہ طول پکڑ سکتا ہے، شہر کوتوال ہمارے بہت سے ایسے رازوں سے واقف ہے کہ اگر وہ فریادی بن کے قبلہ والد صاحب کے گوش گزار کر دے تو ہمیں بڑی رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور تم جیسی بہت سی پردہ نشینوں کے راز طشت از بام ہو جائیں گے اس لیے ہم کوتوال نمک حرام کو خدا پر چھوڑتے ہیں، برے کام کا برا انجام۔ لوگوں کے دل دکھا کے وہ بھی خوش نہیں رہے گا!"

چالاک ننھی جان نے پھر کوتوال کا ذکر نہیں کیا اور ہر طرح ولی عہد کو یہ یقین دلاتی رہی کہ جو عشق کی آگ ولی عہد بہادر کے سینے میں موجزن تھی وہی آگ ننھی جان کو بھی بھسم کیے دے رہی تھی، اس نے اداکاری کے آنسو بہا کر ولی عہد بہادر کو یہ یقین بھی دلا دیا کہ اگر وہ ننھی جان کی چند دن اور خبر نہ لیتے تو ننھی جان ان کے عشق میں کانچ پیس کے پھانک جاتی۔

ولی عہد بہادر نے اسے اپنے روبرو لٹا رکھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی سانسیں اپنے اپنے چہرے پر محسوس کر رہے تھے۔

ہشاش بشاش ننھی جان ایک دم اداس ہو گئی۔ اسے ملول دیکھ کر ولی عہد بہادر بھی ملول ہو گئے، بے اختیار سینے سے لگا کر دریافت کیا: "جانِ جاناں! آخر تم ان خوشی کے لمحات میں اداس کیوں ہو؟"

ننھی جان خاموش رہی اور ولی عہد بہادر کی کرم فرمائیوں کی یورش سے اپنا چہرہ بچانے کی کوشش کی مگر کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور اداس رہی۔

ولی عہد بہادر اٹھ کر بیٹھ گئے، ننھی جان کو بھی اٹھا لیا، اس کا سر شانے سے لگا کر زلفوں سے کھیلنے لگے، انھیں ناک سے لگا کر سانس اوپر کھینچی اور سوال کیا۔ "اے قمر الاقمار! آخر تمھارے چہرے کی چاندنی پھیکی کیوں پڑ رہی ہے اور وہ کون سا صدمہ ہے جو تمھیں گھلائے دے رہا ہے؟"

ننھی جان کی آنکھیں بھر آئیں، آنسوؤں کے چند قطرے گال سے بہہ کر ٹھوڑی میں آ گئے۔ ولی عہد بہادر نے انھیں اپنی زبان سے خشک کیا اور بے چینی سے پوچھا: "اگر تم اپنے غم کا ہم پر اظہار نہ کرو گی تو ہم بھی طپنچے سے خود کو ہلاک کر لیں گے!"

ننھی جان نے گھبرا کر ولی عہد کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنے رخسار پر پھیرنے لگی، بولی: "ولی عہد بہادر کا کیا ہے، انھیں دل بہلانے کے ہزار موقعے حاصل ہیں لیکن یہ کنیز اسی وقت تک خوش و خرم ہے جب تک اس کے حال پر حضرت ولی عہد بہادر ملتفت ہیں، اگر خدانخواستہ کبھی آپ کا مجھ سے دل بھر گیا تو ــ"

ولی عہد بہادر نے ننھی جان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، بولے: "ان کے علاوہ باتیں کرو، اور کس چیز نے تمھیں اداس کر دیا ہے؟"

"جانِ دلبراں!" ننھی جان نے ولی عہد کے سینے میں خود کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "کوئی ایک فکر ہو تو اس کا اظہار کر کے اپنا دل ہلکا کر لوں لیکن یہاں تو بے شمار فکریں ہیں جو لحہ بہ لحہ اپنا محاصرہ تنگ کرتی جا رہی ہیں!"

ولی عہد بہادر نے تسلی دی: "ننھی جان! تم کوئی فکر نہ کرو، جب تک ہم زندہ ہیں تمھیں ذرا بھی نہیں گھبرانا چاہیے!"

ننھی جان نے سسکیوں میں کہا: "ہو سکتا ہے کسی دن قبلۂ عالم کو بھی ہماری خبر ہو جائے اور وہ ہمیں حالتِ غیظ و غضب میں اپنے روبرو طلب فرما لیں، اس وقت کیا ہوگا؟"

ولی عہد نے پیار سے اس کے سر پر ایک چپت رسید کی، کہا: "مت گھبراؤ ننھی جان مت گھبراؤ، ہم اپنے پدر بزرگوار سے خوب واقف ہیں، وہ تمھیں کچھ بھی نہ کہیں گے!"

ننھی جان نے کہا: "اور اگر میری اماں نے بادشاہ کی خدمت میں فریاد کی تو کیا ہوگا؟"

ولی عہد بہادر نے جواب دیا: "ہاں یہ تشویش کی بات البتہ ہے لیکن اس کا بھی حل نکل آئے گا!"

لیکن ننھی جان کسی طرح بھی مطمئن نہیں ہو رہی تھی، بولی: "میں ماں

چھپ کر آپ کے پاس آئی ہوں اس لیے میں یہ چاہتی ہوں کہ جو کام بھی ہونا ہے اسے ذرا عزت آبرو سے ہونا چاہیے۔"

"تو کہو تم اس سلسلے میں ہمیں کیا مشورہ دو گی ؟"

ننھی جان نے کہا: "اس ناچیز کی رائے آپ پوچھتے ہیں تو سن لیجئے۔ بندی اپنی ماں کو ناراض نہیں رکھنا چاہتی اس لیے جس طرح بھی ممکن ہو ماں کو یہاں بُلا کے بہری صورت دکھا دیجیے اور انعام و اکرام میں اتنا کچھ بخش دیجیے کہ نمک کا بوجھ ان کی زبان کو تالا لگا دے گا!"

ولی عہد بہادر نے کہا: "منظور سو بار منظور اور کچھ ؟"

ننھی جان نے کہا: "اس وقت تک جب تک میں آپ کے ہاں باقاعدہ نہ آجاؤں مجھے یہاں رہنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ میں وعدہ کرتی ہوں کہ کسی نہ کسی دن مستقل رہ لینے کی نیت سے آؤں گی ضرور!"

ولی عہد بہادر نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا: "بس یہی شرط ناقابلِ برداشت ہے۔ آخر ہم تمھاری جُدائی میں اپنے دلِ ناصبور کو کیا کہہ کر بہلائیں گے ؟"

ننھی جان نے کہا: "بس یہ چند ہی دنوں کی تو بات ہوگی!"

"وہ تو تم بجا کہتی ہو۔ ہم تمھیں جھٹلا کہاں رہے ہیں بات تو ہمارے صبر و ضبط کی ہے۔ بخدا ننھی جان! اگر تم مومن ہو تو ہماری بات کا یقین کرو کہ اب ہم میں اتنی سکت نہیں رہی کہ تمھاری جُدائی کی دو ساعتیں بھی گزار سکیں!"

ننھی جان نے منہ لٹکا لیا۔ بھیڑ بھیڑ کر بولی: "اگر میں اپنا مال ولی عہد بہادر پر ظاہر کردوں تو مجھے یقین ہے کہ فرطِ غم سے ان کے دل میں شگاف پڑ جائے گا۔ لیکن میں اپنا یہ غم اس لیے برداشت کرنے پر مجبور ہوں کہ یہ کوہِ گراں اٹھا لینے کے بعد مجھے ولی عہد بہادر کی دائمی رفاقت حاصل ہو جائے گی!"

"اگر تمھاری خوشی اسی میں ہے تو ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں لیکن ہمیں یہ ضرور بتا جاؤ کہ وہ شادمانی کی ساعتیں کب تک آئیں گی ؟"

ننھی جان نے جواب دیا: "بہت جلد اور یوں تو ہم دونوں ہر شب کو ملتے رہیں گے۔ میں راتیں آپ ہی کی آغوش میں گزاروں گی بس صبح ہوتے چلی جایا کروں گی!"

"ہمیں منظور ہے!" فکرمند ولی عہد نے کہا: "لیکن ایک بات بتاتی جاؤ!"

"فرمائیے ارشاد!" ننھی جان نے نشیلی آنکھیں ولی عہد کے چہرے پر گاڑ دیں۔

ولی عہد بہادر نے کہا: "تمھاری ماں ہمارے پاس آنے سے کیوں ڈریں گی ؟"

ننھی جان نے اٹل لہجے میں کہا: "اس سلسلے میں جب تک میں ماں کو راضی نہ کر لوں گی یہاں سے قدم تک نہ نکالوں گی۔ میں آج ہی انھیں یہاں بُلا کر بات کیے لیتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات مان ضرور لیں گی!"

ولی عہد نے کہا: "جب وہ یہاں تشریف لے آئیں تو ہم ان کی شاندار ضیافت کیوں نہ کریں اور بعد ضیافت انھیں گرانمایہ انعام و اکرام سے نواز دیں۔ ہمارا خیال ہے اس کے بعد وہ ہماری مخالفت نہیں کریں گی!"

"جانِ عالم کا قیاس صد فی صد درست ہے!" ننھی جان نے کہا: "اس کے باوجود میں چند دنوں تک اپنی ماں کے پاس ہی رہنا چاہتی ہوں اس کے بعد میں آپ کے پاس آجاؤں گی!"

"تمھاری مرضی!" ولی عہد بہادر نے کہا اور دونوں دلوں کے ارمان نکالنے لگے!

کئی راتوں کے جاگے ہوئے ولی عہد بہادر ننھی جان کو نڈھال کر کے ایسے سوئے کہ دن چڑھے تک ہوش میں نہ آئے کس میں اتنی ہمت تھی جو انھیں بیدار کرتا۔ بیاسی سالہ دادی نجم النسا کئی بار آئیں اور واپس گئیں، محل سرا کی دوسری عورتیں بھی باری باری آتی رہیں اور دونوں کو مست الست دیکھ کر حسد میں جلتی بھنتی واپس جاتی رہیں۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو پتہ چلا ان کے لیے کئی پیغام رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ الجھن میں ڈال دینے والے دو پیغام تھے ایک تو یہ کہ ننھی جان کی ماں بی جان بادشاہ کے پاس فریادی ہوئی ہیں اور دوسرا یہ کہ بادشاہ نے ولی عہد اور ننھی جان کو اپنے روبرو حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔

ننھی جان نے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: "وہی ہوا نا جس کا ڈر تھا۔ اب کیا ہوگا ؟"

ولی عہد بہادر نے جواب دیا: "گھبراتی کیوں ہو! اب کامیابی اور ناکامی کا انحصار تم پر ہے صرف تم پر!"

"وہ کس طرح ؟" ننھی جان نے پوچھا۔

"تم اپنی ماں کے سامنے قبلہ عالم کے روبرو یہ کہہ سکتی ہو کہ تم ہمارے پاس خود بخود آئی ہو تمھیں لایا نہیں گیا ہے!"

"کہہ دوں گی!" ننھی جان نے کہا: "اور کچھ ؟"

"اور یہ کہ تم اپنی ماں سے ذرا بے رُخی اور بے اعتنائی برتنا آگے کا کام ہم انجام دے لیں گے!"

"بہتر ہے!" ننھی جان نے کچھ سوچتے ہوئے مُردہ سی آواز میں کہا۔

اُسی وقت غلام رضا بھی مجرا عرض کرتا ہوا حاضر ہوگیا۔ ولی عہد بہادر نے خوشی سے کہا: "واللہ ہم تمھارے احسان مند ہیں غلام رضا خان صاحب! ہم تمھیں اس کا شاندار عوض دیں گے وقت کا انتظار کرو!"

غلام رضا نے سرگوشی میں پوچھا: "اور یہ ملاقاتی نشست گاہ میں کوتوال صاحب کیوں تشریف فرما ہیں حضور والا ؟"

ولی عہد بہادر نے جواب دیا: "ابھی ان کی آمد کا راز بھی کھلا جاتا ہے لیکن غلام رضا اگر تم واقعی مومن ہو تو یقین کرو کہ ہم کوتوال کو دیکھ کر خوش نہیں ہوئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اشتعال میں کوئی نازیبا حرکت کر بیٹھیں!"

غلام رضا نے کہا: "حضور طبیعت کو اپنے قابو میں رکھیں جہاں تک ممکن ہو ضبط سے کام لیں۔ رہ گئی کوئی نازیبا حرکت تو یہ غلام آپ کے کب کام آئے گا!"

"ہمارے جاں نثار دوست! ہمیں تم سے اسی قسم کے جواب کی توقع تھی تم نے ہمیں خوش کر دیا!"

اس کے بعد ولی عہد بہادر اٹھ کر کوتوال کے پاس چلے گئے بڑی تزک والا

Waqar Azeem Pakistanipoint

کوتوال خوش اخلاقی سے کھڑا ہو گیا اور کھسیانی ہنسی میں کہنے لگا: "حضور ولی عہد بہادر! بعض اوقات اپنے غلاموں کو ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ آدمی ذرا سا بھی غائب یا فراری ذہن کا ہو تو سخت شرمندگی سے دوچار ہو جائے۔"

ولی عہد بہادر کوتوال سے سخت ناراض تھے۔ انھیں رہ رہ کے اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر اس ملعون نے ان کی محبوبہ ننھی جان کے ہاتھ کا بوسہ کیوں لیا۔ آخر جب برداشت نہ کر سکے تو کوتوال سے کہا: "ہمیں تمھاری بابت ننھی جان نے جو کچھ بتایا ہے اس کا ہمیں سخت ملال ہے اور آخر تم سے یہ بے ادبی اور گستاخی سرزد کس طرح ہوئی؟"

کوتوال نے کہا: "حضور ولی عہد بہادر! اس خاکسار نے آپ کی ننھی جان کے ساتھ جو سلوک بھی کیا تھا، اس کے پیچھے وہ خلوص اور محبت کارفرما ہے جس کی کوئی قیمت نہیں! اُس وقت آپ کا یہ غلام جذبوں کی افراط و تفریط کا شکار ہو گیا تھا اور اس حالتِ وارفتگی اور کیفیتِ گم شدگی میں خاکسار سے جو کچھ بھی سرزد ہوا بخدا وہ اس لائق ہے کہ اسے تحسین و آفریں کی نظروں سے دیکھا جائے۔"

"چہ بوالعجبی ست!" ولی عہد بہادر نے گویا خود سے کہا: "کوتوال صاحب! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، بخدا اگر ہم میں مادۂ رحم و انصاف ودیعت نہ کیا گیا ہوتا تو ہم آپ سے اس کا محاسبہ کرتے اور آپ کے جرم کو لائقِ تعزیر قرار دیتے!"

کوتوال نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور افسوس سے کہا: "تو حضور ولی عہد بہادر نے اس ناچیز کے جذبۂ محبت اور عقیدت کو کسی اور ہی نظر سے دیکھا ہے، اگر میرا جرم ثابت ہو جائے تو میں ہر سزا جھیلنے کو تیار ہوں!"

ولی عہد بہادر نے ذرا ترش لہجے میں فرمایا: "ہم پوچھتے ہیں کہ آپ میں یہ ہمت کہاں سے آئی کہ آپ ہمارے معشوقے کے ہاتھ کو بوسہ دیں۔"

کوتوال نے جواب دیا: "حضور والا! اس خاکسار نے جب تجھی روکی تھی تو اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ اس میں کون جا رہا ہے۔ شہر میں نظم و نسق بحال رکھنا غلام کا فرض ہے اسی فرض کی بجا آوری میں حضور والا کے معشوقے کی سواری رکنے کی غلطی سرزد ہو گئی لیکن پھر جیسے ہی یہ یقین ہو گیا کہ وہ لاکھوں میں ایک قتالۂ عالم حضورِ والا کی منظورِ نظر ہے اور شرفِ لطف و کرم حاصل کرنے جا رہی ہے تو غلام کے دل میں حضورِ والا کے تعلق سے اس نازنین کے لیے جذبۂ عقیدت و احترام پیدا ہو گیا اور فرنگیوں کی طرح اس کا اظہار دست بوسی سے کیا گیا!"

ولی عہد بہادر کے دل سے کدورت کا بوجھ اُتر گیا، بولے: "واللہ اگر یہ بات ہے تو خوب ہے، ہم آپ کے جذبۂ خلوص و عقیدت کی آنچ اپنے دل میں بھی محسوس کر رہے ہیں، واللہ یہ فرنگی بھی کیا خوب ہیں، ہمیں بھی یاد آیا، ہم نے بھی ریذیڈنٹ بہادر کی ایک تقریب میں کسی حسین جمیل فرنگی خاتون کی رسمِ دست بوسی ادا ہوتے دیکھی ہے!" پھر جیسے کچھ اچانک یاد آ گیا، دریافت کیا: "اور ہاں آپ نے غلام رضا کا گریبان بھی تو پکڑا تھا اور رشوت میں اس سے قیمتی ہار بھی تو لے لیا تھا۔ یہ کیا معاملہ ہے؟"

کوتوال نے جواب دیا: "ولی عہد بہادر! غلام رضا کو بھی یہیں طلب فرما لیں، اس کے بعد یہ بات ہو تو زیادہ مناسب ہے۔ اس سے کیا فائدہ کہ غائبانہ وہ کچھ کہے اور میں کچھ عرض کروں اور حضورِ والا کے لیے اس میں جھوٹ سچ کی تمیز کرنا دشوار ہو جائے!"

ولی عہد بہادر نے آہستہ آہستہ تالی بجائی، ایک نازک اندام لڑکی حاضر ہو گئی، انھوں نے حکم دیا: "امامن! ذرا غلام رضا کو تو یہاں بھیج دو!"

وہ سر جھکا کے واپس گئی اور ذرا دیر بعد غلام رضا بھی حاضر ہو گیا۔ ولی عہد بہادر نے اگر ذرا بھی ہوشیاری سے کام لیا ہوتا تو وہ اِن اشاروں کو ضرور محسوس کر لیتے جو کوتوال صاحب اور غلام رضا کے مابین ہوئے تھے۔

ولی عہد بہادر نے کوتوال پر عائد کیا ہوا جرم غلام رضا کے سامنے دہرایا اور اسے حکم دیا کہ وہ اس کی تصدیق کرے۔

غلام رضا نے سر جھکا کے آہستہ سے عرض کیا: "حضورِ والا! کوتوال صاحب نے جو کچھ بھی کیا اس کا ان سے محاسبہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اُس وقت ان کا فرض یہی کہتا تھا اور رہا وہ ہار والا معاملہ تو آج صبح وہ مجھے واپس مل گیا ہے۔ کوتوال صاحب نے میری عدم موجودگی میں اپنے کسی آدمی کے ذریعے میرے گھر بھجوا دیا ہے!"

"واللہ یہ تو کمال ہو گیا۔ وہی تو ہم کہیں کہ ولی عہد بہادر، مستقبل کے فرماں روائے اودھ کیا اتنا رعب بھی نہیں رکھتے کہ ہماری سلطنت کے کارگزار غائبانہ ہماری عزت و تکریم کریں!"

کوتوال کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، اس نے کہا: "ولی عہد بہادر! اگر اس ناچیز کے معاملے میں حق و انصاف نہیں فرماتے تو کوئی بات نہیں، میں اپنے عہدے سے آج ہی دستبردار ہو جاؤں گا، میں یہاں سے سیدھا بادشاہ سلامت کی خدمت میں جاؤں گا اور ان کی خدمت میں اپنا استعفا پیش کروں گا۔ وہ یقیناً مجھ سے اس کا سبب دریافت فرمائیں گے، میں ان کے سامنے سارا معاملہ رکھ دوں گا اور ان سے درخواست کروں گا کہ خدا کے لیے وہ میرے معاملے میں خود ہی انصاف سے یہ فرما دیں کہ میں کہاں تک ولی عہد بہادر کا گناہگار ٹھہرتا ہوں!"

ولی عہد بہادر کے ہوش اُڑ گئے، گھبرا کر ارشاد فرمایا: "نہیں آپ کو استعفا دینے کی کوئی ضرورت نہیں، ہمارا دل آپ کی طرف سے صاف ہو گیا اور اگر آپ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو اسے ہم نے معاف کیا، ہمارے خدا نے معاف کیا۔"

"نہیں جناب!" کوتوال نے اصرار کیا: "اگر غلام سے واقعی کوئی غلطی ہوئی ہے تو اس کی مجھے سزا بھی ملنی چاہیے اور آپ اگر مجھے معاف بھی کر دیں گے تو میں اس سے مطمئن نہ ہوں گا اور بڑی سرکار سے دادرسی چاہوں گا!"

غلام رضا نے ولی عہد بہادر سے درخواست کی: "ولی عہد بہادر! بندہ آپ سے چند باتیں تنہائی میں کرنا چاہتا ہے!"

ولی عہد بہادر فوراً اسے لے کر ایک گوشے میں چلے گئے۔ غلام رضا نے کہا: "حضورِ والا! معاملے کو خواہ مخواہ کیوں طول دے رہے ہیں، کیا آپ نے یہ نہیں ملاحظہ فرمایا کہ کوتوال شرارت پر آمادہ ہے!"

ولی عہد بہادر نے کہا: "ہاں ایسا محسوس تو ہمیں بھی ہوتا ہے، اگر وہ

واقعی قبلہ والد صاحب کی خدمت میں چلا گیا اور یہ معاملات ان کے سامنے رکھ دیئے تو بہت بُرا ہو گا!"

غلام رضا نے کہا: "اسی لیے تو بندہ یہ عرض کر رہا ہے کہ اس معاملے کو یہیں ختم کر دینا چاہیے!"

"آخر کس طرح؟ ہمیں یہ بھی تو معلوم ہو ہم اس بدبخت کو اس کے مذموم ارادوں سے روکیں تو کس طرح روکیں؟"

غلام رضا نے کہا: "بندے کے دماغ میں ایک تجویز ہے، اس سے سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی!"

ولی عہد بہادر نے بے چینی سے کہا: "بیان کرو!"

اسی وقت ایک عورت اندر داخل ہوئی اور ولی عہد بہادر کو مطلع کیا کہ "بادشاہ سلامت ولی عہد بہادر کا بے چینی سے انتظار فرما رہے ہیں اور یہ حکم بھی ہے کہ ننھی جان بھی ہمراہ ہوں!"

ولی عہد نے عورت کو جواب دیا: "جاؤ شاہی فرستادے کو ہماری طرف سے مطلع کر دو کہ ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں؟"

عورت واپس گئی تو ولی عہد بہادر غلام رضا سے مخاطب ہوئے: "یہ بہت ہی بُرے وقت آیا ہے یہ بدبخت کوتوال اگر اس وقت قبلہ والد صاحب کی طرف سے طلبی نہ ہوئی ہوتی تو ہم اس کوتوال کو ضرور شکنجے میں اتار لیتے!"

غلام رضا نے کہا: "حضور نے غلام کی تجویز سنی ہی نہیں!"

ارشاد ہوا: "عرض کرو!"

غلام رضا نے کہا: "آپ کوتوال کے پاس واپس جا کے اسے اس کی خدمت پر آفرین کہیں اور اس حسین خدمت کے صلے میں اسے غیر معمولی انعام و اکرام سے نوازدیں پھر یہ غلام دیکھے گا کہ کوتوال صاحب بہادر کیا منہ لے کے بڑی سرکار میں جائیں گے!"

اس تجویز سے ولی عہد بہادر بھی متفق ہو گئے۔ واپس جاتے ہی فرطِ جوش میں کوتوال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور فرمایا: "کوتوال صاحب آپ نے مستعدی اور فرض شناسی کا آپ نے ثبوت دیا ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس پر آپ ہمیشہ کاربند رہیں ہم اس کی قدر و قیمت اپنے دروں خانۂ دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہیں!" اس کے بعد داروغہ نجم النساء کو طلب کیا اور ان کے ذریعے دو مالائے مروارید، دو ہزار نقد، دو کشتیاں قیمتی پارچہ جات کی منگوا کے کوتوال کے حوالے کیں اور ارشاد ہوا: "یہ آپ کی فرض شناسی کا انعام نہیں بلکہ یہ ہمارے اس اعتراف کا معمولی اظہار ہے جو آپ کی وفاداری اور مستعدی کے نقش کی صورت میں ہمارے دل پر مرتسم ہو گیا ہے آپ کو انعام تو اس وقت ملے گا جب ہم سریر آرائے سلطنت ہوں گے!"

کوتوال نے اپنی مسرت و انبساط کے جذبات چہرے سے نہیں ظاہر ہونے دیئے آنکھوں میں آنسو لا کے بولا: "حضور کی بندہ پروری کا کیا ٹھکانا، بس یہی باتیں ہیں جنھوں نے لکھنؤ کا والہ و شیدا بنا رکھا ہے ہندوستان میں اور کہیں بھی ہیں جہاں آدمی اپنی زندگی گزار سکتا ہے لیکن وہاں ہمارے اودھ کے جیسے قدردان حکمراں نہیں ہیں، یہی قدردانی اور مردم شناسی ہے جس نے میرے جیسے ہزاروں شرفا کے قدم پکڑ رکھے ہیں!"

ولی عہد بہادر نے کہا: "اچھا تو ہمیں اجازت دیں، ہماری بارگاہِ پدری میں حاضری کا حکم صادر ہوا ہے!"

کوتوال صاحب نے سراپا نیازمندی سے عرض کیا: "اور حضور یہ چھوٹے چھوٹے کام آپ دوسروں سے کیوں لیتے ہیں؟ آخر ہم کس دن کام آئیں گے، یہ بی ننھی جان کے معاملے میں حضور اگر اس گنہگار سے کام لیتے تو ننھی جان کی ماں بی جان کی اتنی ہمت ہی نہ ہوتی کہ وہ بیچ میں پڑ جاتی اور ٹال مٹول سے کام لیتیں، ہیں تو اس قطامہ کو چند ٹوڈوں میں صحیح کر دیتا!"

ولی عہد بہادر نے ناگواری سے کہا: "کوتوال صاحب! براہِ کرم آپ بی جان کو کچھ نہ کہیں کیونکہ ننھی جان کی ماں ہیں اور ننھی جان ہماری محبوبہ، آرامِ جاں اور معشوقۂ دل نواز۔ اس رشتے سے بی جان بھی لائقِ احترام ٹھہرتی ہیں!"

غلام رضا نے کوتوال صاحب سے کہا: "اچھا کوتوال صاحب! اس وقت تو آپ تشریف لے جائیں پھر کسی وقت حاضری دیجیے گا تو بہت سارے امور زیرِ بحث آئیں گے اور ولی عہد بہادر یہ جائزہ لیں گے کہ آپ ان کے حق میں کہاں کہاں اور کس حد تک سود مند ثابت ہوں گے!"

کوتوال صاحب ہاتھ ملا کے چلے گئے اور ولی عہد بہادر نے غلام رضا کو حکم دیا کہ ان کے واپس آنے تک یہیں حاضر رہیں لیکن غلام رضا نے رخصت چاہی اور عرض کیا کہ تھوڑی دیر بعد دوبارہ حاضر ہو جاؤں گا!"

نرم دل ولی عہد بہادر نے جواب دیا: "کوئی مضائقہ نہیں!"

غلام رضا چلا گیا اور ولی عہد بہادر ننھی جان کو لے کر پدر بزرگوار کی خدمت میں چلے گئے۔

موسم سرما کے دن تھے اوورکوٹ میں ملبوس ایک شخص کو چوری کی مرغی چھپاتے ہوئے پکڑا گیا۔ آس پاس کے بہت سارے لوگ جمع ہو گئے اور اس سے سوالات کی بوچھاڑ کر دی وہ کھڑا برابر چوری سے انکار کرتا رہا کسی نے چڑ کر ڈانٹتے ہوئے پوچھا: "اگر تو نے چوری نہیں کی تو یہ مرغی تیرے اوورکوٹ میں کس طرح پہنچ گئی؟"

ڈھیٹ چور نے جواب دیا: "میرے پاس اس فضول سوال کا کوئی جواب نہیں یہ سوال تم میرے بجائے مرغی سے کرو کہ یہ اڑ کر میرے اوورکوٹ میں کیوں آ چھپی!"

غلام رضا وہاں سے نکل کر شاہ مینا چلا گیا، مزار پر فاتحہ پڑھی، تھوڑی دیر بعد کوتوال صاحب بھی فاتحہ پڑھنے پہنچ گئے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ کوتوال صاحب نے کہا: "میں تمھیں ایک بار دیکھ کے واپس جا چکا ہوں پھر دوبارہ آیا ہوں!"

غلام رضا نے کہا: "حضور ولی عہد بہادر کی تو یہ خواہش تھی کہ میں ان کی واپسی تک حضور باغ ہی میں موجود رہوں لیکن میں یہ کہہ کر یہاں آ گیا کہ تھوڑی دیر میں دوبارہ حاضر ہو جاؤں گا!"

"خیر کوئی بات نہیں!" کوتوال نے کہا: "ہم دونوں نے اپنے اپنے حصّے کا کام خوب اچھی طرح انجام دیا۔" پھر اپنی جیب سے غلام رضا والا ہار نکال کے اسے واپس دیا، کہا: "یہ تمھاری امانت اس وقت بھی جیب میں تھی لیکن واپس کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ اب پیش کر رہا ہوں!"

غلام رضا نے ہار لے کے جیب میں رکھ لیا اور کوتوال کی صورت دیکھنے لگا۔

کوتوال نے پوچھا: "تمھیں اور کیا دے دیا جائے؟"

غلام رضا نے جواب دیا: "حق و انصاف سے میرے حصّے کا جو نکلتا ہو مجھے دے دیں!"

کوتوال کچھ دیر خاموش رہا، پھر کہا: "اچھا تم میرے گھر آ جانا اور اپنا حصّہ لے لینا!"

غلام رضا بھی کائیاں تھا، بولا: "کوتوال صاحب! اس سلسلے میں مجھے اپنے گھر نہ بلائیں بلکہ جو کچھ دینا دلانا ہے میرے گھر بھجوا دیں اور یہ مجھے اسی جگہ بتا دیں کہ اس میں میرا حصّہ کتنا ہے؟"

کوتوال نے جواب دیا: "پانچ سو روپے!"

"بس؟" غلام رضا نے حیرت سے پوچھا: "اور دونوں ہاروں اور پازیب میں میرا کوئی حصّہ نہیں؟"

کوتوال نے خشک لہجے میں جواب دیا: "پانچ سو بھی بہت زیادہ ہیں آگے کسی اور معاملے میں دیکھا جائے گا!"

"خیر یہی سہی!" غلام رضا نے جدا ہوتے ہوئے کہا۔

کوتوال نے کہا: "شام کو تمھاری رقم گھر پہنچ جائے گی!"

غلام رضا دوبارہ حضور باغ پہنچ گیا۔ ولی عہد بہادر اس وقت تک واپس نہیں آئے تھے، انھیں وہاں کئی مشکلوں سے دوچار ہونا پڑا۔ جب یہ ننھی جان کے ساتھ وہاں پہنچے تو ان کے والد امجد علی شاہ استراحت کے لیے تشریف لے جا چکے تھے اور ننھی جان کی ماں بی جان وزیر امین الدولہ کے پاس بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اس نے ان دونوں کو آتا دیکھ کر واویلا کرنا شروع کر دیا۔ وہ چیختی چلاتی ننھی جان کی طرف بڑھی لیکن وزیر امین الدولہ کے اشارے پر چند خدمت گار آگے بڑھے اور انھوں نے بی جان کو پکڑ لیا اور کھینچتے ہوئے وزیر امین الدولہ کے پاس لے گئے۔

وزیر نے بی جان کو ولی عہد بہادر کے سامنے کھڑا کر دیا اور کہا: "حضور اس کے لیے جو حکم دیں گے، اس پر عمل کیا جائے گا!"

ولی عہد بہادر نے ابھی زبان بھی نہ کھولی تھی کہ ننھی جان سسکیاں بھرنے لگی۔ ولی عہد بہادر نے ننھی جان کو آغوش میں لے لیا اور پریشان ہو کے پوچھا "جانِ دلبراں! تم کیوں رو رہی ہو؟ خیریت تو ہے؟"

ننھی جان نے روتے ہوئے کہا: "بندی اماں کو لویں بحالتِ تباہ نہیں دیکھ سکتی!"

ولی عہد بہادر نے امین الدولہ سے کہا: "بہتر ہے کہ انھیں ہمارے پاس بھیج دیا جائے!"

امین الدولہ نے کہا: "حضور! انھیں اِس خاکسار سے زیادہ آپ نہیں سمجھ سکتے، انھیں سیدھا رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ سختی سے کام لیا جائے!"

بی جان نے کہا: "تم لوگ جیسی سختیاں کرنا چاہو کر لو لیکن میں بھی بی جان نہیں جو حضور بادشاہ سلامت سے فریاد نہ کروں!"

امین الدولہ نے بے ساختہ کہا: "ملاحظہ فرمائیں!"

ننھی جان نے ماں کے پیر پکڑ لیے، بولی: "اماں بے جا ضد سے کام نہ لیں، اگر آپ کسی نہ کسی طرح بڑی سرکار میں پہنچ بھی گئیں تو آپ فریادی کس بنیاد پر ہوں گی؟"

بی جان نے جواب دیا: "یہی کہ ولی عہد بہادر نے میری ننھی جان کو اغوا کر لیا ہے!"

ننھی جان نے کہا: "لیکن میں یہ کہوں گی کہ مجھے کسی نے بھی اغوا نہیں کیا بلکہ میں اپنی مرضی سے ولی عہد بہادر کے پاس پہنچ گئی ہوں!"

"اے لڑکی! میں کہتی ہوں کہ یہ تجھ پر کیسا جادو کر دیا گیا ہے۔ تو بھی میرے خلاف گواہی دے گی، سچ کہا ہے کسی نے، تکیہ جن پتوں پہ تھا وہی ہوا دینے لگے!"

امین الدولہ نے ولی عہد بہادر سے پوچھا: "حضور اس فتنے کی بابت کیا حکم فرماتے ہیں؟"

ولی عہد بہادر نے کہا: "انھیں ہمارے پاس بھیج دیا جائے ہم وہیں ان سے بات کر لیں گے!"

امین الدولہ نے فکر مندی سے کہا: "لیکن یہ عورت آپ کے پاس جانا پسند کرے گی؟"

ننھی جان نے جلدی سے کہا: "کیوں نہیں، کیوں نہیں، بلکہ میں انھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی!"

امین الدولہ کی نظریں ولی عہد بہادر کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

ولی عہد بہادر نے کہا: "ننھی جان جو کہہ رہی ہیں، اس پر عمل کیا جائے!"

امین الدولہ نے مایوسی اور بے دلی سے کہا: "ولی عہد بہادر کی جیسی مرضی!"

ننھی جان نے ماں کو شانے سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔ اب بی جان بھی کسی حد تک سرد پڑ گئی تھی۔

امین الدولہ نے ولی عہد بہادر سے کہا: "حضور! اگر بی جان پھر سرکشی پر مائل نظر آئے تو اس غلام کو مطلع فرما دیجیے گا۔ ہم اس کا خفقان دو دن میں دور کر دیں گے!"

"بہتر ہے!" ولی عہد بہادر نے کہا: "اور جناب ہماری عدم موجودگی میں جب قبلہ والد صاحب اس مقدمے کی بابت دریافت فرمائیں گے تو آپ کیا جواب دیجیے گا؟"

امین الدولہ نے جواب دیا: "آپ اس فتنی کو قابو میں رکھیے گا، یہ خاکسار نواب شاہ سلامت کو ہر طرح مطمئن کر دے گا اور انھیں یہ یقین دلا دے گا کہ ننھی جان اپنی مرضی اور خواہش پر خود چل کر آپ کے پاس پہنچی ہے بس معاملہ ختم!"

ولی عہد بہادر حضور باغ واپس آئے یہاں غلام رضا پہلے ہی سے موجود تھا۔ بی جان کی اس پر جیسے ہی نظر پڑی، دانت کچکچا کے غصے میں اس پر جھپٹی اور گدی سے پٹے پکڑ کے وہ شدید جھٹکے ایسے دیے کہ وہ پشت کے بل زمین پر آ رہا۔ ولی عہد بہادر نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی لیکن یہ معاملہ ان کے بس کا نہ نکلا۔ غلام رضا نیچے پڑا چیخ رہا تھا: "ارے ارے مجھے کیوں مارتی ہے چڑیل، تیری لڑکی خود اپنی مرضی سے آئی ہے، اس میں میرا کیا قصور!" پھر ولی عہد بہادر سے کہا۔ "حضور ملاحظہ فرما رہے ہیں اس شیطان کی نانی کے کرتوت، اس نے میرے پٹے ناحق پکڑ رکھے ہیں!"

اور بی جان بپھری ہوئی شیرنی کے مانند گرج رہی تھی "قسم ہے جناب امیر کی کہ آج اس کا لہو نہ پیا تو کچھ بھی نہ کیا، آج اسے اس لائق نہ چھوڑوں گی کہ میری طرح کسی اور کی بہو بیٹی بھگائے!"

ولی عہد بہادر کی ایما پر چند محل دارنیوں نے بی جان کے جھونٹے پکڑ لیے اور اسے کھینچ کر غلام رضا کی جان چھڑائی۔

ولی عہد بہادر نے ناخوشگوار لہجے میں کہا: "ہم تو تمھیں یہ سوچ کے یہاں لے آئے تھے کہ تمھیں خوش دامن بنا کے اپنے پاس ہی رکھ لیں گے لیکن تم حد درجے مشتعل مزاج اور بے ادب نکلیں، اگر تم اب بھی توبہ کر لو اور شرفا کی طرح رہنے کا وعدہ کر لو تو ہم اب بھی اس پر رضامند ہیں اور تمھیں نہایت عزت سے رکھیں گے!"

بی جان بے بس ہو کر رونے لگی۔ اس کے سر پر محل دارنیوں کا پرا عفونت کے فرشتوں کی طرح آنکھیں نکالے کھڑا تھا۔

غلام رضا نے آزاد ہوتے ہی ولی عہد بہادر کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑا کے عرض کیا: "حضور والا! اگر آپ واقعی اس خون کی پیاسی دیوی کو اپنے ساتھ رکھنے پر مصر ہے تو یہ بندہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ جائے گا؟"

ولی عہد بہادر کی طبیعت حد درجے منغض ہو چکی تھی۔ انھوں نے دارو غہ نجم النسا سے کہا: "اس فتنی کو خدا کے لیے یہاں سے دفعان کرو، ہم تو عاجز آ چکے ہیں اس شور غل سے!"

آخر بمشکل تمام یہ طے پایا کہ ولی عہد بہادر بی جان کو ننھی جان کے عوض پانچ ہزار روپے، دو کشتیاں پارچہ جات اور تقریباً بیس ہزار کی مالیت کے زیورات دیں گے۔ ننھی جان راتیں ولی عہد بہادر کے ساتھ اور دن اپنی ماں کے پاس گزاریں گی۔ ولی عہد بہادر نے تمام شرائط مان لیں اور بی جان کو دے دلا کے بمشکل وہاں سے رخصت کر دیا گیا۔

ولی عہد بہادر ننھی جان پر کچھ اس طرح قربان ہوئے کہ کسی اور کا کمتر ہی خیال آیا۔ جب وہ دن میں چلی جاتی تو ولی عہد بہادر پر اداسی اور شاعری کا دورہ پڑتا۔ محل کی بیسیوں حسین و جمیل عورتیں اور نوخیز لڑکیاں ولی عہد بہادر کا دل بہلانے کی کوشش کرتیں لیکن ولی عہد بہادر باری باری ان سبھوں کے عشق میں مبتلا رہ کر اور شربت وصل پی پی کر صحت یاب ہو چکے تھے۔ ان کی حیثیت چھوٹی شراب جیسی تھی یا چبائے ہوئے نوالے جیسی، اب ولی عہد بہادر کو ان میں وہ لذت نہیں محسوس ہوتی تھی جیسی ان کی اولین صحبتوں میں حاصل ہوتی رہی تھی۔ ننھی جان ان سب کے حسد اور جلاپے کا نشانہ تھی اور انھیں اچھی طرح یقین تھا کہ وہ دن زیادہ دور نہیں جب ننھی جان بھی انھی کے زمرے میں شامل کر دی جائے گی۔ محل کی ان عورتوں کی تعلیم و تربیت پر جو استاد ملازم رکھے گئے تھے، وہ اپنے وقت کے بہت بڑے گویے اور موسیقار تھے۔ انھی میں تینتیس چونتیس سالہ نومسلم راجپوت قطب علی خاں ستار نواز بھی تھا۔ بریلی کا رہنے والا یہ بانکا ستار نواز خوب صورت بھی تھا اور عاشق مزاج بھی، بڑی بڑی مونچھیں، گندمی رنگ، بال لمبے گدی پر پڑے ہوئے، لکھنے پڑھنے میں ماہر، اچھا شاعر۔ ولی عہد بہادر نے اس سے خود بھی ستار بجانا سیکھا اور محل کی مہوشوں کو بھی سکھلوایا۔ غلام رضا کی طرح اسے بھی ولی عہد بہادر کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ زمانہ علم موسیقی میں اسے نایک کا درجہ دیتا تھا۔

محل میں کنول روشن ہو چکے تھے۔ باہر راستوں کے آس پاس مرچنگیں جلا دی گئی تھیں، ولی عہد بہادر کے سامنے قطب علی خاں ستار نواز بیٹھا تھا۔

ولی عہد بہادر کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں، استاد قطب علی ولی عہد بہادر کی بے چینی محسوس کر رہا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ انھیں اس وقت کس کا انتظار ہے۔ ولی عہد بہادر یکایک اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ قطب علی بھی کھڑا ہو گیا، پاس جا کے پوچھا۔

"نصیب دشمناں! آج حضور کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں!"

ولی عہد بہادر نے ٹھنڈی سانس بھر کے جواب دیا: "غلام رضا، ہمارا پرانا نمک خوار ہے لیکن اسے اتنا بھی احساس نہیں کہ انتظار نے ہمیں کتنا پریشان کر رکھا ہوگا۔ الانتظار اشد من الموت (انتظار میں موت جیسی سختی ہے)۔"

قطب علی نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا: "کس کی نمک خواری کا ذکر فرما رہے ہیں آپ؟ غلام رضا کی؟ حضور والا! آپ کو میری بات اچھی لگے یا بری لیکن میں کہوں گا ضرور یہی۔ غلام رضا کی بابت لوگ معلوم نہیں کیسی کیسی باتیں کرتے پھرتے ہیں، وہ سرے سے آپ کا نمک حلال یا وفادار ہے ہی نہیں!"

ولی عہد بہادر نے کہا: "الیا مت کہو قطب علی خاں! اس نے ننھی جان کے معاملے میں بڑی وفاداری کا ثبوت دیا ہے اور وہ ہر روز چراغ جلتے ہی ننھی جان کو لے کر حاضر ہو جایا کرتا ہے، آج معلوم نہیں کیا افتاد پیش آئی کہ ابھی تک غائب ہے!"

قطب علی نے بے بسی سے کہا: "اگر حضور غلام رضا کو ایسا تصور فرماتے ہیں تو ایسا ہی ہوگا لیکن زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو، دنیا تو غلام رضا کو کچھ اور ہی کہتی ہے!"

ولی عہد بہادر ننھی جان کی مفارقت میں گنگنانے لگے۔ مزاج شناس دارو غہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

نجم النسا نے ولی عہد بہادر کی دل بستگی کی خاطر محفلِ رقص و موسیقی منعقد کر دی۔ ولی عہد بہادر جانِ محفل بنے اور ان کے سامنے پریوں کے غول کھڑے ہو گئے۔ ایک طرف سازندے بیٹھ گئے۔ طبلے پر تھاپ پڑی گھنگھرو کھنکنے اور جسم تھرکنے لگے۔ ولی عہد بہادر نے استاد قطب علی خاں کو اپنے بائیں جانب بٹھا لیا۔

پہلے کئی پریوں نے مل کے رقص کیا۔ اس کے بعد مشّاق اور نوخیز لڑکیوں نے فرداً فرداً ناچنا شروع کیا۔ ولی عہد بہادر کا غم غلط ہو رہا تھا۔ رقص کے بعد گانے والیاں آگے بڑھیں اور سازوں کی ہم آہنگی سے محفل میں آگ سی لگا دی۔ ولی عہد بہادر کو پھر ننھی جان یاد آنے لگی، فرمایا: ”ہائے ہائے اس وقت ننھی جان نہ ہوئیں ہمارے پہلو میں!“

قطب علی خاں نے سرگوشی میں عرض کیا: ”حضورِ والا سے کچھ عرض کرنے کی ہمت کرتا ہوں اور ڈر کر رہ جاتا ہوں!“

”کہو کہو ڈرو مت!“ ولی عہد بہادر نے جواب دیا۔

قطب علی نے کہا: ”حضورِ والا بیگم تاج محل سے تو واقف ہی ہوں گے؟“

”خوب اچھی طرح، خدا نے انھیں بلا کا حسن عطا فرمایا ہے اور ان کی نظر کا گھائل مشکل ہی سے جاں بر ہوتا ہے!“

”تو کیا خیال ہے حضور کا۔ اگر فرمائیں تو انھیں کل ہی خدمتِ عالی میں حاضر کر دیا جائے؟“

ولی عہد بہادر نے جواب دیا: ”ہم سے زیادہ حُسن کا قدر دان کون ہو گا؟ تاج محل کا زخم ہمارے دل پر بھی ہے لیکن ان سے ملنے میں ایک قباحت ہے!“

”یعنی؟ کچھ بندے کو بھی اس بات کا پتہ چلے تو شاید اسے دور کرنے کی کوشش کرے!“

ولی عہد بہادر نے جواب دیا: ”وہ بدقسمتی سے ہمارے چچا حضرت نصیرالدین حیدر خلد منزل کی محل رہ چکی ہیں بس ذرا چچا کا ادب و لحاظ مانع ہے ورنہ تمھیں نہیں معلوم کہ خود تاج محل نے کئی بار ہم سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔“

قطب علی نے کہا: ”اچھا وہ نہیں تو کوئی دوسری سہی، ایک اور پری پیکر میری نظر میں ہے اگر حضور کی اقبال مندی اور اپنی قسمت نے یاوری کی تو اسے دو ایک دن میں حاضر کر دوں گا!“

ولی عہد بہادر کی پوری توجہ قطب علی کی طرف منعطف ہو گئی۔ حالتِ اضطرار میں فرمایا: ”ماں واللہ؟ کہاں ہے وہ پری پیکر؟ یعنی یہ بات ہے کہ ہمیں اس کی ہوا تک نہ دی، تمھیں قسم ہے جو تم اسے کل ہی ہمارے روبرو پیش نہ کرو!“

قطب علی نے جواب دیا: ”آپ بے فکر رہیں میں غلام رضا نہیں ہوں، میرے قول و فعل میں حضورِ والا کبھی بھی تضاد نہ پائیں گے جو کہوں گا اسے پورا کروں گا!“

سازندے اور محوِ رقص لڑکیاں ولی عہد بہادر کی عدم توجہ کے باعث اکتا رہی تھیں، ڈرتے ڈرتے داروغہ نجم النسا نے ولی عہد بہادر سے عرض کیا: ”اگر رقص و موسیقی سے حضورِ والا کی طبیعت سیر ہو چکی ہو تو یہ محفل برخاست کر دی جائے!“

لیکن اسی وقت ولی عہد بہادر کے چھوٹے بھائی مرزا سکندر کی تشریف آوری کا غلغلہ بلند ہوا، لوگ مؤدب ہو گئے۔ قطب علی خاں کھسک کر دور جا بیٹھا۔

مرزا سکندر نے سر کے اشارے سے رقص و موسیقی جاری رکھنے کا حکم دیا اور بڑے بھائی سے کہنے لگے: ”ہم نے آپ کی پریوں کی بڑی تعریفیں سنی ہیں اس وقت ان کے فن کا مشاہدہ کرنے آ گئے ہیں!“

ولی عہد بہادر نے کہا: ”خوب! ماشاءاللہ تم بھی تو اپنے آس پاس جمالِ بے مثال اور پری تمثال کا ہجوم لازوال رکھتے ہو، پہلے تم ہمارے کلاونتوں کا مشاہدہ کر لو، پھر ہمیں اپنی پریوں سے ملا دینا!“

مرزا سکندر نے مسکرا کر کہا: ”سرِ دست ہمارے پاس ایک ایسی زبردست مغنّیہ اور رقّاصہ موجود ہے کہ اس کے جمال و کمال کی دوسری کوئی مثال نہیں ملتی!“

ولی عہد بہادر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا: ”پھر ہمیں بھی ملاؤ اس حُسنِ بے مثال اور شاہکارِ باکمال سے!“

”ضرور ملائیں گے!“ مرزا سکندر نے جواب دیا۔

”پھر کب؟“ ولی عہد بہادر نے بے چینی سے سوال کیا۔

”عنقریب کسی بھی دن، آپ اس کے لیے پریشان ہرگز نہ ہوں!“

”واہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو!“ ولی عہد بہادر کی بے تابی قابلِ دید تھی۔

مرزا سکندر غالباً دل ہی دل میں پچھتا رہے تھے کہ ناحق یہ ذکر کیا۔

ولی عہد بہادر نے پوچھا: ”پھر ہم اس کی کل تک امید کریں؟“

مرزا سکندر نے جواب دیا: ”ہم کوشش کریں گے!“

اس کے بعد مرزا سکندر رقص و موسیقی میں کھو گئے۔ انھیں بڑا مزہ آیا۔ کچھ دیر بعد جب یہ جانے لگے تو ولی عہد بہادر نے ایک بار پھر عہد لیا: ”تو کل شام تک تم اس آفتِ جاں سے ضرور ملا دو گے؟“

”اگر اللہ نے چاہا۔“ مرزا سکندر جواب دے کر چلے گئے تو ولی عہد نے قطب علی کو پھر اپنے قریب بلا لیا اور کہا: ”تو تم اپنے ہیرے کو کب لا رہے ہو؟“

قطب علی نے جواب دیا: ”غالباً کل ہی، آپ زیادہ فکر نہ کریں!“

ولی عہد بہادر نے سینے پر ہاتھ مار کے جواب دیا: ”فکر کیسے نہ کریں، اس دل پر ہاتھ رکھ کے دیکھو کسی کی یاد میں کس بُری طرح دھڑک رہا ہے!“

رقص و موسیقی کی محفل برخاست کی گئی۔ صبح قریب تھی، خواب گاہ میں جاتے ہوئے ولی عہد بہادر کو دُکھ ہو رہا تھا۔ اِس عالمِ بے کیفی اور لمحۂ بے لطفی میں نجم النسا نے بڑا کام کیا۔ معلوم نہیں کہاں سے لا کے حسن و شباب کی ایک نازک اندام ولی عہد بہادر کی آغوش میں ڈال دی اور کہا: ”اسے میں نے انھی بے لطفی کے موقعوں کے لیے رکھ چھوڑا تھا، بارے خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے شرمندہ نہیں کیا۔“

ولی عہد بہادر نے اس پری پیکر کو اسی وقت اپنی مسہری پر گرا لیا اور اس سے ہم آغوش ہو کے بوس و کنار کرنے لگے۔

اس کا نام عمدہ بیگم تھا، ننھی جان کی کمی اس نے پوری کر دی تھی!

دوسرے دن پہر دن چڑھے ہانپتا کانپتا غلام رضا بھی نازل ہو گیا۔ اس کے

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

ہاتھوں پیروں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، ولی عہد بہادر نے گھبرا کر کہا۔ "یا اللہ خیر تم نے اپنا یہ حال کیا بنا رکھا ہے؟"

غلام رضا نے جواب دیا۔ "حضور کچھ نہ پوچھیے، حضور پر سے صدقے ہو جانے کی ایک خواہش تھی جو پوری نہیں ہو سکی۔"

"غلام رضا!" ولی عہد بہادر نے کہا۔ "کچھ عرض بھی کرو!"

غلام رضا نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "کل جب میں ننھی جان کو لینے پہنچا تو اُس گھر میں ایک گرانڈیل شخص کو موجود پایا، میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ لوگ اس سے ڈرتے ہیں، میں نے ننھی جان سے کہا کہ حضور ولی عہد بہادر کے پاس چلنے کی تیاری کر لو۔"

ولی عہد بہادر نے نہایت انہماک سے یہ داستان سُنی اور دریافت کیا "پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ ہوا کہ میں نے وہاں شور غل مچایا۔ اس پر وہ شخص اکڑ کر میرے قریب آیا اور پوچھا۔ تم یہ شور غل کیوں کر رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ میں ننھی جان کو لینے آیا ہوں اور تم کون ہو شیطان کی اولاد!"

اس نے یہ سنتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ میری مرمت شروع کر دی۔ ننھی جان اور بی جان نے بمشکل مجھے اُس یزید کے چنگل سے آزادی دلائی، میں بھی مار کھانے کے باوجود وہیں ڈٹا رہا اور ننھی جان کو لانے پر مُصر رہا۔ بہت بعد میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ ننھی جان کی اس کے ساتھ منگنی ہو چکی ہے اور اب وہ بی جان سے شادی کی تاریخ لینے آیا ہے۔"

ولی عہد بہادر نے گھبرا کر کہا۔ "یعنی یہ کیا بات ہوئی؟ یہ بات ننھی جان نے ہمیں کیوں نہ بتائی؟"

غلام رضا نے جواب دیا۔ "حضورِ والا عورت ذات بڑی شرمیلی ہوتی ہے بس شرم و حیا آڑے آئی ہوگی ورنہ جہاں تک میں جانتا ہوں ننھی جان آپ پر جان دیتی ہے!"

ولی عہد بہادر نے پوچھا۔ "پھر اب کیا ہوگا غلام رضا خان صاحب؟ ہم تو اس کی جُدائی میں کوچ کر جائیں گے!"

"حضورِ والا مایوس نہ ہوں، خدا پر بھروسا رکھیں، اللہ نے چاہا تو ساری مشکلیں دُور ہو جائیں گی!"

ولی عہد بہادر نے کہا۔ "کچھ بھی ہو ہم ننھی جان سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں تم کسی وقت کوتوال کو ہمارے پاس لے آنا، وہ سب کچھ درست کر دے گا!"

غلام رضا نے کہا۔ "کوتوال صاحب وہاں جاتے ہی جوتے کاری شروع کر دیں گے جب کہ حالات اور وقت کا تقاضا کچھ اور ہی ہے۔ میں ننھی جان کے منگیتر کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ میں اس میں ناکام نہیں رہوں گا!"

"بے شک اب تمہی کچھ کر سکتے ہو ورنہ ہمارے تو ہوش و حواس ہی ٹھکانے نہیں رہے!"

غلام رضا نے آس پاس کا سرسری جائزہ لے کے دریافت کیا۔ "تو حضور والا کی طرف سے اجازت ہے؟"

"بالکل بالکل۔ ہماری طرف سے تمھیں ہر بات کی اجازت ہے!"

غلام رضا فوراً ہی واپس جاتے ہوئے بولا۔ "پھر حضورِ والا انتظار فرمائیں بندہ بہت جلد اس مشکل پر بھی قابو پا لے گا اور ننھی جان کو ایک بار پھر آغوشِ جانِ عالم میں لا بٹھائے گا!"

"آمین!" ولی عہد بہادر نے کہا۔ "خدا تمھیں کامیابی سے ہم کنار کرے!"

✱

پورا دن اِس انتظار میں گزر گیا کہ مرزا اسکندر اپنی محبوبہ کو لے کر آئیں گے لیکن وہ نہیں آئے شام کے قریب ان کا پیغام آ گیا کہ پچھلے دو دنوں سے وہ بہت زیادہ رقص کرتی رہی ہیں اس لیے تکان غالب ہے، جیسے ہی چست آئے گی مرزا اسکندر انھیں لے کر حاضر ہو جائیں گے۔ اس پیغام سے بڑی مایوسی ہوئی اور ولی عہد بہادر کو بڑا دُکھ پہنچا، زیرِ لب فرمایا۔ "ایسی بھی تکان کیا کہ ہمارے پاس آتے آتے گویا پاؤں ٹوٹ جائے!" اب انھیں قطب علی کا انتظار تھا۔ انتظار، انتظار، انتظار۔ ولی عہد بہادر کو اس لفظ سے بخار چڑھنے لگا، وہ اکثر یہ جملہ دہراتے رہتے کہ اودھ کا ولی عہد بہادر اور زحمتِ انتظار! واللہ کیسی ستم ظریفی ہے قسمت کی!"

محل سرا کی پریوں نے دل بہلانے کی کوشش کی کچھ دیر غم غلط بھی ہوا لیکن طبیعت پھر نوبہارِ ناز کے انتظار پر مائل ہو گئی۔ قطب علی خاں نصف رات گزر جانے کے بعد ایک لڑکی لایا بھی تو وہ صرف گیارہ سال کی تھی، ناک نقشہ ہزاروں میں ایک رنگ میدہ شہابی، آنکھیں نشے میں ڈوبی ہوئی، چال قیامت، معصومیت ہوش رُبا لیکن اس سے ولی عہد بہادر کیا دل بہلاتے، قطب علی سے فرمایا۔ "بھئی تم یہ کیسے لے آئے؟ ہم تو کچھ اور ہی سمجھ رہے تھے!"

قطب علی نے جواب دیا۔ "حضور! یہ نادر شے ذرا پرورش و پرداخت چاہتی ہے، دو سال بعد ایسی قیامت نکلے گی کہ حضور کو مزہ آ جائے گا!"

ولی عہد بہادر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ بات تو ہے!" پھر داروغہ نجم النسا کو بلا کر حکم دیا۔ "نجم النسا! اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور کھلا پلا کے ایسی اعلا تربیت دو کہ دو سال بعد جب ہم اسے دوبارہ طلب کریں تو ہمیں مایوسی نہ اُٹھانی پڑے؟"

شوہر

شوہر نے اپنے دروازے کے سامنے کسی کو کھڑے دیکھا تو چپکے چپکے اس کے پاس پہنچا اور دھوکے سے اس پر حملہ آور ہو گیا۔ شور غل سن کر آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے۔

لوگوں میں سے کسی نے پوچھا "جناب آپ نے اس اجنبی کو خواہ مخواہ پیٹ ڈالا۔ اس سے کیا غلطی سرزد ہوئی تھی؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "بس ذرا غلطی ہو گئی تھی میں اسے بھی اپنی بیوی کا رشتے دار سمجھ بیٹھا تھا۔"

نجم النسا نے ادب سے جواب دیا: "بہت بہتر ہے بندہ پرور! آپ مطمئن رہیں!"

"اور ہاں دیکھو!" ولی عہد بہادر نے کہا: "ایک شاندار محفلِ رقص و موسیقی منعقد کی جائے، ہم پر آج پھر اداسی کا شدید دورہ پڑ رہا ہے!"

حکم کی دیر تھی، فوراً ہی ایک شاندار محفلِ موسیقی منعقد ہوگئی، ولی عہد بہادر راجا اندر بن گئے اور ان کے روبرو ہر رنگ پری رقص و موسیقی کے جوہر دکھانے لگی۔ ولی عہد بہادر سے ان کی لگاوٹیں اور اشارے ایسے نہیں تھیں کہ وہ ان کا اثر نہ لیتے۔ وہ ناچتے ناچتے ولی عہد بہادر کے پاس جاتیں اور بھاؤ بتا کے اس طرح للچاتیں کہ ولی عہد بہادر اپنا دل پکڑ کے رہ جاتے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ولی عہد بہادر جیسے ہی بیدار ہوئے انھیں مطلع کیا گیا کہ غلام رضا باریابی کا خواستگار ہے۔ حکم ہوا "فوراً حاضر کیا جائے!"

غلام رضا، ولی عہد بہادر کے سامنے تین بار جھک کے کورنش و تسلیمات بجا لایا اور عرض کیا: "حضورِ والا! جناب کی اقبال مندی سے کام بن گیا ہے۔ ننھی جان کا منگیتر دستبرداری کے عوض پندرہ ہزار روپے مانگتا ہے۔ اس ناچیز نے حضور کی طرف سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ پندرہ ہزار کیا، بات عزت و آبرو اور شاہی آن کی ہے، اس پر پچاس ہزار بھی نچھاور کر دیے جائیں تو کوئی حرج نہیں، بہرحال پھر بھی بات پکی ہو گئی ہے۔ آپ مجھے پندرہ ہزار روپے عنایت فرمادیں تاکہ میں یہ روپے ننھی جان کے منگیتر کے منہ پر مار کے ننھی جان غریب کو اس موذی کے چنگل سے نجات دلاؤں اور آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں!"

ولی عہد بہادر نے ہنکاری بھری اور غلام رضا کو اسی وقت پندرہ ہزار روپے دلوا دیے جب غلام رضا جانے لگا تو انھوں نے دریافت کیا: "پھر کس وقت حاضر ہو رہے ہو تم ننھی جان کو لے کر؟"

غلام رضا نے جواب دیا: "شاید ابھی اسی وقت، اگر اس وقت کسی وجہ سے نہ لا سکا تو پھر رات کو عشا سے پہلے ضرور لے آؤں گا!"

ولی عہد بہادر نے سکوت اختیار کیا، غلام رضا چلا گیا تو قطب علی نے حاضر ہو کر ولی عہد بہادر کو یہ خبر سنا کے پریشان کر دیا کہ "غلام رضا جھوٹا ہے، ننھی جان کا کوئی منگیتر ونگیتر نہیں، یہ سب چھوٹے سرکار سے روپے اینٹھنے کے بہانے ہیں اور کچھ نہیں"۔ اور اس نے ولی عہد بہادر سے شرط لگائی کہ اگر غلام رضا ننھی جان کو لے کر حاضر ہو جائے تو وہ شرط ہارنے کی وجہ سے ہر وہ سزا جھیلنے کو تیار ہے جو ولی عہد بہادر تجویز فرمائیں گے!

ولی عہد بہادر نے تکلفاً کہا: "رات زیادہ دور تو نہیں، غلام رضا ہمارا نمک خوار ہے وہ شاید نمک حرامی کا مرتکب نہیں ہو گا!"

"یہ حضورِ والا کی اعلاظرفی ہے کہ ہر کسی کو اچھا اور نیک تصور فرماتے ہیں!"

ولی عہد بہادر نے پوچھا: "کل تم جس لڑکی کو لائے تھے وہ کس سے لائے تھے اور اس کا کوئی معاوضہ وغیرہ؟"

قطب علی نے جواب دیا: "بس حضور نے اسے پسند فرما لیا یہی اس کا معاوضہ ہے!"

"نہ بابا! ہمیں یہ بات ہرگز پسند نہیں، تمھیں تو اس کی قیمت لینی ہی پڑے گی!"

قطب علی نے کہا: "اگر حضور اس کی قیمت کی ادائی پر اتنے ہی مصر ہیں تو یہ مسئلہ بھی آپ ہی پر چھوڑتا ہوں اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ سے ناانصافی ہو ہی نہیں سکتی!"

ولی عہد بہادر نے اس لڑکی کے عوض قطب علی کو تین ہزار روپے دلوا دیے۔

رات کو پھر اسی انتظار سے واسطہ پڑا جس سے ولی عہد بہادر کی جان سوکھتی تھی، غلام رضا پھر غائب تھا۔ ولی عہد کو رہ رہ کے غصہ آ رہا تھا۔ مرزا اسکندر کا بھی کہیں پتہ نہ تھا۔ لوگوں سے پرسش کرنے پر بس اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ وہ بھی کچھ زیادہ ہی مصروف ہیں، اس رات ایک دوسرے سازندے نے خلافِ توقع ایک غیر معمولی شکل و صورت کا نوخیز معروضہ ولی عہد بہادر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جھاڑ فانوس اور کنول کی روشنی میں اس نوآمدہ کا چہرہ آگ کی طرح تمتماتا نظر آ رہا تھا۔ سازندے نے عرض کیا: "حضورِ والا! کئی دن سے یہ ناچیز آپ کو بہت پریشان پریشان اور کھویا کھویا سا محسوس کر رہا تھا اور کوئی علاج تو اس غلام کے بس کا تھا نہیں، ڈالی گنج سے یہ دُرِ بے بہا اپنے ہاتھ آ گیا تھا، میں اسے حضور کی خدمت میں لے آیا!"

ولی عہد بہادر کی تیز اور حسن پرست نظروں نے اس بیس بائیس سالہ حسینہ کا کچھ ایسا جائزہ لیا کہ وہ سکڑنے سمٹنے لگی، ولی عہد بہادر نے اسے اپنے قریب بلایا اور دریافت کیا: "تمھارے پدرِ بزرگوار کیا کرتے ہیں؟"

"ان کا انتقال ہو گیا!" لڑکی نے جواب دیا۔

"پھر تم کس کے ساتھ رہتی ہو؟"

"اپنے شوہر کے ساتھ!"

"شوہر کے ساتھ؟" ولی عہد بہادر نے چونک کے سوال کیا۔

"جی ہاں جناب، بندی اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے!"

ولی عہد بہادر نے پوچھا: "تم یہاں ہمارے پاس کس لیے آئی ہو؟"

لڑکی نے اپنی نظریں پیر کے انگوٹھے پر گاڑ رکھی تھیں، نظریں اٹھائے بغیر بولی: "بندی نے حضور کے حسن کی اتنی تعریفیں سن رکھی تھیں کہ آپ کی نادیدہ عاشق ہو گئی اور میں مہینوں سے ہجر و فراق کی آگ میں جل رہی تھی!"

"خوب!" ولی عہد بہادر نے تبسم فرمایا: "یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے حسن کا چرچا چہار دانگ عالم میں خود بخود پھیل گیا ہے؟" پھر سوال کیا: "تم نے ہمیں دیکھا تو کیسا پایا؟"

لڑکی نے ذرا سی نظر اوپر اٹھا کر پھر جھکا لی، بولی: "بس جس طرح ضبط کیے کھڑی ہوں، کچھ میں ہی جانتی ہوں، ورنہ اندر دل کا یہ عالم ہے کہ قابو ہی میں نہیں آ رہا، حضور کے حسنِ خرد سوز نے سارے جسم میں ایک عجیب سی سنسناہٹ پھیلا دی ہے اور پیروں کی طاقت آہستہ آہستہ سلب ہوتی جا رہی ہے!"

ولی عہد بہادر نے آگے بڑھ کر لڑکی کو سہارا دیا اور مسہری پر لا بٹھایا، اس سے بھڑ کر خود بھی بیٹھ گئے، پوچھا: "تمھارا نام کیا ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا: "پری خانم!"

ولی عہد بہادر کا چہرہ خوشی سے لہک اٹھا، بے اختیار اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور اس کے لب و رخسار پر بوسوں کی بارش کر دی، ذرا دم لے کر بولے: "کیسا

نیا سرف
صابن سے کہیں زیادہ صاف اور اُجلا دھوتا ہے
NEW Surf
washes cleaner.... and it shows
فرق صاف ظاہر ہے!
سرف سے دُھلائی:-
دیکھیں پانی کتنا میلا ہو گیا۔
صابن سے دُھلائی:-
پانی زیادہ میلا نہیں ہوا۔
دُھلائی کا خرچ صرف تین (۳) پیسے فی کپڑا
SF.2.74 UD.R
R: LINTAS

خوبصورت نام ہے تمھارا، بالکل حسن و صورت جیسا!"

پری خانم نے خود کو ولی عہد بہادر کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ بڑی دیر تک لطفِ صحبت اُٹھاتے رہے، خود بھی پسینے پسینے ہو گئے، پری خانم کو بھی ہلکان کر ڈالا، جب ہوش بجا ہوئے تو اسے اپنے سامنے بٹھا لیا اور چہرے کی بے داغ سطح کا مشاہدہ کرنے لگے۔ پھر سوال کیا: "اچھا پری خانم! اب تم یہ بتاؤ کہ تم بھی کوئی پیمانِ وفا بھی باندھو گی یا یوں ہی بعض دوسروں کی طرح ہمیں بلکتا سسکتا چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟"

پری خانم نے جواب دیا: "بندی نے تو حضور سے عشق کیا ہے اور کوئی عاشق بھی کہیں دھوکا کرتا ہے!"

ولی عہد بہادر نے اس کی نرم و ملائم زلفیں نتھنوں سے لگا لیں اور سانس اُوپر کھینچتے ہوئے فرمایا: "اگر یہ بات ہے تو تم اپنے شوہر کا کیا کرو گی؟"

پری خانم نے جواب دیا: "طلاق لے لوں گی!"

ولی عہد بہادر نے کسی قدر خوشی کا اظہار کیا: "خوب خوب! واللہ عشق اسے کہتے ہیں، ایک اپنی ننھی جان ہیں کہ اپنے عشق کا دم تو بہت بھرتی ہیں لیکن بزدلی کا یہ عالم ہے کہ منگیتر سے پیچھا چھڑانا امرِ محال محسوس کر رہی ہیں!"

پری خانم نے پوچھا: "یہ ننھی جان کون ہے حضورِ والا؟"

"ایک ہیں؟" ولی عہد بہادر نے جواب دیا: "چند دن پہلے تک اپنا دل انھی کی مٹھی میں تھا!" یہ کہتے کہتے ولی عہد بہادر نے نہایت گہری ٹھنڈی سانس بھری بولے: "سوچتے ہیں اب اس بے وفا کا دل میں خیال تک نہ لائیں!"

پری خانم نے سکوت اختیار کیا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ولی عہد بہادر نے پوچھا: "اچھا ہم دونوں کی ملاقات کب اور کس طرح ہوا کرے گی؟"

پری خانم نے جواب دیا: "حضورِ والا میرے لیے دن رات کا کوئی بھی حصہ مقرر فرما دیں، یہ بندی اسی وقت حاضر ہو جایا کرے گی؟"

ولی عہد بہادر نے کہا: "رات کیسی رہے گی؟"

پری خانم نے جواب دیا: "چند دنوں تک دن کی ملاقاتیں رکھیے تو اچھا رہے گا، پھر رات کو بھی رہ جایا کروں گی!"

"تمھاری خوشی!" ولی عہد نے کہا: "لیکن آج کی پوری رات تو ہماری ہے!"

"بسر و چشم!" پری خانم نے جواب دیا۔

اور اسی صحبت میں ولی عہد بہادر پر یہ راز کھلا کہ پری خانم صرف حسین و جمیل ہی نہیں، ناچ گانے میں بھی طاق ہے، اس خوبی نے ولی عہد بہادر کے دل کو اور زیادہ فتح کر لیا۔

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کنول اور فانوس میں روشن قندیلیں سست اور سوگوار محسوس ہو رہی تھیں، بالکل اسی طرح جس طرح بڑھاپے کی چوکھٹ میں داخل ہو کر جوانی اداس اور سوگوار ہو جاتی ہے۔ ولی عہد بہادر نہ خود سوتے تھے اور نہ پری خانم کو سونے دیتے تھے۔ اسی لمحے ایک بگھی محل سرا سے کافی دور رکی اور اس میں سے ایک عورت نیچے اتری، اس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا۔ عورت نے اپنی جوتیاں اُس مرد کے حوالے کر دیں۔ عورت سفید چادر میں لپٹی ہوئی تھی، دونوں ایک دوسرے کو لمحے بھر کے لیے دیکھا اور عورت نے مرد سے کہا: "غلام رضا! تم اسی بگھی میں واپس جاؤ!"

غلام رضا نے جواب دیا: "میں اُس وقت تک یہاں کھڑا رہوں گا جب تک تم محل سرا میں داخل نہ ہو جاؤ گی!"

عورت نے پریشان لہجے میں کہا: "غلام رضا! مجھے ڈر ہے کہ یہ بگھی کوئی دیکھ نہ لے!"

غلام رضا ہنس دیا: "اگر کوئی اِس بگھی کو دیکھ بھی لے گا تو اس میں تمھارا کیا نقصان ہے ننھی جان! وہ یہ کس طرح سمجھے گا کہ تم اس بگھی سے آئی ہو!"

"ہاں تمھاری یہ بات بھی درست ہے!" ننھی جان نے جواب دیا: "اچھا میں چلتی ہوں، اب صبح ملاقات ہو گی!"

غلام رضا نے کہا: "خوش قسمتی سے بخار بھی بڑے اچھے وقت پر آیا ہے، اس اتفاق سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرنا!"

ننھی جان نے محل سرا کی طرف جاتے ہوئے کہا: "فکر نہ کرو، یہ میرا کام ہے، ننھی جان کا کام!"

اِدھر ننھی جان محل میں داخل ہوئی، اُدھر بگھی واپس ہو گئی۔

داروغہ نجم النسا نے ننھی جان کو اسی وقت ولی عہد بہادر کی خدمت میں پہنچا دیا۔ ننگے پیر، جن پر گرد و غبار جما ہوا۔ جسم بخار سے تپتا ہوا، چادر میں چھپی دبی ننھی جان جب ولی عہد بہادر کی خلوت میں پہنچائی گئی، اس وقت وہ پری خانم سے حظ اٹھا رہے تھے۔ ننھی جان، پری خانم کی پروا کیے بغیر ولی عہد بہادر کے قدموں میں گر گئی، ولی عہد بہادر میں چھپا ہوا ننھی جان کا عشق بیدار ہو گیا۔ اسے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا لیکن بخار کی تپش محسوس کرتے ہی بے تابی سے پوچھا: "کیا تم بخار میں مبتلا ہو؟"

ننھی جان نے کوئی جواب نہ دیا، آنکھوں سے آنسو جاری تھے جو رخسار سے بہہ کر سینے پر گر رہے تھے۔ اچانک ولی عہد بہادر کی نظر برہنہ پیروں پر پڑی، گھبرا کر کہا: "ارے تم ننگے پیر ہو، تمھاری جوتیاں کہاں ہیں؟"

ننھی جان نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا: "گھر پر رہ گئیں!"

ولی عہد بہادر کی بے چینی اور حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، پوچھا۔ "اس وقت تم کہاں سے آ رہی ہو؟"

ننھی جان نے جواب دیا: "بلوچ پورہ والے مکان سے!"

"اُفوہ!" ولی عہد نے کہا: "وہ تو یہاں سے میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے!"

ننھی جان نے کوئی جواب نہ دیا۔

پری خانم نے اپنے عریاں جسم کو چادر سے ڈھانپ رکھا تھا اور ننھی جان کو رشک و حسد سے گھور رہی تھی۔ اس وقت ولی عہد کی اُمنگ نے اپنی تسکین کی خاطر ایک دلچسپ مشغلے کا منصوبہ بنایا۔ انھوں نے سوچا، کیوں نہ ان دونوں پری وشوں کو باری باری رشک و حسد کی آگ میں جلایا جائے۔ ولی عہد بہادر نے ننھی جان کے جسم کی چادر اُتار کے ایک طرف رکھ دی اور اس کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر دبانا شروع کیا: "تم بلوچ پورہ سے یہاں تک کس سواری سے آئیں؟"

ننھی جان نے بھرّائی آواز میں جواب دیا: "پیدل! امّاں آنے ہی نہ دیتی تھیں، آخر رات کی تاریکی میں انھیں سوتا چھوڑ کے ننگے پیر نکل کھڑی ہوئی!"

ولی عہد بہادر نے پری خانم کو مخاطب کر کے کہا: "دیکھو عشق اسے کہتے ہیں! بھئی ننھی جان! تم نے تو کمال ہی کر دیا یعنی بوچ پور سے یہاں تک بحالتِ بُخار ننگے پیر پیدل اور تنہا چلی آئیں، عشقِ صادق اسے کہتے ہیں، جنابِ امیر کی قسم ہم تو مان گئے!"

پری خانم بھی ننھی جان سے کم نہ تھی مسہری سے اُٹھی اور کافوری شمع کی طرف جاتی ہوئی بولی: "اگر حضورِ والا کو ہماری کم سخنی کی وجہ سے محبت کا یقین نہیں آتا تو اس کا دوسری طرح بھی ثبوت دیا جا سکتا ہے۔" پھر ولی عہد بہادر کو بطورِ خاص مخاطب کیا: "حضورِ والا! ملاحظہ فرمائیں، کافوری شمع کی آگ اس سے زیادہ تکلیف دہ نہیں، جس نے میرے دل میں مشتعل ہو کر جسم کے گوشت اور ہڈیوں تک کو جلانا شروع کر دیا ہے!"

اس کے بعد پری خانم نے اپنی بائیں ہتھیلی کافوری شمع کی لو پر رکھ دی اور اُف تک نہ کی۔

ولی عہد بہادر نے غیر ارادی طور پر ننھی جان کو خود سے جُدا کرنا چاہا لیکن ننھی جان نے انھیں مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ ولی عہد بہادر نے ننھی جان کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا: "ہمیں چھوڑ دو ننھی جان! آخر تمھیں یہ کیا سوجھی ہے کیا تمھیں یہ نہیں نظر آ رہا کہ اس وقت پری خانم کی جان پر بنی ہوئی ہے!"

ننھی جان نے سسکی بھر کے ولی عہد بہادر کو مضبوطی سے جکڑ لینے کی کوشش کی: "میں نہیں چھوڑوں گی، میں نہیں چھوڑوں گی، میں ہرگز نہ چھوڑوں گی! آپ میرے ہیں، صرف میرے!"

ماحول پری خانم کی جلتی ہوئی چربی اور کھال کی چراند سے بدبودار ہو رہا تھا لیکن پری خانم کے ضبط کا یہ عالم تھا کہ منہ سے اُف تک نہ کر رہی تھی۔

ولی عہد بہادر نے ننھی جان کو دھکیل کر خود کو آزاد کیا اور دوڑ کے پری خانم کا ہاتھ شمع کی لو سے ہٹا دیا۔ پری خانم پر عجیب سا نشہ چھایا ہوا تھا۔ ولی عہد بہادر نے اسے اپنی آغوش میں لے کر پیار کرنا شروع کر دیا۔ بولے۔

"بھئی پری خانم! ہمیں تمھاری محبت کا بھی یقین آ گیا تم نے تو اس وقت کمال ہی کر دیا یعنی یہ عجیب شان ہے ربِ کریم کی کہ ہم خود کو تم دونوں کا عاشقِ وافق سمجھتے تھے لیکن بھید یہ کھلا کہ ہم تم دونوں کے عاشق نہیں معشوق ہیں، اس وقت ہمیں خود پر رشک محسوس ہو رہا ہے اگر اس جگہ حضرت یوسف ہوتے تو وہ بھی ہم پر رشک کرتے!"

پری خانم کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں نے ولی عہد بہادر کے انگرکھے کا وہ حصّہ تر کر دیا جس پر پری خانم کا چہرہ ٹکا ہوا تھا۔ اب ننھی جان کے جلنے کی گھڑی آ گئی تھی، وہ سوگوار چپ چپ کھڑی ان دونوں کو دیکھتی رہی پھر باہر جاتی ہوئی بولی۔

"اچھا جناب! اگر آپ کو میری محبت کا یقین نہیں آتا تو نہ سہی کوئی بات نہیں میں محل سرا کی چھت سے کود کے اپنی جان دے دوں گی اور اللہ نے چاہا تو شہیدِ عشق کہلاؤں گی!"

ولی عہد بہادر نے فوراً پری خانم کو چھوڑ دیا اور دوڑ کر ننھی جان کو پکڑ لیا۔ اسے پری خانم کے قریب لا کر ارشاد فرمایا۔

"ارے بھئی! تم دونوں ہمیں کیوں پریشان کر رہی ہو، ہم یہ کب کہتے ہیں کہ ہمیں تمھاری محبتوں کا یقین نہیں، ہم چاہتے ہیں کہ تم دونوں ہی ہمارے کاشانۂ دل میں رونق افروز رہو!"

پری خانم اور ننھی جان آنسو بہانے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتی رہیں آخر ولی عہد بہادر نے ان دونوں کے حق میں کچھ اس طرح کا فیصلہ سنایا: "پری خانم ولی عہد بہادر کے ساتھ راتیں نہیں گزار سکتیں اس لیے وہ دن میں آ جایا کریں اسی طرح ننھی جان دن میں نہیں رہ سکتیں، رات کو آ جایا کریں" اور یہ ایسا مناسب فیصلہ تھا کہ دونوں ہی نے منظور کر لیا۔

دن میں پری خانم، رات کو ننھی جان ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات بر کے مزے میں شب و روز گزر رہے تھے۔ غلام رضا، قطب علی خاں اور بعض دوسرے سازندے وقتاً فوقتاً ولی عہد بہادر کے لیے جدید جدید جسمانی اور روحانی غذا بہم پہنچاتے رہے۔ بادشاہ سلامت بھی ولی عہد بہادر کی خوش فعلیوں سے بے خبر نہیں تھے لیکن وہ مذہب کی طرف مبالغے کی حد تک رجوع تھے۔ اس لیے ادھر توجہ نہ دے پاتے تھے۔ مرزا اسکندر منہ چھپائے پھر رہے تھے کیونکہ انھوں نے جس طرحدار حسینہ کا ذکر ولی عہد بہادر سے کر دیا تھا، اسے بڑے بھائی سے ملانے میں خدشہ محسوس ہونے لگا تھا لیکن جب ولی عہد بہادر کا اصرار حد سے زیادہ بڑھا تو مجبوراً انھوں نے ایک محفلِ خاص کا اہتمام کیا۔ قصرِ خاقان کو دُلھن کی طرح سجایا گیا۔ طرح طرح کے پھولوں کی خوشبو سے گرد و پیش کی فضا مہک رہی تھی، جا بجا نامور بادشاہوں کی بڑی بڑی تصویریں آویزاں کر دی گئی تھیں، سُرخ بانات کا نفیس ترین فرش بچھا ہوا تھا، جگہ جگہ قدِ آدم آئینے کھڑے کر دیے گئے تھے۔ معزز مہمانوں کے گلوں میں بیش قیمت موتیوں کے ہار پڑے ہوئے تھے اور بازوؤں میں قیمتی نورتن بندھے ہوئے تھے۔ ولی عہد بہادر اپنی پریوں کے جھرمٹ میں بیٹھے مرزا اسکندر اور ان کی محبوبۂ دل نواز کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک مہمانوں کی نظریں ایک طرف اُٹھ گئیں۔ ولی عہد بہادر بھی اُدھر ہی دیکھنے لگے مرزا اسکندر ایک عورت کو ساتھ لیے چلے آ رہے تھے، عورت کا رنگ کندن کی طرح دمک رہا تھا، متکبرانہ ناز و ادا سے دلوں کو کچلتی محفل میں داخل ہوئی، اودے اطلس کا پاجامہ اور اس پر سُرخ رنگ کی ساری کی پشواز پہنے اپنے سازندوں سے ہنسی مذاق کرتی چلی آ رہی تھی۔ ولی عہد بہادر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

جب وہ قریب آ گئی تو وہ ولی عہد بہادر اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور غصّے میں فرمایا: "یہ کیا مذاق ہے!"

مرزا اسکندر آگے بڑھے اور ادب سے عرض کیا: "کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے ہم میں کسی سے؟"

ولی عہد بہادر نے بے زاری سے سوال کیا: "یہ عورت کون ہے؟"

مرزا اسکندر نے جواب دیا: "وزیرن! کیوں؟ کوئی خاص بات؟"

وزیرن کی نظر بھی ولی عہد بہادر پر پڑ گئی وہ کچھ سہم سی گئی۔

ولی عہد بہادر نے گرم ہو کے کہا: "اسے وزیرن کون کہتا ہے؟"

مرزا سکندر نے جواب دیا: "سبھی وزیرن کہتے ہیں، یہ خود بھی اپنے تئیں وزیرن ہی کہلاتی ہے!"

ولی عہد بہادر کا سر گھومنے لگا، دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے بیٹھ گئے، بولے: "مرزا سکندر! کیا یہی تمھاری وہ بے مثل محبوبہ ہے جس سے تم ہمیں ملانا چاہتے تھے؟"

مرزا سکندر نے جواب دیا: "جی ہاں، یہی وہ دُرِ بے بہا ہے جس کا ہم نے آپ سے ذکر کیا تھا!"

ولی عہد بہادر نے شکستہ آواز میں پوچھا: "تم اسے کب سے جانتے ہو؟"

مرزا سکندر نے جواب دیا: "تقریباً ایک سال سے!"

"اس نے کبھی تم پر اظہارِ عشق کیا؟"

"بارہا!" مرزا سکندر نے جواب دیا: "نہ صرف زبانی بلکہ تحریری بھی، ہمارے پاس اس کے بہت سارے محبت نامے موجود ہیں لیکن آپ یہ سارے سوالات کیوں کر رہے ہیں؟"

ولی عہد بہادر کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، بولے: "مرزا سکندر! اس کا نام وزیرن نہیں ننھی جان ہے اور یہ گزشتہ کئی ماہ سے ہم سے بھی اظہارِ عشق کر رہی ہے، اس کے ہمارے پاس بھی خطوط موجود ہیں!"

مرزا سکندر نے کہا: "پھر یہ تو بڑی مشکل ہوئی، ہم دونوں اس بات کا فیصلہ کس طرح کریں کہ اسے کس کے پاس رہنا چاہیے!"

مرزا سکندر یہ کہہ کر جانے لگے لیکن ولی عہد بہادر نے انھیں روک لیا، بولے۔ "ایسی باتیں ابھی نہ کی جائیں تو اچھا ہے، وزیرن تمھارے آنے جانے کا جائزہ لے رہی ہے!"

مرزا سکندر نے کہا: "ہم اس کے بارے میں خاصے پریشان ہو گئے ہیں!"

مرزا سکندر کو اس سے عشق تھا اور اس انکشاف نے انھیں فکرمند کر دیا، ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بڑے بھائی اور ولی عہد بہادر کی محبوبہ سے بدستور تعلقات قائم رکھیں۔

ولی عہد بہادر نے شاید اس محفل کو درہم برہم کر دیتے لیکن بہت سارے معززین اور حاضرینِ محفل کی موجودگی میں وہ ایسا پُرجوش اور سبک قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ انھیں وہ ننھی جان یاد آ رہی تھی جس نے بلوچ پورے سے محل سرا تک میل ڈیڑھ میل کا فاصلہ ننگے پاؤں پیدل بحالتِ نجارطے کیا تھا جس نے اپنی ماں کے مقابل ولی عہد بہادر کو ترجیح دی تھی۔ انھیں یقین نہ آتا تھا کہ اس نے مرزا سکندر سے کس طرح عشق لڑایا۔ انھیں خیال گزرا شاید مرزا سکندر تفریحی میں ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ انھوں نے مرزا سکندر سے پوچھا: "اس کے محبت نامے کہاں ہیں؟"

"یہیں خاقان محل میں!" مرزا سکندر نے جواب دیا۔

"کیا ہم انھیں ملاحظہ کر سکتے ہیں؟"

"بشوق، جب بھی مزاجِ عالی ادھر راغب ہو!"

"ہم انھیں اسی وقت دیکھنا چاہتے ہیں!"

مرزا سکندر نے پوچھا: "یہیں اسی جگہ یا اندر کسی اور جگہ؟"

ولی عہد بہادر نے جواب دیا: "اندر، ہم دردِ سر کا بہانا کر کے اندر چلتے ہیں حاضرینِ مجلس اسی طرح اپنی اپنی جگہوں پر موجود رہیں اور خدامِ محفل کو حکم دیا جائے کہ ننھی جان اور اس کے سازندے یہیں موجود رہیں اپنی جگہ سے ہلنے بھی نہ پائیں!"

ولی عہد بہادر کے احکام کی فی الفور تعمیل ہوئی۔ ننھی جان کا ماتھا پہلے ہی ٹھنکا تھا لیکن بڑے حوصلے کی عورت تھی، نہایت تسکین سے ولی عہد بہادر اور مرزا سکندر کی سرگوشیاں برداشت کرتی رہی۔

مرزا سکندر نے ولی عہد بہادر کو اندر لے جا کے وزیرن کے محبت نامے ان کے سامنے رکھ دیے، ولی عہد بہادر انھیں اُلٹ پلٹ کے کہیں کہیں سے ملاحظہ فرماتے رہے۔ اس وقت ان کا عجیب عالم تھا۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا جب وہ خطوط کے ملاحظے سے فارغ ہو چکے تو مرزا سکندر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر بڑے بھائی کو کسی فکر میں ڈوبا دیکھ کر بس منہ کھول کے رہ گئے۔ کچھ دیر بعد ولی عہد بہادر ہوش میں آئے اور مرزا سکندر سے غمزدہ آواز میں پوچھا: "کیا تمھیں ننھی جان سے عشق ہے؟"

مرزا سکندر نے آہستہ سے جواب دیا: "جی ہاں، ہم اس پر بڑی دولت قربان کر چکے ہیں اور اس کا خیال دل سے نہیں نکلتا۔"

ولی عہد بہادر نے آہستہ سے کہا: "اچھا تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے!"

پھر خاموشی طاری ہو گئی، اس سے ترکِ تعلق پر دونوں میں سے ایک بھی آمادہ نہ تھا۔

مرزا سکندر نے کہا: "اب ہمیں باہر محفل میں پہنچ جانا چاہیے، حاضرین بے کیفی کے شکار ہو رہے ہوں گے!"

ولی عہد بہادر نے جواب دیا: "لیکن ہم اس وقت تک وہاں نہیں جائیں گے جب تک ننھی جان کی بابت ہم دونوں میں کوئی تصفیہ نہیں ہو جاتا!"

"بہتر ہے!" مرزا سکندر نے آہستہ سے کہا۔

ولی عہد بہادر نے سوال کیا: "ننھی جان کی محبت کے بارے میں تمھارا اپنا کیا خیال ہے؟ کیا تمھیں یقین ہے کہ وہ بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنا تم اسے چاہتے ہو؟"

مرزا سکندر نے جواب دیا: "اس نے پیار محبت کی باتوں اور محبت ناموں میں جس شدید محبت کا اظہار کیا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیں بے حد چاہتی ہے!"

ولی عہد بہادر نے کہا: "اسے چاہتے تو ہم بھی ہیں اور وہ ہم سے بھی اتنی ہی شدید محبت کا اظہار کرتی رہی ہے اس الجھن کے معاملے میں ہم نے ایک تجویز سوچی ہے ہمارا خیال ہے کہ اس معاملے میں قرعہ اندازی سے کام لیا جائے۔ ننھی جان جس کو مل جائے وہ اپنے تئیں خوش قسمت تصور کرے!"

مرزا سکندر نے پوچھا: "یہ قرعہ اندازی کس طرح ہوگی؟"

ولی عہد بہادر نے جواب دیا: "ہم دونوں ہی محفل میں واپس چلتے ہیں، وہاں شرفا اور معززین کی کثیر تعداد موجود ہے، یہ قرعہ اندازی ان سب کے سامنے ہوگی۔ تم ننھی جان سے مل کر ہمارے اس فیصلے سے اسے مطلع کر دو، اس سے اشارتاً کہہ دو کہ اب یہ دوغلا کھیل نہیں چلے گا، تمھیں ان شرفا کی موجودگی میں اپنا آخری فیصلہ سنا دینا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

پڑے گا وہ رقص کے دوران آگے بڑھ کر ہم دونوں میں سے جس کا بھی ہاتھ پکڑ لے گی ننھی جان اس کی محبوبہ سمجھی جائے گی!"

مرزا اسکندر نے مجوزہ منصوبے میں ذرا سی ترمیم کی کہا "ہمارے خیال میں اس کا ہم دونوں میں سے کسی کا ہاتھ پکڑ لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اسے واشگاف لفظوں میں ہاتھ پکڑ کے یہ اعلان بھی کر دینا چاہیے کہ اس کا دوسرے اُمیدوار سے کوئی تعلق نہیں!"

ولی عہد بہادر نے کہا "تم بھی صحیح کہتے ہو، ہمیں یہ ترمیم منظور ہے!"

مرزا اسکندر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "اچھا پھر بسم اللہ چلیے باہر چلتے ہیں"

ولی عہد بہادر اُٹھ کھڑے ہوئے کہا "چلو، چلتے ہیں!"

جب یہ دونوں دوبارہ محفل میں داخل ہوئے تو حاضرین اور خواتین کی نظریں ان دونوں کے فکر مند چہروں پر گڑ گئیں۔

بالکل خلافِ توقع مرزا اسکندر نے وہ بات جو ننھی جان کے کان میں کہنی تھی، باآوازِ بلند خبر کا محفل کے گوش گزار کر دی۔ اُنھوں نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "حاضرینِ محفل و جانانِ محفل! یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ بی وزیرن جو اس وقت جانِ محفل ہیں ایسی شے قرار پا گئی ہیں جنھیں ہم اور ولی عہد بہادر یکساں چاہتے ہیں، اخلاقاً یہ بات بہت معیوب ہے اس لیے ہم دونوں نہایت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وزیرن سے تعلق ایک ہی بھائی کو رکھنا چاہیے اور یہ طے پایا کہ اس کا فیصلہ خود وزیرن کریں گی کہ انھیں کس کے پاس رہنا ہے ہمارے پاس یا ولی عہد بہادر کے پاس، وہ اپنا یہ فیصلہ اس طرح سنائیں گی کہ وہ جس کا انتخاب کریں گی اس فیصلے کے بعد دوسرا فریق وزیرن سے دستبردار ہو جائے گا!"

حاضرینِ محفل نے جوش و خروش میں تالیاں بجائیں اور وزیرن نے رقص کی تیاری شروع کر دی۔

مرزا اسکندر اپنے بڑے بھائی ولی عہد بہادر کے پاس ہی آ بیٹھے۔

ننھی جان نے رقص شروع کیا رقص کے آغاز میں تو وہ کچھ بجھی بجھی اداس اداس رہی لیکن پھر بتدریج انہماک اور جوش بڑھتا چلا گیا۔ اور وہ موسیقی کی طرح مست اور بے خود ہو کر اپنے فن میں کھو گئی حاضرین اور خواتین خوشی میں اچھل اچھل پڑتے کبھی وہ تھرکتی بل کھاتی مرزا اسکندر کی طرف جاتی اور ولی عہد بہادر کا دل کسی اندیشے سے زور زور سے دھڑکنے لگتا اور مرزا اسکندر کا چہرہ کسی اندرونی خوشی سے دمکنے لگتا اور جب ننھی جان مرزا اسکندر کے سامنے سے یوں ہی گزر جاتی تو وہ ایک دم کھو جاتا اہلِ محفل تجسس میں اپنی سانسیں روکے فیصلے کے منتظر تھے ننھی جان بھی ان کے تجسس اور مرزا اسکندر اور ولی عہد بہادر کی امید و بیم کی کیفیت سے خوب لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اسی طرح ایک بار ناچتی ہوئی وہ ولی عہد بہادر کے قریب پہنچ گئی اور دو زانو بیٹھ کے ناگن کی طرح یوں جھومی کہ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ ولی عہد بہادر کا ہاتھ پکڑنے ہی والی ہے لیکن یکایک وہ کھڑی ہو کر تھرکتی ہوئی دور چلی گئی ہجوم خوشی سے جھومنے لگا اور ایک عجیب سا شور بلند ہوا مرد اور خواتین آپس میں شرطیں لگا رہے تھے کچھ کہتے وہ مرزا اسکندر کا ہاتھ پکڑے گی اور کچھ کو یقین تھا وہ ولی عہد بہادر کا انتخاب کرے گی اور خود دونوں کا یہ حال تھا کہ کسی کو بھی اپنی ذات پر اعتماد نہ رہا تھا۔

جب لوگ ننھی جان کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے تو انھیں یہ شبہ ہو چلا کہ ننھی جان اتنی بے وقوف نہیں ہے کہ ان دونوں میں سے ایک کو دوست اور دوسرے کو دشمن بنا لے وہ یہ اعلان سننا چاہتے تھے کہ ننھی جان رقص سے فارغ ہو کر اپنا یہ فیصلہ سنا دے گی کہ "افسوس وہ دونوں ہی کو پسند کرتی ہے اور کسی ایک کے حق میں فیصلہ نہیں دے سکتی!"

پلک جھپکتے میں اہلِ محفل نے دیکھا کہ اس نے ولی عہد بہادر کا ہاتھ پکڑ لیا ہے اور باآوازِ بلند حاضرین کو اپنا فیصلہ سنا رہی ہے "میرے مطلوب اور محبوب ولی عہد بہادر ہیں اور میں مرزا اسکندر نام کے کسی مرد سے واقف تک نہیں!"

پورا مجمع قہقہہ مار کے ہنس دیا۔ مرزا اسکندر غصے میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور غصے، محبت اور بے بسی کی ملی جلی کیفیات میں ننھی جان کی طرف دیکھا اور کچھ کہے سُنے بغیر کسی مست شرابی کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے محفل سے چلے گئے۔ ولی عہد بہادر کے مصاحبین اور خوشامدین نے ناچنا شروع کر دیا لیکن ولی عہد بہادر نے یہ کہہ کر محفل برخاست کر دی کہ "اب چونکہ معرکہ سر کیا جا چکا ہے اس لیے محفل برخاست کی جاتی ہے!"

ولی عہد بہادر ننھی جان کو ہمراہ لے کر اپنے پری خانے میں چلے گئے۔

علی نقی خاں جو ولی عہد بہادر کے چچا بھی تھے اور خسر بھی، انھوں نے حضور باغ کی تزئین و آرائش خود اپنی نگرانی میں کرائی تھی حضور باغ میں ولی عہد بہادر کا انتظار کر رہے تھے علی نقی نے ننھی جان کے معرکے میں سُرخ روئی کا حال سن کر ولی عہد بہادر کو مبارک باد دی، ان کی چاند پر بال بہت کم تھے۔ ولی عہد بہادر نے علی نقی کی مبارک باد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "نواب صاحب! آپ کے سر پہ بال بہت کم ہیں، ایسا کیوں ہے؟"

سب رنگ کی
مقبول ترین تاریخی کہانیاں لکھنے والے
الیاس سیتاپوری
کی تاریخی تصنیف
بنو اُمیّہ اور بنو عبّاس
کے عہد کی ناقابلِ فراموش
کشمکش
ایک مکمل ناول کی صورت میں
زیرِ طبع

نواب علی نقی نے جواب دیا: "حضور والا کا علم اس ناچیز سے فزوں تر ہے اس کا سبب حضور خود ہی ارشاد فرمادیں!"

ولی عہد بہادر نے کہا: "ہم نے تو یہ سُنا ہے کہ ایسے لوگ بڑی ترقی کرتے ہیں اور عہدۂ وزارت تک پہنچ جاتے ہیں!"

نواب علی نقی نے کہا: "حضور کے تصدق میں ایسا بھی ہوسکتا ہے غلام مایوس نہیں ہے!"

ولی عہد بہادر نے وعدہ کیا: "ہم اودھ کا تاج و تخت سنبھالتے ہی اگر جنابِ امیر نے چاہا تو آپ کو وزیر بنادیں گے!"

نواب علی نقی نے اس کا پیشگی شکریہ ادا کیا۔

کچھ عرصے کے بعد ولی عہد بہادر کو مطلع کیا گیا کہ بادشاہ کی حالت خراب ہوتی جارہی ہے اور وہ شاید چند دن کے مہمان ہیں۔

ایک دن طلوعِ آفتاب سے پہلے ریزیڈنٹ کا سپاہی آیا اور اس نے بادشاہ کی موت کی خبر سناتے ہوئے کہا: "صاحب نے فرمایا ہے کہ آپ جس حال میں بھی ہوں فوراً تشریف لے آئیں!"

بادشاہ کی موت نے کہرام برپا کردیا ہر طرف سے نالہ و بین کی آوازیں آنے لگیں، ولی عہد بہادر بھی رونے لگے اور اسی حالت میں نقرئی ہودے پر سوار ہوکے گلستانِ ارم پہنچ گئے زمانہ ساز مصاحبین نے ہودے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ انگریز ریزیڈنٹ انھیں اسی وقت گلستانِ ارم کی بالائی منزل پر لے گیا جہاں ولی عہد بہادر کی رسمِ تاج پوشی ادا ہونا تھی۔ مجتہد العصر والزماں نے ولی عہد بہادر کے سر پر تاج رکھا اور ولی عہد بہادر نے تخت پر قدم رکھے، حاضرین ارکان سلطنت اور عمائدین مملکت نے نذریں گزاریں اور مبارکبادیں پیش کیں اور خوشی کی توپیں چھوڑی گئیں، ولی عہد بہادر تھوڑی دیر تک تخت ہی پر تشریف فرما رہے اس کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب ولی عہد بہادر بادشاہ ہو چکے تھے اور ابوالمظفر ناصر الدین سکندر جاہ بادشاہ عادل قیصر زماں سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ کے لقب سے اپنی حکمرانی کا آغاز کیا۔ بادشاہ شاعر بھی تھے اور اختر تخلص کرتے تھے۔ لوگ انھیں پیار سے جانِ عالم بھی کہتے تھے۔

گلستانِ ارم میں بادشاہ کا یہ پہلا منحوس دن تھا کہ وہ اپنی عورتوں سے نہیں مل سکتے تھے، طبیعت اتنی کمزور تھی کہ باپ کی یاد میں آنسو بہے چلے جارہے تھے ملنے والے اور مصاحبین صبر کی تلقین کرتے لیکن کہیں محض تلقین کردینے سے کسی شخص کو صبر آیا ہے پھر جانِ عالم پیا کو کس طرح آجاتا۔

جانِ عالم کی خدمت میں انگریز ریزیڈنٹ وزیر امین الدولہ کے ساتھ پہنچا اور واجد علی شاہ سے دریافت کیا: "آپ وزارت کے منصب پر کسے فائز کرنا پسند فرمائیں گے؟"

بادشاہ نے ریزیڈنٹ سے دو قدم پیچھے کھڑے ہوئے امین الدولہ کی طرف دیکھا اور کہا: "کیا امین الدولہ بہادر وزارت کے منصب سے خوش نہیں ہیں، ہمارے خیال میں امین الدولہ بہادر ہی کے ہاتھ میں انتظام وزارت رہنا بہتر ہے!"

امین الدولہ نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور کہا: "شکریہ حضور والا! لیکن ہماری گزارش پر بھی تو غور فرمائیے یہ ہمارا ذاتی تجربہ بھی ہے اور علم بھی کہ باپ کے زمانے کا ملازم بیٹے کے دور میں زیادہ سود مند نہیں ثابت ہوتا اسی لیے خاکسار یہ چاہتا ہے کہ اس سے یہ منصب لے لیا جائے اور ناچیز سبکدوش کردیا جائے!"

واجد علی شاہ یہ منصب دل سے نواب علی نقی کو مرحمت فرمانا چاہتے تھے اور اس کا وعدہ بھی کرچکے تھے لیکن جب انھوں نے ریزیڈنٹ کا جھکاؤ امین الدولہ کی طرف دیکھا تو پیچھے ہٹ گئے اور کہا: "نہیں جناب! ہم آپ کی یہ بات نہیں مانیں گے، آپ بدستور منصبِ وزارت پر فائز رہیں گے آپ فکر نہ کریں!"

واجد علی شاہ نے دورانِ ولی عہد بہادری اس نوع کی مشقت کبھی بھی نہ جھیلی تھی ان کی بیگمات اور خواتین ان سے دور تھیں اور بادشاہ ان کی کمی اتنی شدت سے محسوس کررہے تھے کہ لفظوں میں اس کا اظہار نہ کرسکتے تھے، بادشاہ رسوم تاج پوشی اور تخت نشینی سے اتنے تھک گئے کہ فوراً گلستانِ ارم کی بارہ دری کے پیچھے والی عمارت میں آرام کرنے کی غرض سے چلے گئے۔ بیگمات کی عدم موجودگی میں رات کا گزرنا چونکہ بہت دشوار تھا اس لیے واجد علی شاہ نے معتمد علی خاں کو اپنی بیگمات اور پریوں کے پاس اس غرض سے روانہ کردیا کہ وہ ان سب سے ایک ایک انگوٹھی لے آئیں، بادشاہ کے حکم کی پوری پوری تعمیل ہوئی۔

وہ کافی رات تک مسہری پر پڑے کروٹیں بدلتے رہے نیند کوسوں دور تھی، اس وقت انھیں نھی جان یاد آرہی تھی، پری خانم کی یاد ستارہی تھی، دوسری عورتیں یاد آرہی تھیں، آخر انھوں نے اپنی بیگمات اور پریوں کی انگوٹھیوں کا ہار بنوایا اور اسے گلے میں ڈال کر مسہری پر دراز ہوگئے، سینے پر انگوٹھیوں کے ہار نے انھیں ایک عجیب سی لذت بخشی اور وہ ذرا دیر بعد سو گئے۔

دوسرے دن بادشاہ نے اپنے مصاحبین اور کارگزاران مملکت کو خطابات عطا فرمائے، غلام رضا خان اور قطب علی خاں ستار نواز بھی خطابات سے محروم نہ رہے، غلام رضا خاں کو خطاب ملا "رضی الدولہ مرضی الملک غلام رضا خاں بہادر نبرد جنگ" قطب علی خاں کو غلام یداللہ خاں قطب الدولہ مفتاح الملک موفق دل پذیر کا خطاب ملا۔

بادشاہ نے بیگمات اور پریوں کو بھی نت نئے خطابات سے سرفراز کیا۔ تخت نشینی کے بعد جو سب سے بڑی مصیبت پیش آئی وہ یہ تھی کہ بادشاہ کو ان عورتوں سے آزادانہ ملنے اور لطف اندوز ہونے میں دشواریاں پیش آنے لگیں جو عورتیں ولی عہد بہادر کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہ سکتی تھیں اب وہ پردے میں بٹھا دی گئی تھیں اور جس جگہ وہ پردے میں رہ رہی تھیں وہ گلستانِ ارم سے دور تھی نہ بادشاہ ان کے پاس پہنچ سکتے تھے اور نہ عورتیں ان کے پاس آسکتی تھیں۔

واجد علی شاہ کو تخت نشین ہوئے دو ماہ گزر چکے تھے ضبط واحتیاط اور مرتبے کے پاس کی وجہ سے محلات اور بیگمات سے دور رہ رہے تھے جب ان کی مفارقت ناقابلِ برداشت ہوگئی تو بادشاہ کو خفقان رہنے لگا۔ انھوں نے دل لگی کے لیے سولہ طوائفیں رکھ لیں، یہ ناچ گانے میں یکتا تھیں ان میں دو بادشاہ کو بہت پسند آئیں ان میں سے ایک کا نام چھوٹن تھا، اور دوسری کا نام حسن باندی، واجد علی شاہ جانِ عالم ان دونوں پر اتنے وارفتہ و شیدا ہوئے کہ چھوٹن کو معشوق السلطان خسرو بیگم اور حسن باندی کو ممتاز عالم عاشق السلطان قیصر بیگم کے خطاب سے سرفراز کیا اور ہر ایک کا دو دو ہزار

روپے ماہانہ مقرر ہوا۔ ان دنوں میں جانِ عالم واجد علی شاہ کو قیصر بیگم سے والہانہ عشق ہوا تھا، ایک ساتھ کھانا، ایک ہی جگہ سونا، ایک ساتھ اُٹھنا، گھنٹوں آمنے سامنے بیٹھ کر پیار و محبت کی باتیں کرنا، غرضیکہ قیصر بیگم کی جدائی ایک لمحے کو بھی گوارا نہ تھی۔

اس دوران پری خانم اور ننھی جان کی طرف سے بادشاہ کو یکے بعد دیگرے یہ پیغام موصول ہوئے کہ اگر بادشاہ نے انھیں کچھ دن اور محروم اور مایوس رکھا تو وہ کسی دن موقع پاکے بادشاہ کی بگھی کے نیچے کچل کر اپنی جان دے دیں گی۔ بادشاہ نے انھیں تسلی آمیز جواب بھیج دیا کہ کچھ دن صبر کرو، ملاقات اور ایک ساتھ اقامت کی کوئی نہ کوئی صورت بہت جلد پیدا کی جائے گی۔

غلام رضا خاں اور قطب علی خاں اب بھی بادشاہ کے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ چھوٹے بھائی مرزا سکندر اپنی زبان سے تو کچھ نہ کہتے لیکن نظریں چرائے رہتے جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ ان کے دل کا زخم ابھی تک ہرا ہے۔

امین الدولہ منصبِ وزارت پہ فائز تھے اور انھیں ریزیڈنٹ بہادر کی تائید بھی حاصل تھی لیکن واجد علی شاہ یہ منصب علی نقی خاں کو سونپنا چاہتے تھے۔ اسی دوران بادشاہ کو یہ افسوسناک خبر موصول ہوئی کہ حضور باغ اور پری خانے کی محلات اور بیگمات پردے سے باہر نکلنے پر مصر ہیں اور ناچ گانے کی اجازت طلب کر رہی ہیں۔ بادشاہ انھیں یہ اجازت کس طرح دے سکتے تھے، اب وہ ولی عہد بہادر کے بجائے ایک بادشاہ کی عزت آبرو تھیں۔ بادشاہ نے انھیں ایسا کرنے سے سختی سے منع کیا لیکن معلوم ہوا کہ وہ سرکشی پر مائل ہیں۔

بادشاہ نے عصر سے پہلے بگھی تیار کرائی، ساتھ قیصر بیگم کو بٹھایا اور حضور باغ روانہ ہوگئے۔ بیگمات اور محلات نے بادشاہ کا سرد مہری سے استقبال کیا۔ ان میں اکثر منہ سجائے ہوئے تھیں اور بادشاہ سے بات تک نہیں کرنا چاہتی تھیں، قیصر بیگم کو ساتھ دیکھ کر حسد اور رقابت کا اظہار کیا۔

یہیں ننھی جان اور پری خانم سے بھی ملاقات ہوئی۔ ننھی جان نے شکوتاً کہا: "جانِ عالم! کیا بندی نے اس دن کے لیے اہلِ دنیا سے منہ موڑا تھا کہ حضور نے بھی آنکھیں پھیر لیں!"

بادشاہ نے کہا: "ننھی جان! تم معاملہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ اب ہم بادشاہ ہیں، تم گھبراؤ نہیں ہم تمھیں بہت جلد اپنے پاس بلا لیں گے!"

ننھی جان نے بے زاری اور غصے سے کہا: "بس حضور والا! اب میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتی، ایک نظر آپ کو دیکھ لینے کی خواہش رکھتی تھی سو پوری ہوگئی۔ بندی تو زندگی سے موڑ کے چلی عالمِ بالا کی طرف!"

یہ کہا اور ہیرے کی کنی منہ میں رکھ لی۔ بادشاہ نے لپک کے منہ دبا دیا اور بروقت تمام ہیرے کی کنی نکال لینے میں کامیاب ہوگئے۔ بے اختیار فرطِ جوش میں ننھی جان کو آغوش میں لے کر پیار کرنے لگے۔ فرمایا: "ہمیں تو تمھاری بے لوث محبت کا پہلے ہی سے یقین ہے، تم ذرا بھی فکر نہ کرو، چند دنوں کی بات ہے ہم تمھیں عنقریب بلا لیں گے اپنے پاس!"

ننھی جان، بادشاہ کے سینے پر سر رکھ کر آنسو بہانے لگی، پری خانم ذرا دور کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی منہ پر تو کچھ بھی نہ بولی لیکن چہرے سے اندرونی جذباتی کشمکش صاف ظاہر ہو رہی تھی، وہ کچھ دیر اسی طرح کھڑی دیکھتی رہی پھر منہ کو آنچل سے چھپا کے ایک طرف چلی گئی۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ بادشاہ ننھی جان کی دلجوئی میں ایسے لگے کہ پری خانم کا خیال ہی نہ رہا۔

کافی دیر بعد شام کے جھٹپٹے میں جب بادشاہ قیصر بیگم کے ساتھ حضور باغ سے گلستانِ ارم واپس ہوئے تو راستے میں ایک جگہ کوچوان نے گھوڑوں کی راسیں ایک دم اس طرح کھینچیں کہ چار گھوڑوں میں دو اگلے گھوڑے گرتے گرتے بچے اور پچھلے دونوں گھوڑے اپنی اگلی دونوں ٹانگوں پر رکوع میں چلے گئے۔ بادشاہ "یا اللہ خیر یا اللہ خیر" کہتے ہوئے قیصر بیگم کی گود میں گر گئے اور قیصر بیگم بادشاہ کے بوجھ میں دب سی گئیں۔

کوچوان نیچے اتر چکا تھا وہ ایک عورت کو پکڑ کے بادشاہ کے پردے کے پاس لے آیا اور بآوازِ بلند عرض کیا۔

"بندہ پرور! یہ ایک عورت ہے معلوم نہیں کیوں بگھی کے نیچے کچل کر جان دے دینا چاہتی تھی لیکن غلام نے اسے بچا لیا!"

بادشاہ نے سنبھل کر پردے کو ذرا ہٹا کر دیکھا کو حیران، پری خانم کو لیے کھڑا ہے! بادشاہ نے بے ساختہ کہا: "ارے پری خانم یہ تم!"

پری خانم نے بھرائی آواز میں کہا: "حضور! مجھے اپنی گاڑی کے نیچے کچل جانے دیں بس یہی میری آخری تمنا ہے!"

بادشاہ سرِ راہ تو باتیں کر نہیں سکتے تھے، پری خانم کو بھی اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ محل میں پہنچ کے انھوں نے پری خانم کو روبرو بٹھا کے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ قیصر بیگم کو پری خانم سے حسد پیدا ہو گیا۔

بادشاہ نے پوچھا: "پری خانم! تم نے ایسا کیوں کیا؟"

پری خانم نے روتے ہوئے جواب دیا: "میں نے حضور کی خاطر شوہر سے طلاق حاصل کی اور حضور ہی نے مجھے نظرانداز کر دیا۔ بندی تو بادشاہ کے عشق میں دیوانی ہوئی جا رہی ہے اور بادشاہ سلامت چرب زبان ہرجائیوں کے عشقِ کاذب پر صداقت کا گمان کر رہے ہیں۔ ایک ایسی عورت جو بادشاہ کے چھوٹے بھائی سے بھی عشق کرے اور بادشاہ سلامت کو بھی چاہے کس طرح اپنی محبت کے دعوے میں سچی ہو سکتی ہے؟"

بادشاہ نے کہا: "ہمیں تمھاری محبت کا ہمیشہ یقین رہا۔ تم نے یہ کس طرح سمجھ لیا کہ ہم تمھیں نظرانداز کر رہے ہیں؟"

پری خانم نے کہا: "جب ننھی جان اداکاری کر رہی تھی، بندی بھی وہیں موجود تھی، بادشاہ سلامت اس کی تو دلجوئی فرماتے رہے اور بندی کے لیے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ارشاد نہ فرمایا!"

بادشاہ نے موم ہو کے کہا: "اچھا اب تم یہیں ہمارے ساتھ رہو گی۔ اب خوش ہو جاؤ!"

پری خانم فرطِ خوشی میں بادشاہ سے چمٹ گئی اور بوسوں کی بھرمار کر دی!

دن عیش و آرام میں گزر رہے تھے، ناچ دیکھنا، گانا سننا، دل پسند عورتوں سے اختلاط اور ان کی دل جوئی کرنا، خالی اوقات میں شاعری کرنا یا کچھ اور لکھنا بادشاہ کے یہی مشاغل تھے لیکن ایک دن بادشاہ کو ایسی افسوسناک خبر سننے کو ملی کہ ان کی سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی ساری صلاحیتیں بیکار ہو گئیں۔

چند آدمیوں نے گولہ گنج سے آ کے بادشاہ کو خبر دی کہ "وزیر امین الدولہ جب اپنی بگھی پر گولہ گنج سے گزر رہے تھے تو دن دہاڑے بیچ سڑک پر چار پانچ بدمعاشوں نے انھیں روک لیا اور بگھی سے نیچے اتار کے سڑک پر گرا دیا۔ اب وہ کہتے ہیں کہ اگر بادشاہ کو اپنے وزیر کی جان عزیز ہے تو وہ اس کے عوض پچھتر ہزار روپے روانہ فرما دیں وزیر کو چھوڑ دیا جائے گا ورنہ اسی وقت قتل کر دیا جائے گا!"

بادشاہ نے ہولتے ہوئے کہا "غضب خدا کا، یہ اندھیر، دن دہاڑے وزیر مملکتِ اودھ کو بیچ سڑک پر یوں بے دست و پا کر کے پچھتر ہزار روپے طلب کیے جائیں! بھئی کمال ہو گیا۔ شہر کوتوال کہاں ہیں؟"

خبر لانے والوں میں سے ایک نے جواب دیا "حضور وہ اپنے گھر میں ہوں گے۔"

بادشاہ نے کہا "کسی نے انھیں بھی مطلع کیا؟"

جواب ملا "انھیں مطلع کرنے میں ڈر ہے کہ وزیر کو قتل کر دیا جائے گا کیونکہ بدمعاش کوتوال کی مداخلت ہرگز پسند نہ کریں گے!"

بادشاہ نے وحشت زدہ لہجے میں کہا "پھر ہم کیا کر سکتے ہیں، جب شہر کوتوال کچھ نہیں کر سکتا تو پھر تم لوگ بتاؤ کہ ہم کیا کریں؟"

جواب دیا گیا "پچھتر ہزار روپے دے کر وزیر کو رہا کرا لیا جائے!"

"واہ یہ کیا بات ہوئی!" بادشاہ نے کہا "گویا پچھتر ہزار روپے کوئی چیز ہی نہ ہوئے"

ابھی کیفیت گو جاری ہی تھی کہ خدام نے مطلع کیا "ریزیڈنٹ بہادر اذنِ باریابی کے طلب گار ہیں!"

بادشاہ نے خوش ہو کے کہا "بخدا بڑے اچھے موقع سے آئے، انھیں فوراً ہمارے پاس لاؤ، خرد مندی میں ان افرنگیوں کا کوئی جواب نہیں، ہمیں اطمینان ہے کہ ریزیڈنٹ بہادر کوئی نہ کوئی تدبیر وزیر کی رہائی کی نکال لیں گے!"

ریزیڈنٹ بہادر، بادشاہ کے سامنے آئے تو بادشاہ نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور انھیں اپنے قریب بلا لیا۔ بادشاہ اس وقت کسی اور موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے تھے فوراً مضطرب لہجے میں وزیر کی یرغمالیت کا ذکر کیا۔ ریزیڈنٹ بہادر نہایت توجہ سے بادشاہ کی باتیں سنتے رہے پھر فرمایا "میں خود بھی اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں اور بادشاہ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں!"

بادشاہ نے حیرت سے پوچھا "اچھا یعنی آپ کو بھی اس منحوس واقعے کی خبر ہو چکی ہے۔ واللہ کمال ہے معجزہ ہے پھر جناب نے وزیر کی مخلصی کی بابت کیا سوچا؟"

ریزیڈنٹ نے جواب دیا "میں نے وزیر کی رہائی کے سلسلے میں بدمعاشوں کو پچھتر ہزار روپے روانہ کر دیے ہیں اور تھوڑی دیر بعد امین الدولہ یہاں حاضر ہونے والے ہیں!"

بادشاہ نے حیرت سے کہا "یعنی پچھتر ہزار روپے آپ نے بدمعاشوں کو بھجوا دیے؟"

ریزیڈنٹ نے جواب دیا "اس کے علاوہ دوسری کوئی صورت نہ تھی وزیر کی مخلصی کی!"

بادشاہ نے افسوس سے کہا "یعنی جناب یہ تو حد ہو گئی بدمعاشی کی۔ واللہ ایسا تو کبھی بھی نہ ہوا تھا۔ یہ شہر کوتوال کیسا نااہل انسان ہے کہ اس کے عہد میں بدمعاش ایسے شتر بے مہار بنے دندناتے پھر رہے ہیں، ہمارا خیال ہے اسے معزول کر کے اس کی جگہ کسی لائق شخص کو اس منصب پر فائز کر دیا جائے!"

ریزیڈنٹ نے سرد مہری سے کہا "یہ آپ کا مسئلہ ہے میں کوئی مشورہ نہ دوں گا، میں تو حضور والا سے یہ کہنے آیا ہوں کہ مجھے گورنر جنرل نے کمپنی کی طرف سے یہ حکم دیا ہے کہ آپ کو اُس معاہدے کی یاد دلاؤں جس میں آپ کے جدِ اعلا نواب سعادت علی خاں نے کمپنی بہادر سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اودھ میں نظم و نسق کے ایسے قواعد جاری کریں گے جو ان کی رعایا کی خوشحالی اور باشندگان کی سلامتیِ جان و مال کے موجب ہوں گے۔ کمپنی کے ریزیڈنٹ اور گورنر جنرل صاحبان اودھ کے ہر فرماں روا کو بوقت تخت نشینی اس معاہدے کی یاد دہانی کراتے رہے ہیں، اس وقت میں بھی اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں!"

کچھ دیر بعد وزیر امین الدولہ بھی تشریف لے آئے۔ بادشاہ نے ان پر لاپرواہی اور بے احتیاطی کا الزام لگایا کہا۔

"آپ اس حکومت کے وزیر ہیں اور یہاں کے حسنِ انتظام کا یہ عالم ہے کہ بدمعاشوں نے دن دہاڑے آپ ہی کو یرغمال بنا کے پچھتر ہزار روپے وصول کر لیے۔ بھئی کمال ہے کسی حکومت میں بھی نہ تو ایسا ہوا نہ سنا گیا؟"

ریزیڈنٹ نے بے مروتی سے کہا "حضور والا! اس بدانتظامی میں وزیر کے ساتھ ہی حضور کی لاپرواہی کا بھی ہاتھ ہے!"

ریزیڈنٹ کی الزام تراشی پر بادشاہ دم بخود رہ گئے اور کچھ دیر بعد ریزیڈنٹ کو یہ کہہ کر رخصت کرنا چاہا کہ "بہتر ہے آپ کمپنی بہادر کو مطلع فرما دیں کہ یہاں کا نظم و نسق بہتر کر دیا جائے گا!"

ریزیڈنٹ نے کہا "بہت بہتر، لیکن کمپنی بہادر اور گورنر جنرل بہت مایوس ہو چکے ہیں اور انھوں نے مجھے یہ اجازت بھی دی ہے کہ میں بادشاہ کو کمپنی کے آخری اور درجۂ مجبوری کے فیصلے اور افسوسناک اقدام سے بھی مطلع کر دوں!"

بادشاہ نے کمزور آواز میں دریافت کیا "یعنی؟ کمپنی بہادر کا وہ آخری اقدام کیا ہو گا؟"

ریزیڈنٹ نے جواب دیا "۱۸۳۷ء میں جب نصیر الدین حیدر مرحوم جنت کو سدھارے اور ان کی جگہ بادشاہ کے دادا نواب محمد علی نے اقتدار سنبھالا تھا تو کمپنی بہادر کی طرف سے گورنر جنرل نے ان سے بھی یہی معاہدہ کیا تھا کہ اگر اودھ میں ظلم و ستم بدنظمی اور بے قاعدگی یوں ہی بڑھتی رہی تو ان حالات میں کمپنی بہادر اپنے اس حق کو محفوظ سمجھتی ہے کہ اس ملک کا نظم و نسق اپنے افسران کے سپرد کر دے۔ نواب محمد علی خاں نے اس معاہدے پر دستخط بھی کر دیے تھے!"

واجد علی شاہ نے ابھی کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ امین الدولہ نے ریزیڈنٹ سے کہا: "جناب والا! ابھی بادشاہ کو اقتدار سنبھالے ہوئے کتنے دن ہوئے ہیں، رفتہ رفتہ سارے حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ ریزیڈنٹ بہادر کمپنی کو مطلع فرما دیں کہ وہ جیسا انتظام چاہتی ہے ویسا ہی کر دیا جائے گا!"

ریزیڈنٹ بہادر چلے گئے لیکن بادشاہ کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ امین الدولہ اور ریزیڈنٹ آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اس اشتراک کو ختم کرنے کے لیے امین الدولہ کو منصبِ وزارت سے ہٹا دیا اور ان کی جگہ علی نقی خاں کو وزیر مقرر کیا۔ ریزیڈنٹ کو بادشاہ کا یہ اقدام پسند نہ آیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریزیڈنٹ اور بادشاہ میں چل گئی۔

بادشاہ کو اپنے اقتدار بحال رکھنے کی فکر لگ گئی تھی، ریزیڈنٹ کی نوک جھونک سے کمپنی بہادر کے ارادوں کا کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ اندر بیگمات الگ تنگ کر رہی تھیں اور ان میں سے بعض کے بارے میں بڑی افسوسناک اور شرمناک خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ بادشاہ کے مزاج میں چڑچڑا پن آ گیا اور وہ کسی حد تک تنہا رنجیدہ ہو گئے۔ بادشاہ نے قیصر بیگم کو منع کیا تھا کہ وہ اپنی ماں کو محل کے محل میں نہ رکھیں لیکن وہ نہیں مانیں اور ماں کو محل کے محل میں اپنے ساتھ ہی رکھ لیا۔ ننھی جان کی بابت کچھ مخبروں نے یہ خبر دی کہ وہ بادشاہ سے جو کچھ حاصل کرتی ہے اپنے گھر واپس جا کے یاروں پر خرچ کر دیتی ہے۔ پری خانم کے سلسلے میں یہ معلوم ہوا کہ ڈالی گنج میں اس کا بھی ایک عاشق ہے اور بادشاہ کی دولت ڈھل ڈھل کے اس کے پاس پہنچ رہی ہے۔ بادشاہ کو پے در پے جو صدمات اٹھانا پڑ رہے تھے ان سے وہ بہت دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ اور وہ اپنی بیگمات کی وفاداریاں آزمانے کی فکر میں تھے۔ پھر پتہ چلا گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ کانپور میں تشریف فرما ہیں اور بادشاہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ بادشاہ پورے اہتمام سے کانپور روانہ ہو گئے۔ لکھنؤ سے کانپور تک ایک میلہ سا لگ گیا۔ اس موقعے پر بھی بادشاہ نے کچھ ایسا انتظام رکھا کہ بیگمات اور محلات روزانہ بادشاہ کی مزاج پرسی کرایا کرتی تھیں لیکن ان میں چند ایسی بھی تھیں جنھوں نے بادشاہ کی کوئی پروا نہ کی۔

بادشاہ کانپور سے واپس آ کے دریائے گنگا کے کنارے فروکش ہو گئے۔ لارڈ ہارڈنگ بازو ید کو ہاتھی پر سوار ہو کے گنگا کے اس پار آئے۔ ابھی ان کا ہاتھی پل پر ہی تھا کہ بادشاہ ہاتھی پر سوار ہو کر استقبال کو بڑھے اور بادشاہ نے گورنر جنرل کو بھی اپنے ہی ہاتھی پر بٹھا لیا اور اپنے خیمے میں لے آئے کچھ دیر دونوں میں باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد گورنر جنرل کانپور واپس جانے لگے تو بادشاہ نے قیمتی موتیوں کا ہار ان کے گلے میں ڈال دیا اور قیمتی کپڑوں کی اکیاون کشتیاں پیش کیں، رخصت کرنے کے لیے خیمے سے باہر تک گورنر جنرل کے ساتھ گئے۔ گورنر جنرل نے بادشاہ سے وعدہ کیا کہ وہ چار روز بعد لکھنؤ آ رہے ہیں مگر گورنر جنرل کانپور واپس گئے اور بادشاہ لکھنؤ چلے آئے۔ بخیریت واپس آنے کی خوشی میں مبارک سلامت کی آوازیں بلند ہوئیں لیکن بادشاہ بہت فکرمند تھے ان کا دل بیٹھا جا رہا تھا، انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

لکھنؤ واپس آ کے انھیں بعض بیگمات کی بے وفائیاں یاد آ رہی تھیں انھوں

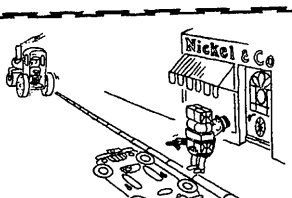

نے فیصلہ کر لیا کہ اب ان کی وفاداریاں بھی آزما لی جائیں۔ بادشاہ نے اپنی تمام بیگمات کو یکجا کیا۔ یہ رات کا وقت تھا اور ماحول جھاڑ فانوس اور کنول کی روشنی سے منور تھا۔ بادشاہ نے خود کو افسردہ بنا لیا۔ چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت طاری کر لی۔ وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔ بیگمات ان کے سامنے کھڑی بادشاہ کے بولنے کی منتظر تھیں۔ بعض بیگمات بادشاہ کو افسردہ اور اداس دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد بادشاہ نے سر اٹھایا اور بیگمات کو مخاطب کیا: "مہر تمثال اور جانِ عالم کے مرد پیارو! ہم تم سب سے اس وقت ایک اہم بات کرنا چاہتے ہیں۔ گورنر جنرل بہادر حکومت کے نظم و نسق میں کچھ خاص قسم کی تبدیلیاں چاہتے ہیں اس کا اثر تم پر بھی پڑے گا اور ہم کچھ عرصے اس لائق نہیں رہیں گے کہ تمھیں تمھارا ماہانہ دیا جا سکے، چنانچہ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس متوقع تبدیلی سے تمھیں مطلع کر کے یہ معلوم کریں کہ تم میں کتنی ایسی ہیں جو ان حالات میں بھی ہمارے ساتھ رہیں گی اور کتنی ہیں جو ہمیں پریشان کرنے کے بجائے یہاں سے چلا جانا پسند کریں گی۔ بخدا ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ تم لوگ جو بھی فیصلہ کرو گی ہم اسے بخوشی مان لیں گے اور تم سے خفا نہیں ہوں گے!"

کچھ دیر سکوت طاری رہا اور بیگمات ایک دوسرے کو دیکھ کر بادشاہ کو کنکھیوں سے دیکھنے لگیں پھر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں اور کچھ ہی دیر بعد انھوں نے اپنا متفقہ فیصلہ سنا دیا۔ انھوں نے نہایت چرب زبانی سے بادشاہ کو مطلع کیا۔ "اگر بادشاہ سلامت واقعی ہمیں کچھ دینے کے لائق نہیں رہے ہیں تو ہمیں اپنے اپنے گھر چلے جانے کی اجازت مرحمت فرما دیں، زندگی کی ضرورتیں اور حاجتیں سبھی کے ساتھ لگی ہیں، جب یہی نہ پوری ہوں تو کوئی کسی کی صورت دیکھ کر کس طرح زندہ رہ سکتا ہے!"

بادشاہ نے وہ سرگوشیاں بھی سنیں جو بعض بیگمات بادشاہ پر طنز و طعن کے لیے کر رہی تھیں، قیصر بیگم نے کہا: "بادشاہ سلامت اتنے کنگلے ہو گئے ہیں، بات سمجھ میں نہیں آتی!"

ننھی جان نے کہا: "جب یہاں سے اپنا ماہانہ نہیں ملے گا تو میری اماں تو مجھے جان ہی سے مار دیں گی!"

پری خانم نے تشویش سے کہا: "یہ خوب رہی کہ جس کے لیے میں نے اپنا شوہر چھوڑا تھا، وہی فقیر ہو گیا!"

واجد علی شاہ یہ سب سنتے اور کھولتے رہے، انھیں ان سب سے ایسی امید ہرگز نہ تھی۔ بادشاہ نے ان سب کے لیے اسی وقت سواریوں کا انتظام کرا دیا۔ بعض مصاحبین

نے بادشاہ کو اس جذباتی اور انتہائی فیصلے سے باز بھی رکھنا چاہا لیکن بادشاہ باز نہیں آئے۔

چلتے چلتے بیگمات نے بادشاہ سے کہا: "رخصت کرتے وقت ہم سے ایک وعدہ کیجیے!"

بادشاہ نے پوچھا: "وہ کیا؟"

بیگمات نے کہا: "اپنے گھروں میں ہم جیسی بھی زندگی گزاریں، بادشاہ کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور نہ بادشاہ سلامت ہمارے گھروں پر اپنے نگراں یا چوکیدار مسلط فرمائیں گے!"

بادشاہ نے ان کی درخواست منظور کرلی۔

ان کے چلے جانے کا بادشاہ کو اتنا ملال ہوا کہ ہر وقت اُداس رہنے لگے۔ بیگمات کی بے وفائی کا بوجھ دل پر لیے وہ کئی دن کھوئے کھوئے رہے، یہاں تک کہ اس ہجر و فرقت کے دوران اُنھیں بعض بیگمات کے مرنے کی خبریں موصول ہوئیں تو بادشاہ کو ان کی موت کا بھی یقین نہ آیا اور خبر دینے والوں سے یہی کہا کہ "ہم ان کی موت پر یقین نہیں کرسکتے، ان کا قبروں میں اُترنا بھی یقیناً کسی فریب کا حصّہ ہوگا اور جب تک وہ اپنی قبروں میں چالیس دن تک دفن نہ رہیں، ہم اُنھیں مردہ نہیں سمجھیں گے!"

اسی عالمِ حزن و یاس میں گورنر جنرل ہارڈنگ لکھنؤ پہنچ گئے۔ بادشاہ نے ان کا شاندار استقبال کیا اور تخلیے میں لے گئے۔ گورنر جنرل کی آمد بے معنی نہیں تھی۔ انھوں نے تخلیے میں صاف صاف کہہ دیا: "حضورِ والا! مجھے کمپنی بہادر نے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو کمپنی کے اِس فیصلے سے مطلع کردوں کہ آپ دو برس کے اندر اندر ملک کے نظم و نسق کو درست کردیں، اگر آپ اس میں ناکام رہے تو کمپنی بہادر کو انتظامِ سلطنت میں ایسی تبدیلی کرنا پڑے گی جس کا اثر بادشاہت پر پڑے گا!"

بیگمات کے ہجر و فراق کے مارے بادشاہ کو ایسا لگا جیسے در و دیوار گھوم رہے ہوں، دُنیا تاریک ہونے لگی۔ بادشاہ رحم اور افسوس کی نظروں سے تھوڑی دیر تک لارڈ ہارڈنگ کو دیکھتے رہے پھر اچانک بچّوں کی طرح گورنر جنرل کا دامن پکڑ لیا اور گڑگڑاتے ہوئے بولے: "لارڈ ہیسٹنگز نے ہمارے جدِاعلا نواب سعادت علی خاں پر بڑے احسانات کیے تھے، اسی طرح لارڈ آکلینڈ نے ہمارے دادا محمد علی شاہ کو تاج و تخت دلانے میں بڑی مدد کی تھی، اسی طرح آج ہم نے آپ کا دامن پکڑ لیا ہے، ہمیں برسرِ اقتدار رہنے میں آپ کی مہربانیوں کی سخت ضرورت ہے اور جب تک آپ یہ وعدہ نہ فرمائیں گے کہ آپ نے ہماری درخواست قبول کرلی ہے ہم آپ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں گے!"

گورنر جنرل نے اپنا دامن چھڑانے کی خاطر بادشاہ سے وعدہ کیا کہ وہ ان کی مدد کریں گے، گورنر جنرل نے ریزیڈنٹ کو کچھ ہدایتیں کیں اور کانپور واپس چلے گئے۔

بادشاہ ایک بار پھر اپنے تاج و تخت کی طرف سے مطمئن ہوگئے۔

★

جب بیگمات کو کسی طرح یہ بات معلوم ہوئی کہ بادشاہ کی مالی حالت خراب نہیں ہے اور انھوں نے یہ کھیل بیگمات کی وفاداریاں آزمانے کے لیے رچایا تھا تو ذرا شرمندہ ہوئیں اور ایک کے بعد دیگرے سبھی بادشاہ کے پاس پہنچ کر صدقے قربان ہونے لگیں۔ اُنھیں سامنے دیکھ کر بادشاہ پھر باغ باغ ہوگئے۔ قیصر بیگم، نھنی جان اور پری خانم سبھی کو باری باری گلے سے لگایا اور دیر تک ان کی بے وفائی کی شکایت کرتے رہے۔

قیصر بیگم نے آنسو بہاتے ہوئے کہا: "بادشاہ مجھ سے قسم لے لیں جو ان کی جدائی میں میں نے آنکھ بھی لگائی ہو!"

نھنی جان کیوں پیچھے رہتیں، کہنے لگیں: "میری تو بھوک پیاس ہی اُڑ گئی تھی۔ کھانا کھاتی تھی تو عجیب بدمزہ اور سیٹھا سیٹھا لگتا تھا، پانی پیتی تھی تو اس میں تلخی محسوس ہوتی تھی؟"

پری خانم گویا ہوئیں: "اپنا تو یہی مشغلہ رہ گیا تھا کہ رات کو اختر شماری اور دن کو جیسے تیسے وقت گزاری۔ کسی کام میں دل ہی نہ لگتا تھا۔ بادشاہ کی جدائی کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ انھوں نے میرے دل میں کتنی جگہ بنا رکھی ہے، میں تو بادشاہ کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتی!"

بادشاہ نے شکایتاً کہا: "لیکن تم لوگ تو اپنی مرضی سے یہاں سے گئی تھیں، ہم جب اس بے وفائی کو یاد کرتے ہیں تو کلیجا منہ کو آنے لگتا ہے!"

قیصر بیگم نے کہا: "اس وقت ہمیں اس کا صحیح اندازہ نہیں تھا کہ حضور نے ہمارے دلوں میں کتنا گھر کرلیا ہے!"

بادشاہ نے ایک بار پھر ان بے وفاؤں کی وفا کا یقین کرلیا۔

ایک بار پھر مصاحبین اور خواتین نے محفل میں رنگ جمانا شروع کیا۔ غلام رضا خاں اور دوسرے مصاحبین نے بادشاہ کی خدمت میں منتخب مال پیش کرنا شروع کردیا اور وہاں سے انعام و اکرام حاصل کرنے لگے۔ بادشاہ کی ذات سے معلوم نہیں کتنے لوگ فیض یاب ہو رہے تھے اور کتنے خاندان پرورش پا رہے تھے۔

ایک دن بادشاہ نے پریشانی کی حالت میں قیصر بیگم کو طلب کیا اور اس سے تخلیے میں دریافت کیا: "تمھیں یہ مرض کہاں سے لگا؟"

قیصر بیگم کوئی جواب دے سکیں تو بادشاہ نے ذرا خفگی سے کہا: "ہمیں یہ مرض تمھی سے لگا ہے!"

قیصر بیگم نے جواب دیا: "مجھے پتہ نہیں!"

بادشاہ نے کہا: "جب تمھیں یہ مرض لاحق تھا تو ہمیں ضرور بتانا چاہیے تھا؟"

قیصر بیگم کوئی جواب دیے بغیر چلی گئیں۔ آہستہ آہستہ یہ مرض اتنی ترقی کرگیا کہ آبلے پڑ گئے، ان میں بلا کی ٹیسیں اُٹھتیں اور بادشاہ کی آہیں نکل جاتیں، شاہی اطبا مرض کے دفیعے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے لیکن مرض تھا کہ امربیل کی طرح پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ اِس موذی مرض سے بیگمات اتنی خوفزدہ ہوئیں کہ انھوں نے بادشاہ سے دُور دُور رہنا شروع کردیا۔ بادشاہ منّتوں سماجتوں سے اُنھیں قریب بلاتے اور وہ دُور ہی سے جواب دے کر رفوچکر ہو جاتیں۔ بادشاہ کو ان کی بے وفائی کا ایک اور تجربہ یہ ہوا۔

بادشاہ درد اور ٹیس سے تڑپ رہے تھے۔ اسی عالم میں سامنے سے نھنی جان گزری، بادشاہ نے اسے

سب مہک

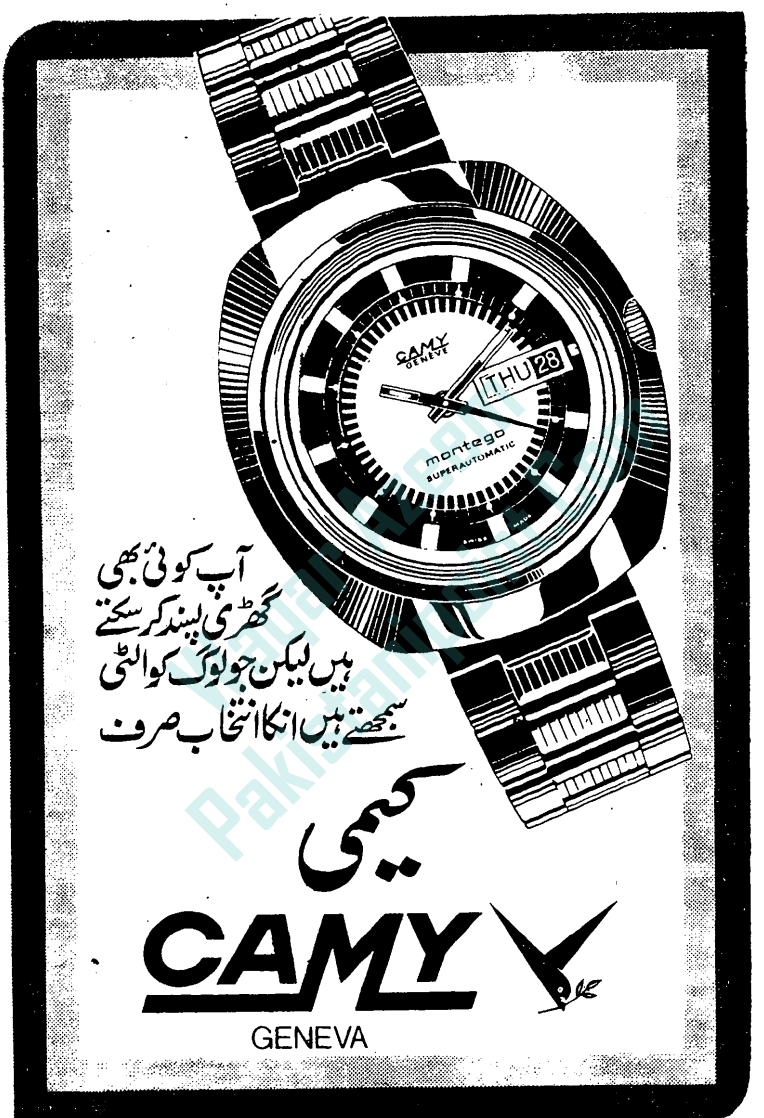

KEYMER

CWD—45/6/73

آواز دی۔ "ننھی جان! ہماری ایک بات سنو!"

ننھی جان نے دور ہی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ فرمایئے!"

بادشاہ نے کہا۔ "وہاں نہیں، یہاں ہمارے قریب آؤ، ہمیں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں!"

ننھی جان نے بے رُخی سے ایک طرف جاتے ہوئے کہا۔ "خدا بادشاہ پر رحم فرمائے۔ یہ چھوت کا مرض ہے حضور کو اس بات کا خود خیال ہونا چاہیے۔ خود تو بھگت ہی رہے ہیں اس میں کسی اور کو کیوں مبتلا کریں!"

جب ننھی جان نظروں سے اوجھل ہوگئی تو بادشاہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے۔ ابھی دل کا غبار اچھی طرح چھٹا بھی نہ تھا کہ پری خانم نظر آگئیں۔ بادشاہ نے انھیں بھی آواز دی۔ "پری خانم! ہماری ایک بات سنتی جاؤ!"

پری خانم نے ٹھٹھک کر بادشاہ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں، ہمارے قریب تو آؤ!"

پری خانم قریب آئی لیکن درمیانی فاصلہ دو گز سے کم نہ ہوا۔ بولی۔ "فرمایئے!"

بادشاہ نے تکلیف دہ لہجے میں کہا۔ "تم لوگ تو ہماری محبت کا اتنا دم بھرا کرتی تھیں کہ خدا کی پناہ، اور آج یہ حال ہے کہ ہم ایک موذی مرض میں مبتلا پڑے سسک رہے ہیں اور تم لوگ کوئی خبر ہی نہیں لیتیں!"

پری خانم نے جواب دیا۔ "میں حضور پر سے صدقے ہوجانے کو تیار ہوں لیکن جس آگ میں آپ پھنک رہے ہیں، اس میں مجھے جلنے پر مجبور نہ کیجیے، ویسے میں آپ کی کنیز ہوں، جو حکم دیں گے بجا لاؤں گی!"

بادشاہ نے خوشامد سے کہا۔ "پری خانم! تم اِک ذرا ہمارے پاس آجاؤ!"

پری خانم کچھ جھجک کے آگے بڑھی اور بادشاہ کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

بادشاہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور پری خانم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پہلے تو پری خانم کا یہ جی چاہا کہ وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہو لیکن پھر کچھ سوچ کے برداشت کر گئی۔

بادشاہ اس کا ہاتھ سہلاتے رہے، ایک آدھ بار گرم جوشی سے دبایا بھی پھر بولے۔ "پری خانم! ہم تمھارے ممنون ہیں کہ تم نے ہم سے پرہیز نہیں کیا۔ ہمیں یہ مرض قیصر بیگم سے لگا ہے اور یہ خدا کی شان ہی تو ہے کہ آج ہم سے وہ بھی کترا رہی ہیں!"

پری خانم نے کوئی جواب نہ دیا، وہ بادشاہ کی طرف سے منہ پھیرے بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد بادشاہ نے ہاتھ چھوڑ دیا اور پری خانم کو جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔ "اب تم جا سکتی ہو، ہم تمھارے احسان مند ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ کبھی کبھی ہمارے پاس آجایا کرو!"

پری خانم پھر آنے کا وعدہ کر کے آئی اور بیسن سے ہاتھ دھونے لگی، بادشاہ پری خانم کو دیکھتے رہے جب وہ ہاتھ دھو چکی تو بادشاہ نے اسے پھر آواز دی "پری خانم! ذرا ہمارے پاس تو آنا!"

پری خانم نے اس بار ذرا بے رخی اختیار کی اور دور ہی سے پوچھا۔ "آخر بات کیا ہے؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو میں آپ ہی کے پاس بیٹھی تھی!"

بادشاہ نے بے بسی سے کہا۔ "ہمیں تم سے ایک بات پوچھنی ہے!"

پری خانم دو گز دور جا کھڑی ہوئی اور کہا۔ "کیا پوچھنا ہے؟ فرمائیں!"

بادشاہ نے افسوس ناک لہجے میں پوچھا۔ "تم ابھی کیا کر رہی تھیں؟"

پری خانم نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ "آٹے بیسن سے اپنے ہاتھ دھو رہی تھی!"

بادشاہ نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

پری خانم نے جل کے کہا۔ "آپ تو اتنی معصومیت سے باتیں کر رہے ہیں گویا کچھ جانتے ہی نہیں ہیں تو دن رات خدا سے یہ دعا کر رہی ہوں کہ وہ آپ کو اس موذی مرض سے نجات دے، آپ کا مرض اتنا خطرناک اور مہلک ہے کہ اس کے مریض کو روئی تک لکڑی میں باندھ کر دی جاتی ہے کیونکہ ایسے مریض کا جسم چھونا بہت خطرناک ہوتا ہے!"

بادشاہ جس جگہ بیٹھے تھے، یہ جگہ شہنشاہ منزل کہلاتی تھی یہیں بیگمات سے ملاقاتیں ہوتی تھیں اور یہیں زندگی کے دلچسپ اور پُرلطف ترین مشاغل انجام پاتے تھے۔ پری خانم کی باتیں تیر کی طرح دل میں اتر گئیں، بادشاہ ایک کونے میں چلے گئے اور دیر تک روتے رہے پھر اٹھے اور شہنشاہ منزل مقفل کرا کے محل کے کسی حجرے میں منتقل ہوگئے۔

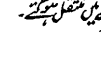

علاج ہوتا رہا اور ریزیڈنٹ بہادر بادشاہ کے خلاف چپکے چپکے کام کرتے رہے، بادشاہ کو گورنر جنرل کی تسلی تشفی پر کامل اعتماد تھا لیکن دوسری طرف ریزیڈنٹ سلیمن نے بادشاہ اور ان کے نظم و نسق کی ابتری کی جو رپورٹ کمپنی کو روانہ کی، اس نے ایک تہلکا مچا دیا۔

بادشاہ صحت یاب ہوگئے، گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ کی جگہ لارڈ ڈلہوزی آگئے اور بادشاہ کے خلاف ریزیڈنٹ اور ڈلہوزی میں مشورے ہوتے رہے۔ ــــــ بادشاہ کی زندگی کا ایک خاص انداز تھا اور وہ اس کے اتنے عادی ہوچکے تھے کہ اگر وہ یہ چاہتے کہ اس سے نجات حاصل کرلیں تو یہ بات ان کے اختیار کی نہ تھی۔

گورنر جنرل نے نظم و نسق کی درستی کے لیے دو سال دیے تھے اور اب اس بات کو نو سال گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں کتنی ہی بیگمات آئیں اور چلی گئیں، بادشاہ کا عشق ادھر سے اُدھر اور نئی نئی بیگمات کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ ریزیڈنٹ سلیمن کی جگہ جنرل اوٹرم نے سنبھالی اور بیگمات میں ایک بہشتن پر نظرِ کرم جو ہوئی تو بادشاہ نے اس سے متعہ فرما کے نواب آب رسا بیگم کا خطاب مرحمت فرمایا اور اسی طرح ایک مہترانی کو نواب مصفا بیگم کا خطاب عطا ہوا۔

بادشاہ کچھ عرصے سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کے بعض مصاحبین گستاخیاں کرنے لگے ہیں اور دورانِ گفتگو اختلاف آرا کی جرأت کرنے لگے ہیں، یہ بات چونکا دینے والی تھی جس طرح طوفان سے پہلے پرندے ادھر اُدھر پرواز کر کے محفوظ علاقوں کی طرف نکل جاتے ہیں، اسی طرح مصاحبین عمل کر رہے تھے، بادشاہ نے غلام رضا خاں سے پوچھا۔

"ہم تم میں کچھ فرق محسوس کر رہے ہیں یا یہ فرق واقعی پیدا ہوگیا ہے؟"

غلام رضا خاں نے جواب دیا۔ "حضور فرق ہم میں نہیں، ریاست میں آنے والا

ہے اور میرا یہ مشورہ ہے کہ حضور اودھ کا نظم و نسق افرنگیوں کے حوالے کر کے دست کش ہو جائیں!"

بادشاہ کے دل پر گہری چوٹ لگی۔ اتنے میں نواب علی نقی خاں بھی پہنچ گئے اور تخلیے میں لے جا کے بادشاہ کو سمجھایا۔

"حضور والا! ریزیڈنٹ بہادر نے کمپنی اور گورنر جنرل کے حکم پر اشتہار کی نقلیں تمام تھانوں میں چسپاں کرادی ہیں، اس میں ۱۸۰۱ء کے معاہدے کی نقل بھی شامل کر دی گئی ہے۔"

بادشاہ نے گھبرا کے پوچھا۔"آخر یہ افرنگی ہم سے کیا چاہتے ہیں؟"

وزیر علی نقی نے گردن جھکا کے عرض کیا۔"حکومت ان کے پاس چلی جائے تو انھیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔ ریزیڈنٹ بہادر چاہتے ہیں کہ ملک کا انتظام ان کے حوالے کر دیا جائے اور اس ناچیز کے خیال میں ریزیڈنٹ بہادر خود اس چکر میں پھنس رہے ہیں تو ہم کیوں پریشان ہوں؟ کیوں نہ اقتدار انھیں منتقل کر کے چین سے تماشا دیکھیں۔"

وزیر کا یہ مشورہ بادشاہ کی سمجھ میں نہ آیا اور انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

وزیر کے چلے جانے کے بعد بادشاہ نے کچھ سوچ کر محل کے آس پاس نصب شدہ توپیں ہٹوادیں اور اپنے محل سرا کے عملے کو غیر مسلح کر دیا۔ بادشاہ کی ماں مرزا سکندر کو ساتھ لے کر وہیں پہنچ گئیں۔ بادشاہ نے مرزا سکندر سے آنکھ تک نہ ملائی۔ دوسری طرف مرزا سکندر بھی شرما رہے تھے۔

اسی وقت ریزیڈنٹ بہادر بھی وہیں پہنچ گئے اور کمپنی بہادر کا حکم سناتے ہوئے بادشاہ سے کہا۔"کمپنی بہادر آپ کے اعزاز اور مرتبے میں کوئی کمی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ آپ کو بارہ لاکھ روپے اور شاگرد پیشہ اور عملے کے لیے تین لاکھ روپے سالانہ دینا چاہتی ہے۔" اس کے بعد ریزیڈنٹ نے اپنی جیب سے کمپنی کا معاہدہ نکالا اور بادشاہ کے سامنے رکھ کر کہا۔"بس آپ کا کام یہ ہے کہ اس پر دستخط فرما دیں!"

بادشاہ نے دستخط سے انکار کرتے ہوئے کہا۔"ہم دستخط نہیں کریں گے!"

بادشاہ کی والدہ نے کہا۔"اگر کمپنی یہ محسوس کرتی ہے کہ واجد علی شاہ نااہل ہیں تو وہ ان کی جگہ مرزا سکندر کو اودھ کا تاج و تخت دے سکتی ہے!"

ریزیڈنٹ نے افسوس سے جواب دیا۔"اب وقت نکل چکا ہے!"

بادشاہ نے کہا۔"یہ ظلم ہے، زیادتی ہے، سراسر ناانصافی ہے، ہم لندن جا کے اس فیصلے کے خلاف اپیل کریں گے!"

ریزیڈنٹ نے درخواست کی۔"آپ جو چاہیں کریں، آپ کو آزادی حاصل ہے لیکن اس معاہدے پر دستخط ضرور فرما دیں تاکہ آپ کو پندرہ لاکھ روپے سالانہ ملتے رہیں!"

بادشاہ نے خوشامدانہ انداز اختیار کیا، بولے۔"ریزیڈنٹ بہادر! آپ کے خیال میں کیا یہ زیادتی نہیں ہے؟ کیا آپ ہمارے حق میں کمپنی بہادر سے کوئی سفارش بھی نہیں کر سکتے؟"

ریزیڈنٹ نے افسوس سے جواب دیا۔"حضور والا! ہم مجبور ہیں!"

بادشاہ نے کہا۔"اچھا اودھ کی ضبطی کا عمل اس وقت تک تو ملتوی کر سکتے ہیں جب تک ہماری اپیل کا فیصلہ نہ سنا دیا جائے۔"

ریزیڈنٹ نے پھر وہی جواب دیا۔"ہم مجبور ہیں۔"

"آپ کسی کا گھر چھین لینے پر مجبور ہیں۔ آپ ہم پر ظلم ڈھانے پر مجبور ہیں! خوب! ایسی مجبوریوں سے خدا ہر شریف کو بچائے!" اس کے بعد بادشاہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے۔ مرزا سکندر بھی رو رہے تھے لیکن ان کی ماں خاموش تھیں اور یہ قیامت مردانہ وار جھیل رہی تھیں۔

ریزیڈنٹ بہادر سر جھکائے نہ معلوم کیا سوچ رہے تھے۔

بادشاہ نے یکا یک سر اٹھایا اور غصے میں کہا۔"آپ کچھ بھی کہیں، آپ ہمیں بے ملک، بے وطن اور بے گھر کر دیں اور یہ ایسا ظلم ہے کہ جس میں مظلوم مقابلے پر آمادہ ہو جاتا ہے لیکن ہم آپ سے جنگ نہیں کریں گے، یہ ہمارا فیصلہ ہے، اودھ کے شریف بادشاہ کا فیصلہ!"

ریزیڈنٹ نے جواب دیا۔"شکریہ، بہت بہت شکریہ!"

اس افتاد نے مصاحبین، زمانہ ساز اور بیگمات موقع پرست کو بادشاہ سے جدا کر دیا۔ محل ویران ہو گیا اور ہر چہار سمت نفسا نفسی کی کیفیت نظر آنے لگی!

محمودؑ ایاز

پر بہت زیادہ مہربان تھا۔ اس غیر معمولی مہربانی نے ایاز کے حاسد پیدا کر دیے تھے۔ حاسد اس تاک میں رہتے کہ کسی طرح ایاز کی کوئی غلطی یا خامی پکڑ کر اسے محمود کی نظروں سے گرا دیں۔ انھوں نے ایاز کے گرد سازشوں کا جال سا بچھا دیا تھا۔ ایک بار پتہ چلا کہ ایاز کبھی کبھی شاہی خزانے میں چوری چھپے جاتا ہے اور وہاں خاصی دیر رک کر نہ معلوم کیا کرتا رہتا ہے؟ حاسدوں کو یقین ہو گیا کہ ایاز یقیناً خزانے سے کچھ خُرد برد کر رہا ہے۔ انھوں نے ایاز کی یہ حرکت محمود کے گوش گزار کر دی۔ محمود نے کہا۔"اچھا، اب وہ جب بھی خزانے میں داخل ہو، ہمیں فوراً مطلع کیا جائے!"

کسی شاہی ملازم نے ایک دن ایاز کو شاہی خزانے میں داخل ہوتے دیکھا تو فوراً بادشاہ کو مطلع کر دیا۔ بادشاہ چند حاسدوں کو ساتھ لے کر چھپتا چھپاتا خزانے تک پہنچ گیا اور چھپ کے ایاز کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔ ایاز نے ایک گوشے سے چند کپڑے نکالے اور انھیں پہن لیا، یہ ایک پھٹا پرانا لباس تھا۔ ایاز نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو مخاطب کیا۔"ایاز! جب تو آیا تھا تو اس حلیے اور اس مرتبے کا آدمی تھا۔ آج تجھے جو مرتبہ حاصل ہے اس سے کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں ہرگز مبتلا نہ ہونا اور یہ بوسیدہ لباس جو اس وقت تیرے جسم پر ہے، شاہی خزانے کی طرح قیمتی ہے۔ اس کی ہمیشہ حفاظت کر تاکہ تجھے اپنی اوقات کا علم رہے۔" پھر اس نے خود سے معنی خیز انداز میں کہا۔"ایاز قدر خود بشناس۔"

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

باد شاہ نے یہ فیصلہ کر کے کہ وہ لندن پہنچ کے کمپنی کے ڈائرکٹران کے روبرو فریادی ہوں گے کلکتے کا رُخ کیا۔ تقریباً نو بیگمات اب بھی ہمراہ تھیں کُل پانچ سو افراد پر مشتمل یہ قافلہ الٰہ آباد پہنچا اور الٰہ آباد سے بنارس روانہ ہوگیا، دریا پار کرنے کے بعد باد شاہ جس گاڑی میں بیٹھے اس میں ان کے ساتھ جعفری بیگم نامی نہایت شوخ اور شریر بیگم بھی سوار تھیں ان دنوں باد شاہ ان پر اس بُری طرح مٹے ہوئے تھے کہ دوسری خواتین رشک و حسد میں مبتلا ہوگئی تھیں۔ دریا کے کنارے کی بالو میں باد شاہ کی گاڑی کا پہیا پھنس گیا۔ لوگوں نے نظریں پھیر لیں، باد شاہ گاڑی سے اتر پڑے اور کچھ دیر یہ انتظار کیا کہ کوئی جاں نثار آگے بڑھے اور گاڑی میں دھکا لگائے لیکن جب کسی نے توجہ نہ دی تو باد شاہ نے خود دھکا لگا کے گاڑی کو بالو سے نکالا۔

دریائے بھاگیرتی کے کنارے مٹیا برج میں یہ قافلہ ٹھہر گیا، یہاں باد شاہ کی طبیعت خراب ہوگئی اور طبیبوں نے باد شاہ کو بحری سفر سے منع کر دیا مجبوراً دوسرے لوگ فریادی بنا کے روانہ کر دیے گئے۔

جب حالات نے انھیں پریشان کرنا شروع کیا اور خرچ کی تنگی ہونے لگی تو باد شاہ نے کمپنی کی پیشکش قبول کرلی۔ باد شاہ کی سلطنت ۴ فروری ۱۸۵۶ء میں ضبط ہوئی تھی اور تقریباً ایک سال بعد ہندوستان میں غدر برپا ہوگیا، غدر جو حقیقتاً تحریکِ آزادی تھی، اس نازک اور خطرناک موقع پر باد شاہ کو فورٹ ولیم میں منتقل کیا جانے لگا۔ باد شاہ بیگمات سے جدا ہوتے وقت بہت روئے۔ وہ باری باری تمام بیگمات سے گلے ملے اور ان سے وفادار رہنے کی درخواست کی۔ ان میں قیصر بیگم بھی شامل تھیں جو شاید اس توقع پر آگئی تھیں کہ ممکن ہے باد شاہ کو حکومت پھر واپس مل جائے لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا وہ مایوس ہوتی جارہی تھیں۔

قیصر بیگم نے فورٹ ولیم میں نظر بندی کے لیے جانے والے باد شاہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ "جانِ عالم! تم مجھ سے آخری بار مل لو!"

باد شاہ نے چونک کے پوچھا۔ "آخری بار کا کیا مطلب ہے؟"

قیصر بیگم نے بے رخی اور بے مروتی سے کہا۔ "اب میں تمھارے پاس نہیں رہ سکتی کیونکہ اب تم باد شاہ نہیں ایک قیدی ہو اور مجھے ایک قیدی کی بیگم کہلاتے ہوئے شرم سی محسوس ہوتی ہے!"

باد شاہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے انھوں نے ایک سرد آہ بھری، بولے۔ "سچ کہتی ہو قیصر بیگم! اب ہم باد شاہ نہیں رہے اب ہم ایک قیدی ہیں اور شاید اسی لیے اب تم ہمیں "تم" اور "تو" سے مخاطب کر رہی ہو!"

باد شاہ فورٹ ولیم کی تنہائی سے اکتا گئے انھیں حکومت کا اتنا غم نہیں تھا جتنا بیگمات کی جدائی کا تھا۔ جب کسی طرح چین نہ ملا تو انھوں نے بعض بیگمات کو خطوط لکھے انھوں نے ایک بیگم کو لکھا۔ "تم اپنی مسّی بھیج دو، اس سے ہمارے دل کو سکون پہنچے گا!"

دوسری بیگم کو لکھا۔ "اختر محل! تمھاری زُلفوں کو سونگھے ہوئے ایک زمانہ گزرا، خدا کے لیے چند بال توڑ کے روانہ کر دو، دل کا بُرا حال ہو رہا ہے!"

جعفری بیگم کو لکھا۔ "تمھارے دوپٹے اور دلائی کی بو ہمیں دیوانہ بنائے رکھتی ہے جناب امیر کا واسطہ یہ دونوں چیزیں روانہ کر دو، ہم تمھیں زندگی بھر دعائیں دیں گے!"

جب یہ چیزیں باد شاہ کو قلعے میں پہنچ گئیں تو انھوں نے ان چیزوں کو آنکھوں سے لگا لیا اس وقت وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کر رہے تھے کبھی انھیں گالوں سے لگاتے کبھی پیشانی سے ملتے، کبھی آنکھوں پر رکھ لیتے اور کبھی سینے پر دل کے قریب رکھ کر دونوں ہاتھوں سے دبا کے ہم آغوشی کی لذت اٹھاتے۔ انھیں ہر وقت نظروں کے سامنے رکھتے اور جب سوتے تو انھیں سینے پر رکھ لیتے۔

ہندوستان کے ہنگاموں کی خبریں انھیں بھی مل رہی تھیں مراد آباد، دہلی، میرٹھ، جھانسی، کانپور، غرضیکہ جہاں جہاں انگریزوں سے معرکے ہو رہے تھے کسی نہ کسی طرح باد شاہ کو اس کی خبر ہو جاتی تھی۔

ایک دن کسی ملازم نے باد شاہ کو تخلیے میں بہت ساری خبریں سنا کے یہ سنسنی خیز خبر بھی سنائی۔

"حضور والا! فرنگیوں کے خلاف ہر جگہ جنگ چھڑی ہوئی ہے یہاں تک کہ جھانسی کی رانی تک میدانِ جنگ میں کود پڑی ہے!"

باد شاہ نے فخریہ کہا۔ "افسوس صد افسوس یہ فخر صرف ہمیں حاصل ہے کہ فرنگیوں کا اتنا ظلم سہہ جانے کے باوجود تشدد پر آمادہ نہیں ہوتے!"

اس شخص نے دوسری سنسنی خیز خبر سنائی۔ "اور حضور والا! قیصر بیگم کہیں فرار ہوگئیں!"

باد شاہ کی دونوں آنکھیں پوری طرح کھل گئیں بالکل اس طرح جیسے بجلی ہی ٹوٹ پڑی ہو گی، آہستہ آہستہ غمزدہ آواز میں بولے۔ "بے وفا کہیں کی۔ قیدی کی بیوی بھاگ گئی اسے تو بھاگنا ہی تھا!"

خبر دینے والے نے تیسری سنسنی خیز خبر سنائی۔ "اور حضور والا! آپ کے قلعے کا خدمتگار باقر علی آپ کا ساتھ چھوڑ کر فرار ہو چکا ہے اب حضور یہاں تنہا رہ گئے ہیں!"

باد شاہ کے دل پر کئی چوٹیں لگ چکی تھیں، انھوں نے آہستہ سے کہا۔ "چلا جانے دو، ہم تنہا رہ کر بھی جی لیں گے!"

مخبر نے آخری تکلیف دہ خبر سنائی۔ "اور حضور والا! باقر علی اپنے ساتھ جعفری بیگم کی دونوں یادگاریں بھی لے گیا۔ دلائی اور دوپٹا بھی!"

اب بات باد شاہ کی برداشت کی نہ رہی تھی، وہ اوندھے منہ مسہری پر گر گئے انھوں نے دونوں ہاتھوں سے دل پکڑ لیا اور گڑگڑاتے ہوئے بولے۔ "خداوندا! اس صدمۂ عظیم کے برداشت کی قوت عطا فرما، جعفری بیگم کی دلائی اور دوپٹا! آہ اب یہ دونوں چیزیں ہم کہاں پائیں گے! اب یہ ہمیں کہاں ملیں گی!"

نفسِ پارہ

سب رنگ کی منتخب کہانیاں اردو ادب کا عطر ہیں

سب رنگ کے لیے **شعورِ انوار** کا انتخاب

اُردو کے پیش رو افسانہ نگار علی عباس حسینی کی ایک تحریر

اس چیخ کی کہانی جس کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے

اُس طاقت کی کہانی جو سب سے بالا اور سب پر حاوی ہے!

اس تحریر میں بہت سے لوگوں کے لیے **عبرت کا سامان** موجود ہے

اس شمارے کے لیے تین بہترین تخلیقات

پہلی کہانی

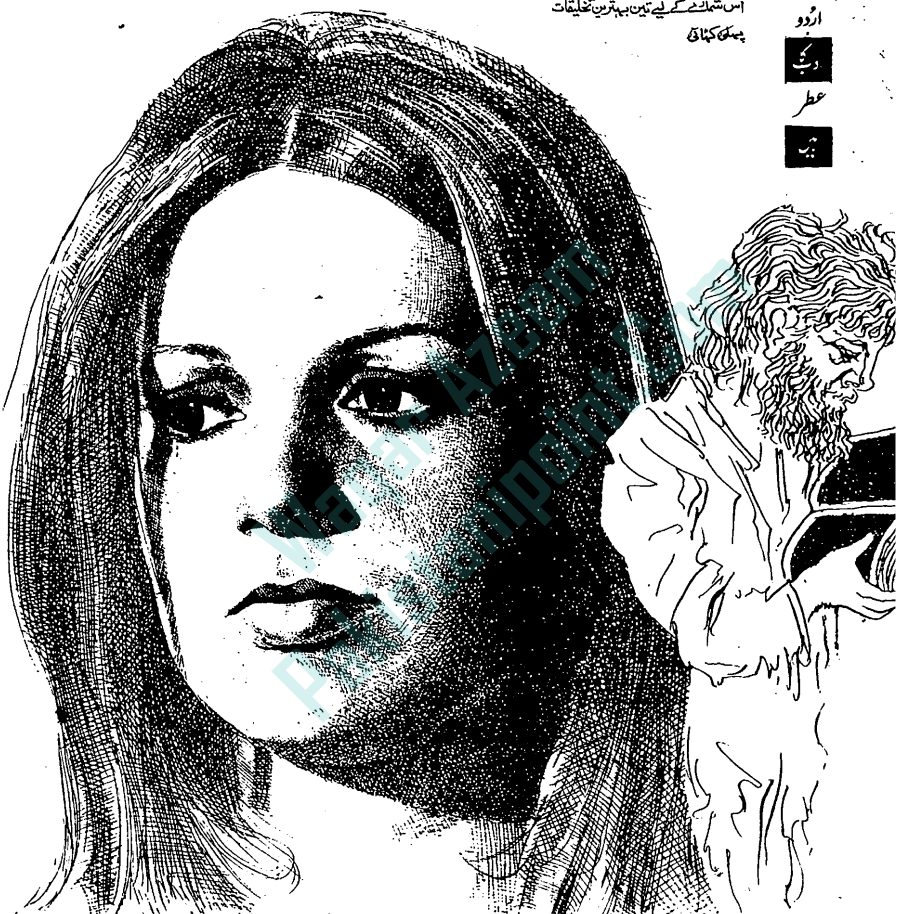

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

شالیخ علیم نمازِ عشا سے فارغ ہو کر فرش پر بچھے ہوئے ایرانی قالین پر لیٹا بو علی سینا کے "قانون" کا مطالعہ کر رہا تھا۔ سر ہانے سلطان کا عطا کردہ تین شمعوں والا گنگا جمنی شمع دان روشن تھا۔ شمعوں کی روشنی اس کے چہرے اور سینے کے گرد ہالہ سا بنا رہی تھی۔ اس کے سر کے چھوٹے چھوٹے بال ایک گول سیاہ مخملی ٹوپی نے چھپا رکھے تھے۔ اس کی چوڑی پیشانی چمک رہی تھی۔ اس کی پتلی لمبی ناک کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ

آنکھیں نیم وا سی تھیں۔ جیسے وہ شیخ الرئیس کے کسی خاص نظریے سے پُر زور اتفاق یا اختلاف رکھتا ہے اور اپنی رائے کی موافقت میں دلیلیں تلاش کر رہا ہے۔ اس کے پتلے ہونٹ پر کبھی کبھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ جاتی اور اس کا ایک ہاتھ گردن چھپائے ہوئے کھچڑی داڑھی کے بال سلجھانے لگتا تھا۔ اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی اور قالین پر کہنیاں ٹیک کر اُٹھنے کا قصد کیا ہی تھا کہ دروازہ آہستہ سے کھلا اور اس کے ملازم موسیٰ نے اندر داخل ہو کر اطلاع دی "شہر کے تاجروں کا ایک وفد آیا ہے جو شیخ سے اسی وقت ملنا چاہتا ہے" شیخ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا "کوئی ایسا ضروری کام ہی ہوگا جو یہ لوگ اتنی رات گئے آئے ہیں۔ انھیں اندر بلا لو۔"

وفد پانچ اراکین پر مشتمل تھا۔ وہ اندر آئے۔ شیخ نے سرو قد تعظیم کی ہر ایک سے مصافحہ کیا اور انھیں اپنے پاس بٹھا کر ملازم کو قہوہ اور میوے لانے کا حکم دیا۔ ملازم جب دروازہ بند کر کے باہر جا چکا تھا تو اس نے پوچھا "آپ حضرات نے کیسے زحمت کی؟"

وفد کے ایک رکن نے جو جسامت اور لباس دونوں کے لحاظ سے وفد کا قائد معلوم ہوتا تھا، اِدھر اُدھر سہمی ہوئی نظر ڈالی "جی ہم آپ کے پاس فریاد لے کر آئے ہیں مگر ڈرتے ہیں کہ....."

شیخ نے کہا "آپ اطمینان سے اپنا مقصد بیان کریں۔ میرا غلام میرا معتمد ہے، اس کمرے کی گفتگو کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی!"

دوسرے نمائندے نے پہلے کی بات دُہرائی "جی اب ہم آپس میں بھی گفتگو کرتے ڈرنے لگے ہیں۔ اسی کی تو فریاد لے کر آئے ہیں!"

شیخ نے کہا "تو ایسی فریاد کا سننے والا تو صرف خدا ہے۔ یا کسی حد تک ملک کا بادشاہ!"

تیسرے نے عرض کیا "بادشاہ تک اپنی فریاد پہنچانے ہی کی غرض سے تو ہم آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں"

شیخ نے سر ہلا کر کہا "جی اس کے لیے حکومت کی طرف سے افسر مقرر ہیں۔ پرچہ نویس، عرائض نویس، منشی، متصدی، وزرا"

چوتھے نے جلدی سے کہا "قبلہ انھی افسروں کے مظالم کے خلاف تو فریاد ہے۔ وہ بھلا اپنے ظلم و ستم کی داستان بادشاہ کے کانوں تک کیوں پہنچنے دیں گے؟"

شیخ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس کی آواز میں جھنجلاہٹ کی جھنکار سی پیدا ہو گئی "جی بادشاہ کی اتالیقی کا مجھے دس برس شرف حاصل رہا ہے میں اُس کے مزاج اور طبیعت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ بڑا کریم النفس اور رعیت پرور ہے وہ یقیناً اپنے عاملوں کے کرتوتوں سے بے خبر نہ ہوگا!"

پانچویں نے دست بستہ التماس کیا "وہ اگر باخبر ہے تو ظلم ... کرتا ہے اور اگر بے خبر ہے تو اسے ہوشیار کرنا آپ کا فرض ہے!"

شیخ نے قدرے خشک لہجے میں کہا "جی میں اپنی ذمے دار... اچھی طرح سمجھتا ہوں مگر مجھے اپنے بادشاہ سے تعجب ضرور ہے کہ وہ ... کے اندر ساری تعلیمات بھول کر اپنے فرائض سے غافل ہو گیا!"

پہلے نے ہنس کر کہا "جی ظل اللہ جوان بھی تو ہیں اور جوانی ... آپ نے سُنا ہی ہے!" اور وہ کھی کھی کر کے اس طرح ہنسا کہ اس کی توند ہلے...

دوسرے نے خالی لمحے بیکار نہ جانے دیے۔ وہ بولا "وہ اس و... بادشاہ نہیں عاشق ہیں ہمہ تن فرہاد و مجنوں!" اور اس نے اپنی پھبکی ... بھی پہلے قہقہوں میں شریک کر دی۔

شیخ نے بھی مسکرا کر پوچھا "اور لیلیٰ کون ہے؟"

تیسرا بولا "حکومت کے راز بادشاہ ہی جانے لیکن اُڑتی ہوئی خبر...

چوتھے نے بات کاٹی "اُڑتی ہوئی کیوں؟ مصدّق کہیے مصدّ...

شیخ نے کہا "ہاں تو وہ آپ کی مصدّق اطلاع کیا ہے؟ کس ... نے ہمارے اس خسرو کو اپنا اس درجہ والہ و شیدا بنا رکھا ہے کہ وہ منصبی ... بھول گیا؟"

پہلے نے قیادت کا حق ادا کیا۔ جواب میں سبقت کی "سُنا ... قاف کی رہنے والی کوئی کنیز ہے، گلگونہ نام....." وہ دم لینے کے لیے رُکا تو دوسرے نے بات کا سلسلہ نہ ٹوٹنے دیا "خوب صورتی میں چاند سو... کو ماند کرتی ہے....."

تیسرے نے جھوم کر اضافہ کیا "عورتیں کہتی ہیں نور کا گلا پایا ہے ... داؤد کی خوش نوائی کی داستان کانوں کان سُنی تھی، اس کی خوش گلو... کانوں سُنی....."

چوتھے نے ٹکڑا لگایا "بلبلِ ہزار داستاں کی طرح آواز ... شیریں ہے....."

پانچویں نے اپنی دانست میں نئی تشبیہ پیش کی "اور دلوں ... گونجنے والی کوئل جیسی لَے!"

پہلے نے سانس برابر کر لی تھی، اس لیے غزل تمام کرنے کی کوشش ... کی "اور پپیہے جیسی، بادشاہ کو اپنی آغوش میں بلانے والی تانیں!"

دوسرے کا جی نہ بھرا، اس نے دوغزلہ چھیڑ دیا "اور سُنا ہے ... وہ تلواروں کی دھار پہ ناچتی ہے!....."

تیسرے نے مصرع لگایا "جی نہیں، وہ سلطان کے دل کے تار پر رقص ... کرتی ہے....."

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

چوتھے نے دوسرے شعر کا آغاز کیا: "اور ہمارا بادشاہ اس گل کے گرد بھونرے کی طرح گھومتا ہے، اس کے اشاروں پر ناچتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

پانچویں نے غزل سرائی ختم کرنا چاہی: "اور اسی کے گلستانِ آغوش میں کھو جاتا ہے۔"

لیکن قائد نے مقطع والی بات کہہ کر نظم یوں تمام کی: "سلطان اسی گلگونہ کی نرم و نازک باہوں پر تکیہ کیے حکومت اور رعیت سے غافل رات دن سوتا رہتا ہے! اس کے ہاں ہر وقت بہار ہی بہار ہے اور ملک میں خزاں ہی خزاں!"

شیخ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے تالی بجائی۔ ملازم دو خوانوں میں خشک و تازہ میوے اور قہوہ لا کر رکھ گیا۔ جب مہمانوں کی ضیافت سے فراغت ہوئی تو شیخ نے کھڑے ہو کر کہا: "اب آپ حضرات تشریف لے جائیں۔ میں شب میں خدا سے اپنی ہدایت کی دعا کروں گا۔ ممکن ہے کہ سب کا فریادرس یہ گتھی سلجھانے کا کوئی طریقہ مجھے سمجھا دے!"

وفد کے جانے کے بعد شیخ نے تھوڑی دیر آرام کیا، پھر نمازِ تہجد میں مشغول رہا۔ صبح وہ نماز اور مقررہ وظائف سے جلدی فراغت کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا درباری لباس پہن کر محل سرا میں حاضر ہوا۔ پہرے کے سپاہی دربان و حاجب سبھی اسے پہچانتے تھے۔ وہ بادشاہ کا اُستاد تھا۔ اس کے آنے کی اطلاع نیم بیدار بادشاہ تک فوراً پہنچا دی گئی۔ سلطان نے دو برس بعد اُستاد کے اچانک تشریف لانے کی جو خبر پائی تو گھبرا گیا۔ اس نے غسل کیا، نہ لباسِ فاخرہ پہنا، بس شب خوابی کے کپڑوں پر ایک مخملی لبادہ ڈال کر نکل آیا۔ اس نے شیخ کا سلام اس سے بھی زیادہ جھک کر قبول کیا اور اس کے ہاتھ لے کر آنکھوں سے لگائے اور انھیں بوسہ دیا۔ شیخ نے اس کی سعادت کو سراہا، ترقیِ اقبال، سلطنت و عمر کی دعائیں دیں اور خاموش ہو رہا۔ سلطان نے گھبرا کر پوچھا: "قبلۂ عالم نے اتنے سویرے کیسے زحمت کی؟"

شیخ نے مسکرا کر کہا: "آج میں اپنے سلطان سے اپنا حقِ اُستادی مانگنے آیا ہوں!"

بادشاہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا کر کہا: "میں دل و جان سے حاضر ہوں! میری پوری سلطنت حاضر ہے، اس لیے کہ آپ نے مجھے وہ دولتِ علم عطا کی ہے جس کی قیمت دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت بھی ادا نہیں کر سکتی!"

شیخ نے مسکرا کر کہا: "نہیں، سلطنت آپ کو مبارک! وہ آپ کے لیے بنی ہے اور آپ اس کے لیے۔ مجھے تو ایک رفیقۂ حیات چاہیے۔ میری حیات کی ایک شریک۔ میں نے پورا شباب آپ کی خدمت اور تعلیم میں صرف کر دیا مگر اب جب کہ وہ کام انجام پا چکا ہے تو مجھے تنہائی محسوس ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

سلطان نے کہا: "تو اس مملکت کی جس شہزادی، امیرزادی کو آپ پسند فرمائیں ۔ ۔ ۔ ۔"

شیخ نے ہاتھ کے اشارے سے شاگرد کو روکا: "نہیں، مجھے تو ظلّ اللہ کی محل سرا سے صرف ایک کنیز چاہیے!"

بادشاہ نے خوشی سے کہا: "حرم سرا میں ایک ہزار سے زائد کنیزیں موجود ہیں۔ آپ جسے پسند فرمائیں، وہ حاضر کی جائے!"

شیخ نے سلطان کو بہ نظرِ تشکر دیکھ کر کہا: "مجھے بادشاہ سے یہی اُمید تھی! حکم دے دیا جائے کہ گلگونہ میرے ساتھ کر دی جائے!"

بادشاہ نے استعجاب و اضطراب سے پوچھا: "گل؟ ۔ ۔ ۔ گل ۔ ۔ ۔ گونہ؟" آواز حلق سے پھنسی پھنسی سی نکلی۔

شیخ نے ایک انجان کی سی سادگی سے کہا: "جی ہاں سنا ہے کہ وہ موسیقی کی ماہر ہے، مجھے بھی تو سماع سے شوق ہے!"

بادشاہ نے دو بار کانپتے ہونٹوں پر زبان پھرائی۔ پیشانی سے پسینہ پونچھا اور گھٹی ہوئی آواز میں کہا: "بہت خوب!"

شیخ نے پھر دعائیں دیں اور کہا: "تو پھر حکم صادر فرما دیا جائے۔"

بادشاہ نے تالی بجائی۔ حبشی غلام حاضر ہوا۔ اس نے حکم دیا: "گلگونہ کو میں نے آج سے اُستادِ محترم کی کنیزی میں دے دیا۔ اسے عزت و احترام سے آپ کے دولت کدے پر پہنچا دو۔" غلام سلام کر کے پیچھے ہٹنے لگا تو سلطان نے کہا: "اور دیکھو، اس کے محل کا سارا سامان بھی اونٹوں، خچروں، ٹھیلوں پر لاد کر وہیں پہنچا دینا۔"

شیخ نے کہا: "میں ظلّ اللہ کی اجازت سے حکم کے اس آخری جزو میں ترمیم کا طالب ہوں۔ گلگونہ کا سارا سامان صدر الصدور کی خدمت میں ارسال کر دیا جائے تاکہ وہ بیواؤں اور یتیموں میں تقسیم کر دیا جائے!"

بادشاہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "مجھے اس پر فخر ہے کہ مجھے اخلاق کی تعلیم آپ جیسے مردِ سخی نے دی ہے!"

شیخ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اور سر جھکا کر بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔

سلطان نے درد سے مسکرا کر پوچھا: "لیکن اس کے رقص و نغمہ کے ساز و سامان؟"

شیخ نے کہا: "ظلّ اللہ ان کی بھی ضرورت نہیں! اب گلگونہ نئے ساز پر گائے گی!"

حبشی کے جاتے ہی شیخ نے زحمت دہی کی معافی چاہی اور

اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، سلطان نے اُستاد کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر پوچھا "کوئی اور خدمت؟"

وہ بولا "نہیں، مجھے میرا حق مل گیا!"

نوجوان بادشاہ نے گلگونہ کو تو دے ڈالا مگر اس کی جان پر بن گئی۔ اس کے دل میں غموں کا جوار بھاٹا اُٹھ رہا تھا، چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ ہاتھ پاؤں بے قابو ہو رہے تھے۔ وہ شیخ کے سامنے سیدھا کھڑا تو ہو گیا مگر سارے جسم سے کانپنے لگا۔ شیخ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "میرے بیٹے مجنوں و فرہاد بننا آسان ہے مگر بادشاہ بننا بہت مشکل ہے! اس کے لیے ایک کی جگہ کروڑوں سے محبت کرنا ضروری ہے!"

اور وہ متانت سے قدم رکھتا ہوا باہر نکل گیا اور نوجوان بادشاہ لبِ فرش تک اُستاد کو پہنچا کر پلٹا اور مسند پر جھوم کر گرا اور سسکنے لگا۔

شیخ کو گھر پر ایک بپھری ہوئی شیرنی سے مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ اپنی بوٹیاں نوچ رہی تھی اور شیخ کے ملازموں پر بجلیاں گرا رہی تھی، وہ بادشاہ کی محبوبہ تھی، وہ محل کی رانی تھی، اس کے ابرو کے اشاروں پر سلطنت کا نظم ونسق درہم برہم ہو جاتا تھا۔ اس کے زبان ہلانے پر بے قصوروں کو پھانسی دی جاتی تھی اور مجرموں کا خون معاف کیا جاتا تھا۔ اس کی خوشی کے لیے جاگیریں عطا ہوتیں، اس کی چتون پر بل آنے ہی خاندانی اُمرا خانماں برباد کر دیے جاتے تھے۔ وہ جدھر جاتی نظریں بچھائی جاتیں۔ کنیزیں آگے پیچھے دوڑتیں، شہزادیاں مجرے کے لیے کھڑی رہتیں اور آج وہ اپنے سجے سجائے محل سے اُٹھا کر بوریئے کی طرح اس مختصر سادہ کمرے یا باڑے میں پہنچا دی گئی تھی، نہ یہاں جھاڑ فانوس تھے، نہ قاقم و سنجاب کے پردے، نہ جواہر جڑے ہوئے ظروف، نہ سونے کی پلنگڑی، نہ حریر و دیبا کے گدے، غیر منقش چھت، بے تصویر کی ننگی دیواریں، ناہموار فرش پر موٹی سی چٹائی، بس ایک کونے میں ایک ایرانی قالین۔ گلگونہ کو اس کی ایک ایک چیز کاٹے کھاتی تھی اس لیے اور بھی کہ وہ کنیز تھی، ایک غریب کسان کی لڑکی جس کے گھر میں اتنا سامان بھی نہیں تھا جتنا اس سادگی میں یہاں موجود تھا۔ وہ قزاقوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر بازار میں بیچی گئی، سلطان کے سامنے پیش کرنے کے لیے اسے موسیقی اور رقص کی تعلیم دی گئی اور اپنی خوش گلوئی اور خوش ادائی کی بدولت وہ شاہی گردن کا ہار بنی۔ اس کا غصہ اور اس کی جھلاہٹ اس لیے رہ رہ کر بھڑک اُٹھتی کہ وہ جو ابتدا بھول چکی تھی، شیخ کے ہاتھوں پھر وہ نظروں کے سامنے تھی۔ خاندانی نہ عروج پر اُبلتا ہے، نہ زوال پر پسیجتا ہے، وہ جانتا ہے یہ دُنیا کے نشیب و فراز ہیں مگر نو دولتا چھوٹی ہانڈی ہے، جلد ہی اُبلتا بھی ہے جلد ہی بیٹھ بھی جاتا ہے۔

گلگونہ اس لیے آپے سے باہر تھی۔ اس نے غصے میں قمیص کا گریبان اس طرح نوچا تھا کہ ہیرے کے بٹن فرش پر بکھر گئے تھے۔ دوپٹا دھجیاں بنا ایک گوشے میں پڑا تھا اور وہ اب کمرے کی ہر شے پر قہر کی نظریں ڈال رہی تھی کہ کیا توڑے کیا پھاڑے کہ شیخ اسی وقت اندر داخل ہوا۔ بے مقنع و چادر پھٹی ہوئی قمیص میں اس تنے مجاز میں وہ جلوہ دیکھا کہ آنکھیں خیرہ کرنے لگیں۔ اس نے اپنا دھڑکتا دل قابو میں لانے کے لیے داڑھی پر ہاتھ پھیرا، کھانس کر گلگونہ کو مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ گلگونہ نے شیخ پر سر سے پاؤں تک نظر ڈالی۔ سوکھا چہرہ، لاغر جسم، چالیس پینتالیس برس کا مرد، سر پر عمامہ سپید قبا پر کالی عبا، لمبی ناک، لمبا ڈیل، کھچڑی داڑھی پوری صورت میں دو بڑی بڑی چمکتی آنکھوں کے سوا کوئی جذب نہیں۔ گلگونہ نے لمبی لمبی سانسیں لے کر کہا "یہ آپ ہی کی کارستانی ہے کہ میں محل سرا سے نکال کر اس پاپوش خانے میں بھیجی گئی؟"

شیخ نے کہا "نہیں، اس میں مجھ سے زیادہ کاتبِ تقدیر کو دخل ہے، وہی جھونپڑے سے نکال کر محل میں لے گیا، اسی نے شاہی محل سے ایک درویش کے گھر بھیج دیا!"

گلگونہ غصے میں تھرا کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں گھٹنوں پر سر رکھ لیا "مگر میرے معاملے میں تو کاتبِ تقدیر آپ ہی بنے! نہ جانے میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا!"

شیخ نے کہا "تم اپنی ہی نہیں، سارے ملک کی قسمت بگاڑ رہی تھیں، میں تمہیں ایک بُری زندگی سے نکال کر ایک اچھی زندگی کی طرف لایا ہوں"

اس نے سر اُٹھا کر طنز سے پوچھا "آخر میرے حال پر یہ کرم خاص کیوں؟"

شیخ نے مسکرا کر کہا "اس لیے کہ تم اس ملک کی سب سے بڑی حسینہ ہو!"

اس نے پھر طنز سے کہا "تو خیر سے آپ حسن و جمال کے پرکھنے کی تمیز بھی رکھتے ہیں!"

شیخ نے بڑی متانت سے کہا "میں نے ساری عمر جمال ہی کی تلاش میں صرف کی ہے!"

اس نے پھر وار کیا "اور اس ساری عمر کی تلاش کے بعد آپ کو نظر آئی تو میں ہی!" مگر لہجے میں اب تلخی کم تھی۔

شیخ نے پھر مسکرا کر کہا "ہاں مجاز میں تو تم کسی حد تک اس جمال کا نمونہ کہی جا سکتی ہو مگر ابھی بڑا نقص ہے۔ جیسا ظاہر ہے ویسا باطن نہیں!"

گلگونہ بولی "تب مجھے پہیلیاں بوجھنے کا دماغ نہیں!"

شیخ نے کہا "دماغ تو ہے مگر دھیان دینے کی خود پرستی اجازت

نہیں دیتی!"

گلگونہ جھلا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دانت پیس کر بولی "خود پرستی! سوپ کو ہنسے چھلنی جس میں بہتر چھید! یہ آپ کی خود پرستی و نفس پرستی نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ نے بادشاہ سے اس کی چہیتی کنیز، اور مجھ سے دولت و ثروت، عیش و نشاط کی زندگی چھین لی تاکہ آپ اپنا کرم خوردہ، خشک دبلے آب جسم میرے لمس کی حرارت سے تر و تازہ بنائیں!" اور اس نے جھٹکا دے کر قمیص کا چاک بڑھا دیا۔ شیخ نے نظریں نیچی کرلیں۔ وہ آہستہ آہستہ بولا "تم نے میری غرض غلط سمجھی۔ میرا مقصد واقعی رعیت کی، بادشاہ کی اور تمہاری بھلائی ہے۔ خیر، میں تمہارے لیے بازار سے کچھ سلے سلائے کپڑے لایا ہوں، وہ خادمہ سے بھیج دیتا ہوں۔ منہ ہاتھ دھو ڈالو، کپڑے بدل لو، پھر تھوڑا آرام کر کے مجھ سے گفتگو کرنا۔" وہ دروازے سے نکلتے نکلتے پھر بولا "دو چار دن میں تم مجھے پہچان لو گی۔ میں برابر تمہارے لیے توفیقِ نیک کی دعا کرتا رہوں گا! ..... اور سنو، یہ جو ہیرے کے بٹن ہیں، انھیں بھی صدقۃ اللہ صدور کو بطورِ صدقہ بھیج دو!"

دو گھنٹے بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھا تفسیر کا مطالعہ کر رہا تھا کہ وہ دروازہ تڑاق پھڑاق کھولتی بند کرتی، بڑبڑاتی داخل ہوئی "میں اس بالشت بھر کے گھر میں کہاں جاؤں؟ کہاں گھوموں پھروں؟ کس سے باتیں کروں؟ مجھے تو اس میں قبر جیسی تنہائی محسوس ہوتی ہے!"

شیخ نے اپنے پہلو میں قالین تھپک کر کہا "آؤ میرے پاس بیٹھو۔" اور اس نے مصری لحن سے چند آیتیں پڑھیں، پھر گلگونہ سے پوچھا "تم قرأت جانتی ہو؟" اس نے نفی میں سر ہلایا تو اسے مخارج بتاتا اور ان کی مشق کراتا رہا۔ موسیقی سے واقف ہونے کی وجہ سے گلگونہ کو یہ فن سیکھنے میں بڑا لطف آیا، وہ اپنا غم بھول گئی۔ جب وہ اس مشق سے تھک چکی تو شیخ نے اس کے سر پر چادر ڈال کر تالی بجائی۔ غلام کشتی میں انگور، انار اور ایک کیتلی میں چائے اور دو استکان لا کر رکھ گیا۔ شیخ نے ایک میزبان کی طرح اصرار کر کے اسے میوے بھی کھلائے اور چائے بھی پلائی۔ پھر کہا "معاف کرنا، میں نے ابھی عصر نہیں پڑھی ہے۔ اب میں آٹھ بجے کھانے پہ ملوں گا!"

اور جب وہ گردن جھکائے اپنے کمرے کی طرف چلی تو شیخ نے مسکرا کر کہا "تم اپنا دل بہلانے کے لیے باورچن کو بلا لو۔ اس کے ساتھ جا کر گھر کے سارے اثاثے کا جائزہ لے لو۔ کیا چیز ہے؟ کیا نہیں ہے؟ کیا کیا ہونا چاہیے؟ کیا کیا منگانا ہے؟ ان سب کی فہرست بنا ڈالو۔ تمھیں کو اب اس گھر کا انتظام کرنا ہے۔ تمھی اس کی مالکہ ہو!" اور اس نے اس کے ہاتھ میں اشرفیوں کی ایک تھیلی دے دی۔ گلگونہ نے بند مٹھی دانت کے نیچے دبا کر کہا "مگر میں نے

ہر دور کی اُمنگ
بکسلے کے رنگ

عام استعمال کے رنگ و روغن ہوں
یا
غیر معمولی نوعیت کی مخصوص ضروریات،

BUXLY

بکسلے پینٹس لمیٹڈ

ہر عنوان اور ہر میدان میں
قافلہ سالار ہیں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تو آج تک کسی گھر کا انتظام نہیں کیا، میں کیا جانوں ؟ "

شیخ نرمی سے بولا۔ " تو تم نے عورت کا سب سے بڑا فرض اب تک ادا نہیں کیا۔ خیر جاؤ، آج سے بسم اللہ کرو، کرنے ہی سے سب کچھ آتا ہے۔" اور وہ مصلّے پر کھڑا ہو گیا۔

اور یوں ہی دن گزرنے لگے۔ شیخ کبھی گلگونہ کے ساتھ چائے پی لیتا، کبھی اس سے خدا اور رسول کی باتیں کرتا، کبھی اسے تفسیر سناتا، کبھی حدیثوں کے معنی و مطلب بیان کرتا اور کبھی اس سے مصری و عراقی لہجوں میں تلاوت کرا کے اس کی قرأت درست کرتا لیکن پہلے دن کے بعد اس نے کبھی نہ تو اس کے حسن کی تعریف کی، نہ اُسے یاد دلایا کہ وہ اس کی کنیز ہے اور وہ اس کا آقا اور نہ کسی موقع پر اپنے حقوق جتائے۔ اِن دونوں کے درمیان اُستاد و شاگرد کا رشتہ تھا یا مالک مکان اور گھر کی منتظمہ کا اور بس۔

شیخ کی اس بے پروائی سے گلگونہ کے اندر والی عورت جاگ پڑی۔ اسے ایک زاہدِ خشک کا اپنی جنس کی طرف سے یوں بے حِس ہونا اپنی پوری صنف کی توہین محسوس ہوئی۔ اس کی خودی مجروح ہوئی اور وہ شیخ میں سوئے ہوئے مرد کو جگانے پر آمادہ ہو گئی۔ اب وہ جب بھی شیخ کے پہلو میں بیٹھتی تو وہ ایک بار اس کے خشک سرد ہاتھوں پر اپنا نرم و گرم ہاتھ ضرور رکھ دیتی۔ وہ اس طرح اس کے قریب آ کر بیٹھتی کہ جسم سے جسم ضرور مس ہو جاتا اور اب وہ جب بھی نیا لباس بدلتی تو شیخ کے کمرے میں کسی نہ کسی بہانے سے آ کر ضرور ہو جاتی اور آتی تو گنگناتی ہوئی آتی اور جاتی تو گنگناتی ہوئی جاتی۔

شیخ کوئی پتھر نہیں تھا، انسان تھا۔ اس نے اپنی جنس اپنی کتابوں میں بھلا رکھی تھی مگر اس روز روز کے وار نے اس کی سپر کاٹنی شروع کر دی۔ اس کی زرہ کی زنجیریں ٹوٹنے لگیں، اسے گلگونہ کی شرارتوں پر جتنا پیار آتا، اتنا ہی اس کا غصہ بڑھنے لگا۔

ایک دن شیخ اپنے دارالمطالعہ میں بیٹھا کتاب بند کیے اپنے ہاں جذبے اور عقل کی جنگ پر غور کر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں جلتمال کی آواز آئی۔ اس چھُن چھُن میں کچھ ایسی دلکشی تھی کہ وہ بے ساختہ وہ پردہ دیکھنے لگا جو اس کے اور گلگونہ کے کمرے کے درمیانی دروازے پر پڑا تھا۔ وہ اسی طرح دیکھ رہا تھا کہ پردہ ہٹا اور گلگونہ ایک تتلی کی سبکی سے ناچتی اس کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ نیم عریاں تھی۔ جو لباس جسم پر تھا وہ اتنا باریک اور نازک تھا کہ جسم کا رواں رواں دکھائی دیتا تھا۔ لباس نہ تھا گویا فانوس تھا کہ ایک جلتی شمع آغوش میں لیے ہوئے تھا۔ اس کے پاؤں پھرکی کی تیزی سے چل رہے تھے اور اس کی پور پور حسن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔

شیخ کے دل میں وہی تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی جو نسیم کے جھونکوں سے وقتِ سحر گلوں کی کھلتی پنکھڑیوں میں دکھائی دیتی ہے۔ شیخ نے گھبرا کر آنکھیں جھکا لیں۔ اس کی زبان پر بے ساختہ وہ آیت جاری ہو گئی جو بجلی چمکتے وقت تلاوت کرنے کا حکم ہے۔ پھر اسے اچانک یہ محسوس ہوا جیسے سارے جسم کا خون تیزی سے سر کی جانب چڑھتا چلا جا رہا ہے۔ کنپٹیاں دہکنے لگیں، تالو چٹخنے لگا۔ سانس لینے میں دقت ہونے لگی۔ وہ دفعتہ گرج اُٹھا۔ " تمھیں میرے کمرے میں اس طرح ناچتے ہوئے آنے کی کس نے اجازت دی ؟ "

گویا بجلی گرانے والی پر بجلی گری۔ گلگونہ کچھ لمحے تو بُت بنی کھڑی رہی، پھر سسکتی ہوئی اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

شیخ کو فوراً محسوس ہوا کہ اس نے گلگونہ کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔ اپنے بے قابو نفس پر آنے والا غصہ اس حسینۂ دل نواز پر بے جا اتارا۔ وہ اپنے اس ظلم پر منفعل و شرمسار اپنی جگہ سے اُٹھا۔ قصد تھا کہ گلگونہ سے چل کر ابھی معافی مانگے۔ اس نے تیزی سے قدم بڑھا کر پردہ ہٹایا۔ بیچ کے دروازے کے دونوں پٹ کھلے تھے، سامنے ہی گلگونہ نظر آئی۔ وہ سسکتی جاتی تھی، اپنے کپڑے نوچ کر پھینکتی جاتی تھی اور پاؤں پٹکتی جاتی تھی۔ گھنگرو اب بھی پاؤں میں بندھے تھے اور جسم کی غیر شعوری حرکت میں رقص کا پورا کیف تھا۔ شیخ کا عزم پائمال ہونے لگا۔ اس کے قدم رکنے لگے۔ اسے اپنے جسم میں جلتی چنگاریاں سی اُڑتی محسوس ہونے لگیں۔ وہ اس نئی کیفیت سے اور بھی گھبرا اُٹھا۔ حسبِ عادت اِس کا ایک ہاتھ داڑھی کے بالوں تک پہنچ گیا۔ خشک انگلیوں میں اِن سوکھے تاروں کی رگڑ نے جیسے اسے جگا دیا۔ وہ چونک اُٹھا۔ اس نے اپنے نفس کو ملامت کی اور آہستہ آہستہ قدم رکھتا۔ اپنے کمرے میں پلٹ آیا اور فلسفے کا ایک نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ حل کرنے میں مشغول ہو گیا۔

دو گھنٹے بعد اس نے گلگونہ کو آواز دی۔ جب وہ سر جھکائے آئی تو شیخ نے اظہارِ ندامت کرتے ہوئے کہا۔ " تم میرے سامنے نیم برہنہ ناچتی ہوئی چلی آئیں، اس میں تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں تمھارا آقا اور تم میری کنیز ہو لیکن تمھارا یہ فعل میری اجازت کے بغیر تھا اس لیے مجھے غصہ آ گیا اور میرے مشرب میں غصہ حرام ہے، اس لیے میں نے اپنے کو خود سزا دی۔ تین دن روزے بطورِ کفارہ رکھوں گا ! "

ابتدائے گفتگو میں جو گلگونہ کی آس بندھی تھی، وہ ختمِ کلام پر ٹوٹ گئی سانپی شکست کا احساس اس کے ہاں تیز تر ہو گیا۔ وہ عورت تھی جو کبھی اپنی شکست نہیں مانتی اس لیے اس نے پرانے حربے بدل ڈالے۔ اس نے روزوں میں بھی شیخ کا ساتھ دیا اور وہ پنج وقتہ اس کے پیچھے آ کر نماز پڑھنے لگی۔ اس نے شیخ سے پوچھ پوچھ کر اس کے سارے اوراد و وظائف بھی یاد

کر ڈالے اور وہ صبح و شام انھیں جھوم جھوم کر خوش گلوئی سے پڑھنے لگی۔ ریاضت و عبادت کی اس رفاقت نے شیخ کی جنسی آگ اور بھڑکا دی۔ زاہد زاہدہ کو چھپ چھپ کر للچائی نظروں سے دیکھنے لگا مگر جب بھی نفس کا شیطان اسے حد سے زیادہ ستاتا، وہ روزوں کی تعداد میں اضافہ کر دیتا۔ نمازیں بڑھا دیتا۔ تلاوت کے گھنٹوں میں اضافہ کر دیتا لیکن جذبے اور عقل کی اس کشمکش میں اس سے تصنیف و تالیف کا کوئی کام نہ بن پڑتا۔ گلگونہ کے سوا کسی موضوع پر دماغ غور و فکر کے لیے تیار نہیں تھا۔

ادھر گلگونہ نے بھی اپنا رنگ روپ کھونا شروع کر دیا۔ روزوں پر روزے، نمازوں پر نمازیں، روح کی طاقت جتنی بھی بڑھائیں، جسم سے ساری جیرانی کشش چھین لیتی ہیں، گلگونہ کے گلابی گال اب کندنی بن گئے تھے۔ ہونٹوں سے تازگی، آنکھوں سے نیلا پن غائب ہونے لگا تھا۔ اسے یہ احساس مارے ڈالتا تھا کہ جس کے کارن یہ سارے پاپڑ بیلے، وہ اب بھی بے پروا ہے۔ ایک دن وہ اپنے کمرے میں جا نماز پر بیٹھی ہاتھ اُٹھائے احسن الخالقین سے یہی شکایت کر رہی تھی اور اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے کہ شیخ کسی کام سے اندر داخل ہوا۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دل پر آرے ملنے لگے۔ وہ چھٹتا ہوا اپنے کمرے میں آیا، اس نے درباری لباس پہنا اور شاہی محل کی طرف لپکتا ہوا روانہ ہو گیا۔

سلطان کی خدمت میں وہ اسی طرح ایک مدت بعد حاضر بار یاب ہوا۔ حسبِ معمول مصافحے اور معانقے کے بعد سلطان نے خیریت پوچھنے کے بعد دریافت کیا۔ "کیسے سرفراز فرمایا؟"

شیخ نے کہا۔ "جو کنیز ظل اللہ سے مانگ کر لے گیا تھا، اُسے پلٹانے آیا ہوں۔"

سلطان نے کہا۔ "آپ ہی کی تعلیم ہے کہ بادشاہ دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتا۔"

شیخ نے کہا "مگر میں نے یہ چیز عارتیاں تھی محض اپنے سلطان کو سلطنت کی حالت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے۔ وہ ایک پردہ تھی جس کا ہٹانا ضروری تھا۔"

سلطان نے مسکرا کر پوچھا۔ "اور جو وہ واپس ہو کر پھر پردہ بن جائے؟"

شیخ نے کہا "مجھے سلطان پر اعتماد ہے کہ وہ کروڑوں کا دلدار بننے کے فوائد سے آگاہ ہو کر پھر صرف ایک کا ہو کر نہ رہے گا۔"

سلطان نے کہا۔ "آپ کچھ اس سے بیزار سے معلوم ہوتے ہیں۔"

شیخ نے سر جھکا کر کہا۔ "ہاں جو شاہ کی امانت میں خیانت کی رغبت دلائے اس سے بیزاری ضروری ہے۔"

سلطان نے مسکرا کر پوچھا۔ "تو آپ نے امانت، امانت کی طرح رکھی؟"

شیخ نے سر جھکا کر کہا۔ "یہ ظل اللہ اس سے بھی دریافت کر سکتے ہیں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "اچھا تو آپ اسے آج شام یہاں بھیج دیں مگر واپس لینے کا مسئلہ اس سے گفتگو کے بعد ہی طے ہو گا!"

اور اسی دن شام کو جب گلگونہ اپنے پچھلے محل سرا میں آئی تو ایک خواص زرتار خلعت لائی کہ اسے زیبِ جسم کیجیے۔ سلطان بہ نفسِ نفیس شب میں تشریف لائیں گے اور آپ کا رقص دیکھیں گے۔

اور سلطان آیا اور گلگونہ نے اسے اپنے رقص سے اس قدر مسرور کیا کہ اس نے اس شعلہ جوالا کو اپنے قریب بلا کر کہا۔ "مانگ کیا مانگتی ہے کنیزِ خاص!" اور وہ اسے بڑے یقین کی نظروں سے دیکھنے لگا کہ وہ سلطان کے پہلو کے سوا اور کچھ مانگ ہی نہیں سکتی مگر گلگونہ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ "اپنا گھر اور شیخ کی کنیزی!"

سلطان کو محسوس ہوا جیسے گلگونہ نے اس کے شاہی گال پر طمانچہ مار دیا۔ وہ تلملا گیا مگر وہ بادشاہوں جیسا دل بھی رکھتا تھا اور شیخ سے معلمِ اخلاق کا شاگرد بھی تھا۔ اس نے کہا۔ "جا وہیں چلی جا! تجھ پر بھی میرے اُستاد کا جادو چل گیا!"

اور گلگونہ جب شیخ کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہ سجدے میں سر رکھے ہوئے کہہ رہا ہے۔ "میرے رب! مجھے قوتِ صبر عطا کر۔ گلگونہ کی جدائی مجھے بہت شاق ہے۔ اے میرے رحیم! صبر! صبر!"

گلگونہ نے جھک کر شیخ کے گال سے گال ملا کر کہا۔ "اور صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے!" شیخ نے سجدے سے سر اٹھایا، دو زانو بیٹھ کر تین بار "شکر! شکر! شکر!" کہا اور دونوں ہاتھ گلگونہ کی گردن کی طرف بڑھا دیے اور خزاں کی آغوش میں بہار آ گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

فلم

ڈائرکٹر دیر تک ایکٹر کو یہ سمجھاتا رہا کہ وہ دریا میں کب اور کس طرح کودے گا لیکن ایکٹر ضرورت سے زیادہ ہی بزدل نکلا۔ اس نے بے بسی سے کہا۔ "لیکن جناب! میں اتنی خطرناک چھلانگ آخر لگاؤں گا کس طرح؟"

"وہ کیوں؟" ڈائرکٹر نے اُسے گھورا۔ "تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟"

ایکٹر نے جواب دیا۔ "صرف اس لیے کہ مجھے تیرنا نہیں آتا۔"

ڈائرکٹر نے ہنس کر کہا۔ "یہ دردِ سر تمہارا نہیں، میرا ہے تم بالکل فکر نہ کرو۔ دریا میں کودنے کا منظر، فلم کا آخری منظر ہے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مروت

انٹرویو میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ دُھوپ اب تیز ہو چکی تھی اور جیب میں کل ساڑھے چھ آنے موجود تھے۔ اس لیے اتنی بھی گنجائش نہیں تھی کہ کسی چائے خانے میں بیٹھ کر وقت گزارا جائے لیکن زیادہ دیر تک سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کی نوبت نہ آئی۔ یک بارگی اسے نعمانی کا خیال آگیا۔ اُن دنوں وہ دفتر سے رُخصت لے کر گھر پر آرام کر رہا تھا۔ نعمانی کا مکان وہاں سے کچھ زیادہ دُور نہیں تھا۔ لہٰذا وہ اسی جانب چل دیا۔ اچاریا منیشن کی تیسری منزل پر اس کا فلیٹ تھا۔ دوپہر کی گرمی سے وہ پہلے ہی پریشان ہو رہا تھا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے اور بھی بُرا حال ہوگیا۔ آخر دروازے پر جاکر اس نے دستک دی، کسی نے بھاری لہجے میں دریافت کیا۔ ”کون ہے؟“

اس غیر مانوس آواز پر اسے تعجب تو ضرور ہوا لیکن نام بتانا ضروری تھا اس لیے کسی قدر اُونچی آواز میں اس نے جواب دیا۔

”میں ہوں انصار احمد!“

ذرا دیر تک خاموشی چھائی رہی، پھر اندر سے آواز آئی۔

”اندر آجائیے، دروازہ کھلا ہے۔“

وہ چپ چاپ کمرے میں داخل ہوگیا۔ سامنے کرسی پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اکڑوں بیٹھا ہوا اخبار پڑھنے میں منہمک تھا۔ اس نے انصار کی طرف نظریں اُٹھائے بغیر بڑی لاپروائی سے پُوچھا ”کہیے۔“

اس بے نیازی پر انصار جھنجھلا کر رہ گیا۔ اس نے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔ ”کیا نعمانی اندر ہیں؟“

لیکن وہ ادھیڑ عمر کا آدمی اس بات سے ذرا بھی مرعوب نہ ہو سکا، وہ اسی طرح پورے انہماک سے بیٹھا ہوا اخبار پڑھتا رہا اور اس کی طرف کسی توجہ کا اظہار کیے بغیر اسی انداز سے بولا۔ ”جی نہیں۔ کوئی ہفتہ بھر ہوا وہ یہ فلیٹ چھوڑ کر راولپنڈی چلے گئے، اب یہاں عبدالباری خاں رہتے ہیں۔ اگر ان سے ملنے کا ارادہ ہو تو تھوڑی دیر انتظار کیجیے، وہ دو بجے تک واپس آجائیں گے۔“

انصار کچھ سٹپٹا سا گیا۔ اس نے تجسّس آمیز نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ کمرہ تو وہی تھا مگر اس کا حلیہ بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ اس خواہ مخواہ کی ندامت سے زیادہ انصار کو اس بات کی کوفت تھی کہ وہ یہاں بیٹھ کر کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا لیکن اب تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ اس نے واپس جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”جی نہیں، مجھے تو صرف نعمانی صاحب سے کام تھا۔ معاف کیجیے گا، آپ کو بیٹھے بٹھائے زحمت دی۔“

اس دفعہ ادھیڑ عمر کے آدمی نے اخبار سے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا لیکن جواب میں اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا بلکہ خاموشی سے اس کے چہرے کی جانب اس طرح تکتا رہا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو لیکن انصار اب وہاں ٹھیرنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا وہ دروازے کی طرف چل دیا۔ ابھی وہ کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ پشت سے اس کی بھاری آواز اُبھری۔ ”ذرا ٹھیر جائیے۔“

انصار دہلیز پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ابھی تک

خدا کی بستی
کے خالق اُردو
کے مشہور ادیب
شوکت صدیقی کی
ایک کہانی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.Com

بغور اس کے چہرے کی جانب تک رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "یہاں آئیے۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے برابر رکھی ہوئی کرسی اس کی طرف بڑھا دی۔ "بیٹھ جائیے اس پر، میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

انصار چپ چاپ اس کے قریب چلا گیا لیکن وہ ادھیڑ عمر کا آدمی ابھی تک اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے اس انداز سے وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ اس شخص نے جیسے اس کی گھبراہٹ بھانپ لی

تھی۔ اس لیے نرمی کے ساتھ کہنے لگا۔ "بھئی پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، میں صرف اس قدر معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی کنپٹی پر جو بھورے کا سا سُرخ نشان ہے، یہ پیدائشی ہے یا کسی چوٹ کی وجہ سے پڑ گیا ہے؟"

انصار نے جواب دیا۔ "جی نہیں، یہ تو ہمیشہ سے اسی طرح ہے۔" لیکن اس کی سمجھ میں کوئی ایسی بات نہیں آئی جس سے وہ یہ اندازہ لگا سکتا کہ اس کے برابر بیٹھا ہوا — یہ ادھیڑ عمر کا آدمی اس سُرخ دھبے

★ دوسری کہانی

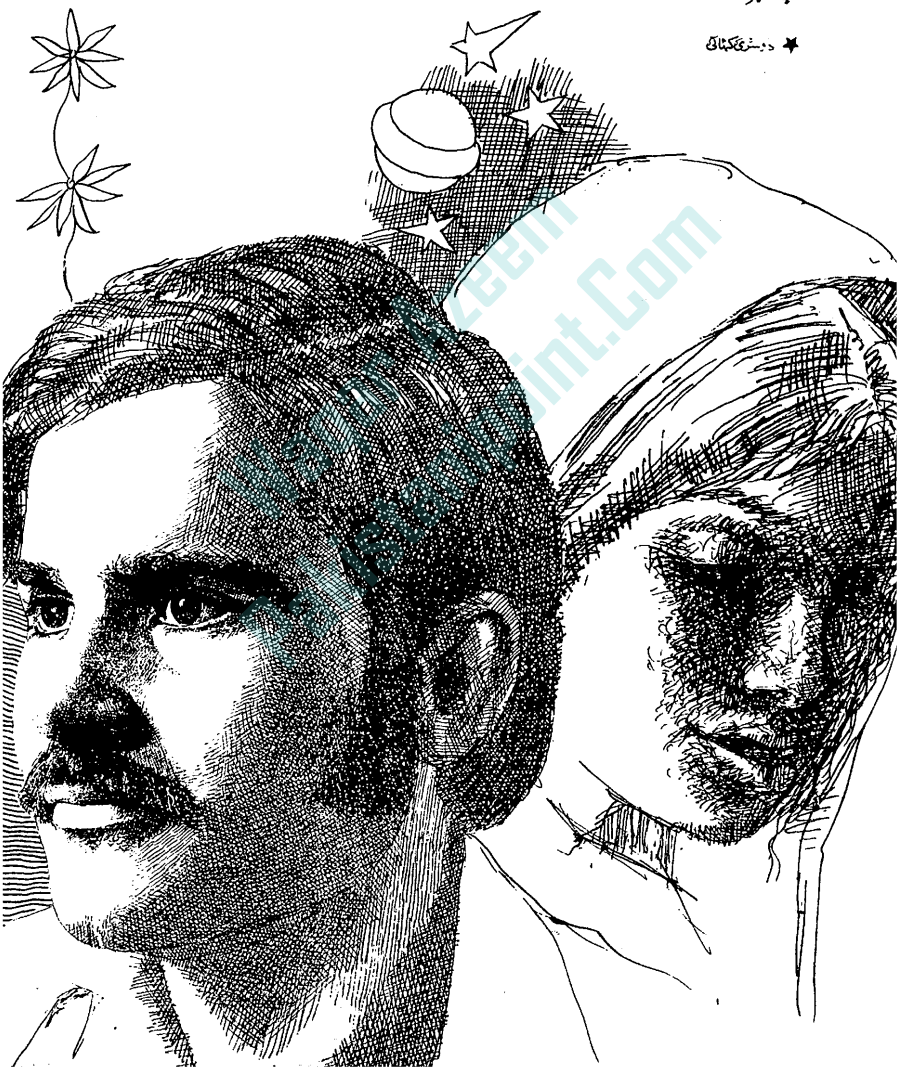

کے متعلق کیوں دریافت کر رہا ہے۔

لیکن وہ اس کی الجھن سے بالکل بے نیاز ہو کر زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے اخبار اٹھا کر ایک طرف ڈال دیا اور بڑے اطمینان آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ "معلوم ہوتا ہے اس نشان کے متعلق کسی نے اب تک آپ کو کچھ بتایا نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ لمحے بھر تک خاموش بیٹھا رہا۔ غالباً وہ انصار سے اس بات کی تائید کرانا چاہتا تھا مگر جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ بتانے لگا۔ "دراصل مجھے علمِ نجوم میں کچھ دخل ہے۔ البتہ اس بات کا خیال رکھیے گا کہ میں پیشہ ور نجومی نہیں ہوں۔ اس علم سے صرف شوقیہ لگاؤ ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ پدم ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا نصیبہ یاور ہے۔" پھر اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ "آپ کو جو کچھ ہونا چاہیے بظاہر اس کے کچھ آثار نظر نہیں آتے۔"

انصار کہنے لگا۔ "یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔" وہ اس کی باتوں سے اب خاصا متاثر ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس سے یہ بھی دریافت کر بیٹھا۔ "اچھا یہ تو بتائیے کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں جس انٹرویو کے لیے جا رہا ہوں۔ اس میں کیا ہوگا؟"

وہ آدمی ذرا دیر تک خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے میز سے کاغذ اور پنسل اٹھائی اور تھکے ہوئے انداز میں کہنے لگا۔ "اس وقت آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا ہے اس لیے ستاروں کی چال کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بہرحال آپ نے بات پوچھ ہی لی ہے تو کچھ نہ کچھ بتانا ہی پڑے گا۔"

پھر اس نے انصار سے اس کا پورا نام پوچھا اور تاریخِ پیدائش کے متعلق معلومات حاصل کیں اور کاغذ پر زائچہ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ انصار چپ چاپ بیٹھا اس کی تمام حرکتیں پوری توجہ کے ساتھ دیکھتا رہا۔ تھوڑی بعد اس نے گردن اٹھا کر انصار سے دریافت کیا۔ "ذرا یہ تو بتائیے کہ تمام پھولوں میں آپ کو کون سا پھول زیادہ اچھا لگتا ہے؟"

انصار لمحے بھر کو الجھن میں پڑ گیا۔ اس لیے کہ اس نے آج تک یہ غور ہی نہیں کیا تھا کہ کوئی ایسا بھی پھول ہے جو اسے سب سے زیادہ پسند ہے۔ پھر بھی جواب تو کچھ نہ کچھ دینا ہی تھا۔ لہٰذا اس نے کہہ دیا۔ "مجھے تو چنبیلی کے پھول زیادہ تر پسند آتے ہیں۔"

ادھیڑ عمر کے آدمی نے ایک بار پھر اسے زیرِ لب مسکرا کر دیکھا اور جس کاغذ پر اس نے زائچہ بنا کر تیار کیا تھا اسے الٹ کر اس کے سامنے کر دیا۔ ایک کونے میں پنسل سے یہ جملہ لکھا ہوا تھا۔ "چنبیلی کا پھول پسند کیا جائے گا۔" اب اس آدمی کے چہرے پر بے حد اطمینان جھلک رہا تھا۔ وہ کچھ عرصے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "بھئی یہ انٹرویو تو آپ کا کامیاب ہوتا نظر نہیں آتا۔"

انصار کے چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ وہ نظریں جھکا کر فرش تکنے لگا۔ وہ آدمی تسلّی دینے کے انداز میں کہنے لگا۔ "دیکھیے میں یہ بات دعوے سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ غیب کا حال تو خدا بہتر جانتا ہے، یہ تو صرف ہندسوں کا حساب ہے۔ آپ دل برداشتہ نہ ہوں۔ انٹرویو میں جا کر دیکھیے تو کیا ہوتا ہے۔"

لیکن اس حوصلہ افزائی سے انصار کچھ متاثر نہیں ہوا۔ آخر اس نے کچھ بھرائی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔ "اچھا یہ تو بتائیے کہ آیندہ کیا ہونے والا ہے؟"

وہ کہنے لگا۔ "ابھی تو آپ کا ستارہ بڑی گردش میں ہے۔ کچھ ٹھیک سے نہیں کہا جا سکتا۔ کسی وقت اطمینان سے ملیے گا تو آپ کا مکمل زائچہ تیار کروں گا۔" یہ بات کہنے کے بعد اس نے کاغذ اور پنسل اٹھا کر میز پر رکھ دی اور اخبار لے کر پھر سے پڑھنے لگا۔ یہ اس بات کی تائید تھی کہ گویا وہ اب مزید گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔ انصار کچھ عرصے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس سے اجازت لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔

سڑک پر آ کر اس نے محسوس کیا کہ دھوپ کی تپش اور تیز ہو گئی ہے اور اچاریا مینشن کی تیسری منزل پر بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر کے نجومی کا چہرہ راہ گیروں کی بھیڑ میں غائب ہوتا جا رہا ہے اور اس کی بھاری آواز شور و غل کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ البتہ اس کے ذہن میں کسی قدر کھلبلی ہو رہی تھی۔ دفتر پہنچ کر اس بات سے اس کو ذرا ڈھارس بندھی کہ امیدواروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن جب چپراسی نے اس کے قریب آ کر اندر جانے کے لیے کہا تو وہ گھبرا سا گیا۔ کمرے میں فرم کا اسسٹنٹ منیجر ایک لمبی سی میز پر کہنیاں ٹکائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ پستہ قد کا آدمی تھا لیکن عینک کے چوڑے فریم اور فرنچ کٹ داڑھی نے اسے کسی پروفیسر کی طرح بارعب بنا دیا تھا۔ اس نے بڑی متانت کے ساتھ انصار کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر سامنے میز پر رکھے ہوئے کاغذات دیکھنے لگا۔ انصار نے ایک ہی نظر میں یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ اس کی درخواست کا جائزہ لے رہا ہے جس پر جگہ جگہ سرخ پنسل کے نشان لگے ہوئے تھے۔ ذرا دیر بعد اس نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ انصار انٹرویو کے لیے خود کو آمادہ کرنے کے لیے سنبھل کر بیٹھ گیا لیکن خلافِ توقع اس نے بڑا عجیب سا سوال کیا۔ کہنے لگا۔ "آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

انصار نے ہچکچاتے ہوئے بتا دیا "گورکھپور!"

"کبھی دیوریا جانے کا بھی اتفاق ہوا؟"

اس دفعہ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "جی ہاں' کچھ عرصے تک ابا جان کے ساتھ وہاں رہ چکا ہوں۔ وہ ان دنوں دیوریا میں ریونیو آفیسر تھے۔"

اسسٹنٹ منیجر کے چہرے پر موہوم سی حیرت جھلکنے لگی "ذرا ان کا نام تو بتائیے؟"

اس نے جلدی سے بتایا "خان بہادر اشفاق احمد۔"

چوڑے فریم والی عینک کے پیچھے منیجر کی آنکھیں مسکراہٹ سے جھلملانے لگیں "غالباً میں ان سے مل چکا ہوں۔ آج کل وہ کہاں ہیں؟"

انصار بتانے لگا "اب تو وہ ریٹائر ہو چکے ہیں اور گورکھپور میں پریکٹس کر رہے ہیں۔"

"پھر تو آپ یہاں تنہا ہوں گے؟"

انصار کو اپنی کامیابی کی کچھ کچھ اُمید ہونے لگی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب بات ایک ایسے نکتے پر پہنچ گئی ہے کہ اسسٹنٹ منیجر کی وہ جس قدر بھی ہمدردی حاصل کر سکتا ہے کرے' اس کے لیے جھجکنے سے کام نہیں چلے گا۔ لہٰذا اس نے کہہ دیا "جی نہیں' سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ بال بچے ساتھ ہیں' ان کے علاوہ میری بیوہ ساس اور ان کا کنبہ بھی ہے۔" اس نے اپنی بات زیادہ سے زیادہ اثر انگیز بنانے کے لیے مبالغہ آرائی کی تکنیک پر بھی عمل کیا۔

فرنچ کٹ داڑھی والے منیجر کے چہرے پر یک بارگی سنجیدگی چھا گئی اس نے حسبِ توقع ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "نئی جگہ ہے، سینکڑوں طرح کی پریشانیاں ہیں۔ بہر صورت میں آپ کے لیے حتی الوسع کوشش کروں گا اس لیے کہ انتخاب تو جنرل منیجر کے مشورے سے ہوگا۔"

انصار نے جھٹ سے پوچھا "کب تک اس بات کا پتہ چلے گا؟"

"جلد ہی معلوم ہو جائے گا، آپ یہاں آکر پریشان نہ ہوں' ڈاک کے ذریعے اطلاع پہنچا دی جائے گی۔"

کمرے کے اندر ذرا دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر منیجر کی آواز اُبھری "اچھا اب آپ جا سکتے ہیں۔" انصار نے چلتے چلتے ایک بار پھر اپنی پریشانیوں کا اظہار کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ وزیٹرز روم میں رفیق اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ فرم میں اسٹینو ٹائپسٹ تھا۔ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگا "کہو بھئی کیا کر آئے؟"

انصار مسکرانے لگا "بھئی اُمید تو بہت معلوم ہوتی ہے۔ وہ تو ابا جان کا ملنے والا نکل آیا۔"

لیکن زیادہ باتیں کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اسی اثنا میں چپراسی نے آکر رفیق سے کہا "صاب بُلا رہے ہیں۔" اور وہ فوراً اندر چلا گیا۔ کوئی دس منٹ بعد جب وہ باہر آیا تو اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ انصار کو اس نے صاف صاف بتا دیا "بھئی تمہارا اندازہ تو غلط نکلا۔ وہ تو کسی اور کا اپائنٹ منٹ کر رہا ہے۔ یہ دیکھو آرڈر بھی ہو چکے۔" اس نے ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذ اس کے سامنے کر دیے۔

انصار ایک دم سے بُجھ کر رہ گیا۔ پھر اس نے بڑے اداس لہجے میں کہا "بھئی وہ تو بڑی ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا۔ میں نے تو اس سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ بال بچے دار ہوں اور عرصے سے بے روزگار ہوں۔"

رفیق جیسے یکبارگی اُچھل پڑا "یہی تو تم نے غضب کر دیا۔ اس کی چار لڑکیاں جوان ہو چکی ہیں جن کی شادی کے لیے وہ ہر وقت پریشان رہتا ہے۔ تم نے اُس کے متعلق مجھ سے کچھ معلوم تو کر لیا ہوتا۔ بڑی چُوک ہو گئی۔"

انصار کو جیسے یقین نہیں آیا۔ کہنے لگا "نہیں بھئی، ایسی کوئی بات نہیں' ہو سکتا ہے' وہ پہلے ہی سے طے کر چکا ہو جبھی تو اُس نے انٹرویو میں کوئی بھی قاعدے کا سوال نہیں کیا۔"

دونوں میں تھوڑی دیر تک اس بات پر بحث ہوتی رہی، آخر جب وہ وہاں سے واپس لوٹا تو بہت جھنجلایا ہوا تھا۔

گھر پہنچ کر وہ نڈھال سا بستر پر جا کر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی کسی بات پر بڑبڑاتی ہوئی کمرے کے اندر آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ پوچھنے لگی "کیا ہوا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ واپس لوٹ گئی۔ اس کے بعد وہ کئی بار کمرے میں آئی۔ ہر دفعہ انصار نے اس کے قدموں کی آہٹ محسوس کی لیکن دونوں میں کوئی بات نہ ہو سکی۔ وہ تمام دن کا بھوکا تھا اس لیے ہر بار اس کی آمد پر انصار کو یہ اُمید ہوتی تھی کہ شاید وہ کچھ کھانے کے لیے کہے گی لیکن ہر مرتبہ اسے ٹھیس پہنچتی۔ وہ خاموش لیٹا ہوا کروٹیں بدلتا رہا۔ گھر کے اندر ملی جلی آوازیں گونجتی رہیں۔ شام سے کچھ دیر پہلے آوازیں اچانک جیسے ٹھہر گئیں۔ اب فرید اپنے دفتر سے واپس آ گیا تھا۔ برابر والے کمرے میں اس کی بیوی فرید سے کہہ رہی تھی "بھائی جان! آج چپراسی تو آیا نہیں۔ سودا سلف بھی نہیں آیا، اب کیا ہوگا؟"

وہ اُونچی آواز میں تقریباً چیخ کر بولا "آخر یہ انصار کس مرض

کی دوا ہیں! کسی روز چپراسی نہ آسکے تو ان سے اتنا بھی نہیں ہوسکتا کہ جاکر راشن ہی لے آئیں؟ اب اگر ان سے اتنا بھی نہیں ہوسکتا تو پھر کیسے کام چلے گا؟"

اس کی بیوی اپنے بھائی کی ہاں میں ہاں ملانے لگی "آپ ہی ان سے کہیے، میں کچھ بولوں گی تو میرے سر ہو جائیں گے۔ انھیں تو سوائے ناراضی کے اور کچھ آتا ہی نہیں ہے۔"

انصار چپ چاپ لیٹا ہوا یہ تمام باتیں سنتا رہا، ہر بار جیسے اس کے پہلو میں نشتر سا لگتا اور وہ تلملا اٹھتا۔ آخر اپنی بے بسی پر اس کی آنکھیں نم ناک ہوگئیں۔ وہ غور کرنے لگا کہ وہ کب تک یہ طعنے سہتا رہے گا؟ کب تک وہ اس طرح ذلت برداشت کرتا رہے گا؟ آخر وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کوٹ کی جیبیں ٹٹول کر ملک عرفان علی کا پتہ تلاش کیا اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر گھر سے باہر چلا گیا۔

اتفاق سے ملک عرفان علی اپنی کوٹھی پر موجود تھے۔ انہیں ایک پرائیویٹ ٹیوٹر کی ضرورت تھی۔ ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر انھوں نے انصار کو ملازم رکھ لیا مگر ان کی بنیادی شرط یہ تھی کہ ان کی کوٹھی کے اندر ہی اسے رہنا پڑے گا۔ انصار نے یہ شرط بھی منظور کر لی۔ دوسرے روز جب وہ ضروری سامان لے کر آنے لگا تو بیوی نے استفسار کیا لیکن اس نے یہ کہہ کر اسے کسی حد تک مطمئن کر دیا کہ وہ مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے اس لیے کچھ دنوں کے لیے اپنے ایک دوست کے مکان پر جا کر رہے گا۔ یہاں بچّوں کے شور غل میں پڑھائی ٹھیک سے نہیں ہوگی۔ بات آئی گئی ہوگئی اور وہ ملک عرفان کے ساتھ رہنے لگا۔

ملک کے دو لڑکے تو کانونٹ میں ابتدائی تعلیم پا رہے تھے۔ دونوں خوب گول مٹول اور بے حد شریر تھے لیکن اس کا ہر طرح احترام کرتے تھے البتہ لڑکی بڑی کم سخن اور سنجیدہ تھی۔ وہ میٹرک کی تیاری کر رہی تھی۔ دن بھر میں وہ کئی بار سبق پڑھاتا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر ہر طرح کی باتیں کرتا۔ ملک صاحب کاروباری آدمی تھے اس لیے وہ زیادہ تر گھر سے باہر رہتے۔ انصار سے ان کی بہت کم ملاقات ہوتی البتہ کبھی کبھار رات کے وقت کھانے پر ان سے گفتگو ہو جاتی تو وہ سب کی پڑھائی کے متعلق دریافت کرتے اور اپنے کنبے کے ایک فرد کی طرح ہمیشہ اس کی ذات میں بھی دلچسپی کا اظہار کرتے۔

دوسرے ہی مہینے سے اس کی تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ ہوگیا۔ اب اس کی یہ ڈیوٹی ہوگئی تھی کہ صبح اٹھ کر بیگم صاحبہ کو اخبار کی سے خبریں پڑھ کر سنائے اور ان پر تبادلۂ خیالات کرے۔ یہ کام ایسا مشکل تو نہیں تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ بے حد باتونی واقع ہوئی تھیں۔ سیاسی حالات پر باتیں کرتے کرتے وہ اپنی ذاتی باتیں چھیڑ دیتیں جن میں عام طور پر اس بات کا گلہ ہوتا تھا کہ ملک صاحب ان سے بڑی بے اعتنائی برتتے ہیں۔ حالانکہ انصار یہ بات ماننے کے لیے آمادہ نہیں تھا پھر بھی اسے اس طرح کے دکھڑے سننا پڑتے لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ ان کا مزاج بہت اچھا تھا۔ کبھی انھوں نے ایسا رویہ اختیار نہیں کیا جس سے اس کی دل شکنی ہو بلکہ اس کی دیکھ بھال کے سلسلے میں وہ برابر مستعدی کا اظہار کرتیں، غرضیکہ انصار کو اس کوٹھی میں ہر طرح کی آسائش تھی۔ وہ خاصا مطمئن تھا۔ اب اس کی صحت بھی عمدہ ہوگئی تھی۔

انھی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک روز جب وہ تنخواہ کے روپے جیب میں ڈال کر بال بچّوں کے لیے کچھ سامان خریدنے گیا تو بس اسٹینڈ پر اسے ادھیڑ عمر کا وہ نجومی مل گیا جس سے اس کی پہلی ملاقات 'اجاریا مینشن' کی تیسری منزل کے ایک کمرے میں ہوئی تھی۔ اس دفعہ اس نے انصار کو کئی بار سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔ رخساروں سے پھوٹتی ہوئی سرخی، آنکھوں میں آب و تاب اور اعلا درجے کا سلا ہوا ہلکا سرمئی سوٹ سچ مچ وہ بڑا اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ حیرت زدہ ہو رہا تھا۔ آخر اس نے پوچھ ہی لیا "آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"ایک غیر ملکی فرم میں اسسٹنٹ منیجر ہو گیا ہوں۔"

وہ اس کے متعلق کچھ اور بھی معلوم کرنا چاہتا تھا اس لیے کہنے لگا "کیا تنخواہ مل رہی ہے؟"

لیکن انصار جیسے اسے مرعوب کرنے پر تلا ہوا تھا، بڑی بے نیازی سے بولا "فی الحال تو پانچ سو مل رہے ہیں۔"

وہ اس کی باتوں سے واقعی خاصا مرعوب ہوگیا۔ پھر دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک ریستوراں میں چلے گئے۔ اس نے ایک دفعہ پھر اس کا زائچہ تیار کیا اور بتانے لگا "ابھی تو آپ اور ترقی کریں گے مگر کوئی عورت ہے جو ناگن کی طرح آپ کی راہ میں حائل ہے! کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟"

لیکن انصار نے اس روز جیسے جھوٹ بولنے کی قسم کھائی تھی صاف مکر گیا "جی نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

وہ ذرا دیر تک خاموش بیٹھا غور کرتا رہا۔ پھر اس نے مشورہ دینے کے سے انداز میں کہا "خیر ایسا ہی ہوگا لیکن اگر کہیں ایسا سلسلہ

چل رہا ہو تو اسے ختم کر دیجیے۔"

انصار نے خواہ مخواہ اس کی تائید کرنے کی کوشش کی۔"جی ہاں میری منگنی تو ہو چکی ہے۔"

اور ادھیڑ عمر کا نجومی یک بارگی چونک پڑا۔"دیکھیے' اب آپ نے پتے کی بات بتائی۔ یہ رشتہ جس قدر جلد ہو سکے منقطع کر دیجیے البتہ کسی اور جگہ ہو سکے تو شادی کر لیجیے۔ پھر دیکھیے آپ کا ستارہ کس بلندی پر پہنچتا ہے۔"

مگر انصار نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی' کہنے لگا۔"جی نہیں ابھی تو کوئی ایسا ارادہ نہیں ہے۔"

لیکن وہ باز نہ آیا' اسے سمجھانے لگا۔"میں آپ ہی کی بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں۔ البتہ اتنا ضرور خیال رکھیے گا کہ شادی کرنے سے پہلے مجھ سے زائچہ بنوا لیجیے گا۔ اس لیے کہ خدانخواستہ اگر ستارے نہیں ملے تو پھر کوئی آفت بھی نازل ہو جائے تو تعجب نہیں۔"

اس موضوع پر وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آخر جب وہ ایک دوسرے سے رخصت ہونے لگے تو اس نے انصار سے دریافت کیا۔"یہ تو بتاتے جائیے کہ آج کل آپ رہتے کہاں ہیں؟"

انصار نے بتایا۔"میں اپنے خالو کے ساتھ مقیم ہوں۔"

اور اس نے ملک عرفان علی کا پتہ بتا دیا۔

اس نجومی سے رخصت ہو کر اس نے دکانوں پر جا کر سامان خریدا اور برابر یہ سوچتا رہا کہ ستاروں کی چال کا یہ حساب تو محض مسخرا پن ہے مگر یہ ادھیڑ عمر کا آدمی جو کچھ کہتا ہے' اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت تو ضرور ہوتی ہے۔ یہی سوچتا ہوا وہ سامان کے بنڈلوں سے لدا پھندا گھر پہنچ گیا۔ اب شام ہو چکی تھی۔ اس کی بیوی باورچی خانے میں بیٹھی کسی کام میں مصروف تھی۔ وہ خاموش بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ آئی تو انصار نے پیکٹ کھول کر ساری چیزیں اس کے سامنے بکھرا دیں۔ پھر اس نے ایک دوپٹا اٹھا کر کہا۔"کہو کچھ پسند آیا' خدا کی قسم' سارا بازار چھان مارا۔"

وہ اس کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگا لیکن حسب معمول اس دفعہ بھی اس نے بڑی سرد مہری سے جواب دیا۔"ہاں اچھا ہے' مگر بھابی کا پرسوں جو دوپٹا آیا ہے' نہ جانے کہاں سے انھوں نے خریدا ہے' نظر نہیں ٹھیرتی۔"

انصار کے پہلو میں جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو وہ دل برداشتہ ہو کر سوچنے لگا کہ آخر یہ مجھے اس طرح کمتر ثابت کرنے کی کوشش کیوں

کرتی ہے؟ ٹھیک ہے کہ فرید کو مجھ سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے لیکن اس میں سے کسی اور کو کیا مل سکتا ہے؟ آخر یہ عورت کب تک اپنے میکے کی بڑائی سے اس طرح اسے مرعوب کرتی رہے گی؟ وہ اسی طرح خاموش بیٹھا پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ باہر لان میں اختر کے رونے کی آواز ابھری۔ یہ اس کا پانچ سالہ لڑکا تھا۔ وہ فوراً باہر چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ فرید کی چھوٹی لڑکی اسے جھاڑیوں میں گرا کر منہ نوچ رہی تھی اور بھابی قریب ہی کرسی پر لیٹی ہوئی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھیں۔ ان کی اس بے نیازی پر کڑھتا ہوا وہ اختر کے پاس چلا گیا اور ننھی سے چھڑا کر جب انصار نے اسے علیحدہ کیا تو اس کے رخساروں پر خراشوں سے خون چھلک آیا تھا۔ وہ پھر بھی چپ رہا لیکن جب ننھی نے اس کے سامنے اختر پر جھپٹ کر دوبارہ اس کا منہ نوچا تو وہ بے قابو ہو گیا۔ اس نے ننھی کی پیٹھ پر دھمکانے کے لیے آہستہ سے ایک تھپڑ لگایا اور اختر کو ساتھ لے کر کمرے میں آ گیا۔ پھر شام کے سناٹے میں ننھی کی تیز چیخیں ابھرنے لگیں اور اس کے ساتھ ہی بھابی بڑبڑانے لگیں۔ اس نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ بسکٹ کا پیکیٹ کھول کر اختر کو بہلانے لگا۔ البتہ جب اس کی بیوی اختر کو پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی بھابی کے سامنے لے گئی تو اسے بھی غصہ آ گیا۔

بات قطعی معمولی سی تھی مگر اس نے جلد ہی ہنگامے کی صورت اختیار کر لی۔

جب وہ دروازے سے باہر نکل رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سامنے کے مکانوں سے عورتیں حیرت زدہ سی کھڑی اسی جانب دیکھ رہی تھیں اور اندر اس کی بیوی زور زور سے چیخ رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی وہ اپنی قسمت کا گلہ کر رہی تھی اپنے ماں باپ کو کوسنے دے رہی تھی اور اسے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ یوں تو اس قسم کے جھگڑے اکثر دونوں کے درمیان ہو جاتے تھے مگر اس روز اسے رہ رہ کے خیال آ رہا تھا کہ سچ مچ اس کی بیوی ناگن ہے اسی عالم میں جب وہ ملک عرفان

علی کی کوٹھی پر پہنچا تو بیگم صاحبہ دروازے ہی پر مل گئیں۔ اس کو پریشان دیکھ کر کہنے لگیں "کیا ہوا ہے تمہارا چہرہ اس قدر اترا ہوا کیوں ہے؟"

وہ اس وقت کسی سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے صاف بہانا کر دیا۔ "کچھ نہیں، طبیعت سست ہو رہی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس نے دیکھا کہ بیگم صاحبہ ڈاکٹر کے ہمراہ دروازے پر کھڑی ہیں چنانچہ اسے خواہ مخواہ کڑوی کسیلی دوا پینی پڑی اور رات گئے تک وہ کئی بار اس کی طبیعت کا حال کمرے میں آکر خود دریافت کر گئیں لیکن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ رات گئے اُسے کچھ حرارت ہو گئی۔ دوسرے روز بخار کچھ اور تیز ہو گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ملیریا ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں پھر بھی ہر طرح اس کی دیکھ بھال ہوتی رہی۔ بچوں کی طرح اس کی ناز برداری کی جاتی۔

ابھی بیماری سے چھٹکارا انہیں ملا تھا کہ ایک روز سہ پہر میں ادھیڑ عمر نجومی آگیا۔ ہمیشہ کی طرح اس ملاقات میں بھی وہ اس کی آنے والی خوش حالی کے متعلق بہت باتیں بتاتا رہا۔ متوسط طبقے کے عام نوجوانوں کی طرح جس نے زندگی بھر صرف سہانے خواب ہی دیکھے تھے، یہ تمام باتیں بڑی مسرت بخش تھیں۔

اسی گفتگو کے دوران میں ادھیڑ عمر کے آدمی نے تجسس آمیز نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا اور پھر جیب سے ایک فوٹو نکال کر انصار کے سامنے کر دیا۔ یہ کسی لڑکی کی تصویر تھی۔ اس نے پہلی ہی نظر میں یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ بے حد خوبصورت ہے لیکن وہ اسے پوری توجہ کے ساتھ نہ دیکھ سکا بلکہ کسی قدر شرما کر اُس نے نگاہیں موڑ لیں اور اس سے دریافت کرنے لگا "کس کا فوٹو ہے؟"

وہ بتانے لگا "میں نے اس لڑکی کو آپ کے لیے پسند کیا ہے۔ اس کا ستارہ آپ سے ملتا ہے۔ اگر آپ دونوں کا رشتہ ہو جائے تو پھر دیکھیے گا کہ آپ کی زندگی میں کتنا بڑا تغیر نمودار ہو گا۔ بجلی کے دونوں تار مل کر جس طرح روشنی پیدا کر دیتے ہیں اسی طرح آپ کا ستارہ روشن ہو جائے گا۔" اور پھر وہ بے ساختہ ہنسنے لگا۔

انصار کچھ پریشان سا ہو گیا اس لیے کہ اس مسئلے پر اس نے ابھی تک سنجیدگی سے کچھ غور ہی نہیں کیا تھا۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بے حد نالاں ہو چکا تھا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھائے جو سب کے لیے عذاب بن جائے۔ کچھ یہی سوچ کر اس نے پہلو تہی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ "دراصل یہ ایسی بات ہے جس کا جواب میں فوری طور پر نہیں دے سکتا۔"

وہ بڑی بے تکلفی سے کہنے لگا "کوئی مضائقہ نہیں۔ بہتر یہ ہو گا کہ آپ مجھے اپنے خالو جان سے ملوا دیں۔ سچ پوچھیے تو یہ باتیں انھی سے طے کرنے کی ہیں۔" انصار یک بارگی گھبرا سا گیا۔ اس نے سوچا، اگر کہیں ایسا ہو گیا تو بڑی مشکل پڑ جائے گی۔ اس نے فوراً یہ عذر پیش کر دیا۔ "خدا کے لیے کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا۔ سچ پوچھیے تو بات یہ ہے کہ میں نے جس منگنی کا ذکر کیا تھا، وہ انھی کے ہاں تو ہوئی تھی کہیں انھیں یہ بات معلوم ہو گئی تو ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ میں دراصل اس سلسلے میں اپنے گھر والوں سے خط لکھ کر مشورہ کروں گا۔" خیریت ہوئی کہ اس طرح بات بن گئی۔

وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آخر وہ ادھیڑ عمر کا آدمی دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد ملک صاحب کی بڑی لڑکی آگئی۔ بہت سی باتیں کرنے کے باعث وہ کچھ تھک سا گیا تھا۔ اس نے آکر انصار کو دوا دی اور جس طرح خاموشی سے آئی تھی، اسی طرح واپس چلی گئی۔ وہ بے حد خاموش قسم کی لڑکی تھی۔ اس کے ہر انداز میں گھریلو پن نمایاں تھا۔ عرصۂ دراز بعد انصار نے اسے پوری توجہ سے دیکھا تھا اور یہ محسوس کر کے اسے ہنسی آگئی تھی کہ وہ اسے اپنی منگیتر بتا چکا ہے۔

انصار ملیریا سے جلد ہی صحت یاب ہو گیا لیکن اسے اس بات کا قطعی طور پر اندازہ ہو گیا کہ ملک عرفان کے گھر کا ہر فرد اسے اپنے ہی کنبے کے لوگوں کی طرح سمجھتا ہے بلکہ علالت کے دوران میں جس طرح مستعدی کے ساتھ اس پر توجہ دی گئی تھی، دیکھ بھال تو وہ اپنی بیوی کی موجودگی میں بھی نہیں پا سکتا تھا۔ یہ اور ایسی ہی اور باتوں نے مل کر اسے ملک عرفان علی کے گھرانے کے ساتھ ایک وابستگی پیدا کر دی۔ اب وہ زیادہ تر وہیں سے سبق کو پڑھاتا اور بیگم صاحبہ کی باتوں میں پوری دلچسپی کا اظہار کرتا۔ یہ لگاؤ کچھ اس طرح بڑھتا گیا کہ اب وہ بیوی بچوں سے ملنے کے سلسلے میں بھی بڑی لاپروائی برتنے لگا۔ حسب وعدہ ادھیڑ عمر کا نجومی دوبارہ وہاں آگیا۔ اس دفعہ اسے دیکھ کر وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اس لیے کہ وہ اس کی آمد و رفت زیادہ نہیں بڑھانا چاہتا تھا لیکن اس روز اس کے لباس میں خاصا اہتمام تھا اور وہ بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ جلد ہی حرفِ مطلب پر آگیا۔

"کہیے کیا طے کیا آپ نے؟ دراصل مجھے سب سے زیادہ دلچسپی اس بات میں ہے کہ میں اپنے علم کی آزمائش چاہتا ہوں۔ آپ کے زائچے پر یقین مانیے میں نے بڑی محنت کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا کوئی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.Com

خاطر خواہ نتیجہ نکلے۔"

اس دفعہ انصار نے کسی تکلف سے کام نہیں لیا بلکہ بڑی بے باکی سے پوچھنے لگا "پہلی بات یہ ہے کہ میں ان لوگوں کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں جن کی طرف سے آپ نمایندگی کر رہے ہیں۔"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا "یہ نمایندگی کی بات آپ نے بالکل درست کہی، واقعہ بھی یہ ہے، انھوں نے مجھے ہر طرح کی اجازت دے دی ہے۔ وہ میرے بڑے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ یہاں ایک کارخانے میں اکاؤنٹنٹ ہیں۔ خاندانی آدمی ہیں، خوش اخلاق اور وضع دار ہیں، لڑکی کی تعلیم تو زیادہ نہیں ہے لیکن بے حد سگھڑ اور سلیقہ مند ہے اور پھر اس کا ستارہ، خدا کی قسم، میں نے اس کا زائچہ بنا کر دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ اللہ میاں نے کیا قسمت بنائی ہے۔"

انصار اس کی باتوں میں پوری دل چسپی لیتا رہا مگر آج وہ طے کر چکا تھا کہ کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ ختم ہی کر دیا جائے گا اس لیے اس نے بڑی ٹیڑھی سی شرط اس کے سامنے رکھ دی کہنے لگا "دیکھیے میرا ابھی تو کوئی ایسا ارادہ نہیں۔ البتہ یہ ضرور سوچتا ہوں کہ کسی طرح اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے کچھ عرصے کے لیے انگلستان چلا جاؤں مگر مشکل یہ ہے کہ میرے پاس اب تک کل دو ہزار روپے اکٹھے ہوتے ہیں، خالو جان سے اس سلسلے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا ورنہ وہ تو خوشی سے تیار ہو جائیں گے، آپ نے تاکید کی ہے کہ یہ منگنی راس نہیں آئے گی اس لیے اب مسئلہ یہ درپیش ہے کہ اگر مجھے دس ہزار روپے مل جائیں تو میں پوری طرح آمادہ ہوں ورنہ سر دست میں نے یہ پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔"

ادھیڑ عمر کا آدمی خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہو گئی۔ وہ دیر تک بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ آخر انصار نے خود ہی کہا "آپ خواہ مخواہ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ ان سے مشورہ کر کے بتائیے گا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے کوئی بے جا شرط تو نہیں پیش کی۔"

وہ کہنے لگا "یہی تو میں بھی غور کر رہا ہوں۔ آپ کا مطالبہ بھی کسی حد تک درست ہے لیکن یہ ممکن بھی ہے کہ نہیں۔" وہ ایک بار پھر گہری خاموشی میں غرق ہو گیا۔ انصار اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ اس کی پریشانی سے اچانک اسے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ کہیں یہ اس شخص کا ذاتی معاملہ تو نہیں؟ اسی اثنا میں اس نے کسی قدر بیٹھی ہوئی آواز میں کہا "میرا خیال ہے کہ وہ اس بات پر رضامند ہو جائیں گے مگر اتنا خیال رکھیے کہ انگلستان جانے سے قبل آپ کو تمام رسوم ادا کرنا پڑیں گی۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آخر ان کے اطمینان کے لیے بھی تو کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیے۔"

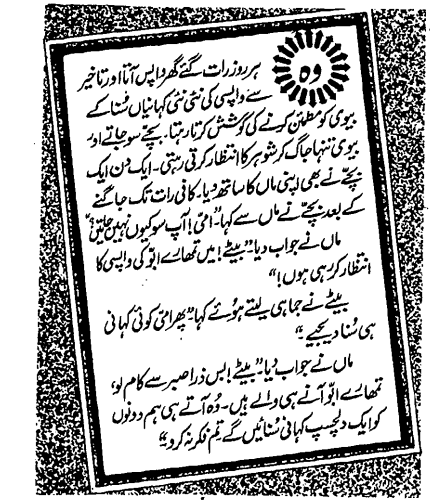

انصار نے بے جھجک یہ بات قبول کر لی۔ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ یہ شرط کسی ایسے شخص کے لیے پوری کرنا ناممکن ہے جو کسی کارخانے میں اکاؤنٹنٹ کا کام کر رہا ہو۔ اب اس کے جانے سے پہلے انصار نے احتیاطاً یہ طے کر لیا کہ اسے یہاں بلانے کے بجائے وہ خود اس کے پاس پہنچ جائے۔ اس نے اس سے پتہ پوچھا۔ ادھیڑ عمر کا نجومی کہنے لگا "میں شام کو عام طور پر لارنس ریستوران میں بیٹھتا ہوں، آپ وہاں مجھ سے مل لیں ورنہ میں خود چلا آؤں گا۔ آپ میری پریشانی کا خیال نہ کریں۔" اور پھر وہ واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے باہر نکلنے کے بعد انصار نے سوچا کہ شاید اب یہ نجومی قسم کا آدمی دوبارہ نہیں آئے گا اور اگر آیا بھی تو کسی ایسے پروگرام پر گفتگو کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اس روز شام کو وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ خلافِ توقع ملک صاحب آ گئے۔ اسے اس طرح بستر پر لیٹے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے "کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟"

وہ کہنے لگا "جی نہیں، باہر جانے کا ارادہ نہیں تھا، اس لیے یہاں چلا آیا۔"

وہ ہمدردی کے سے انداز میں بولے "میں دیکھ رہا ہوں کہ ادھر تم کچھ سست نظر آ رہے ہو۔"

ظاہر ہے کہ وہ اپنی الجھنیں ان کے سامنے کس طرح بیان کر سکتا تھا لہٰذا بات ٹال گیا "ایسی تو کوئی بات نہیں بلکہ آپ کے ہاں اس قدر آرام اور سکون حاصل ہے کہ میں اس شہر میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

وہ ہنسنے لگے "تم مجھے خواہ مخواہ شرمندہ کر رہے ہو۔ یقین مانو،

وہ

ہر روز رات گئے گھر واپس آتا اور تاخیر سے واپسی کی نئی نئی کہانیاں سنا کے بیوی کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ بچے سو جاتے اور بیوی تنہا جاگ کر شوہر کا انتظار کرتی رہتی۔ ایک دن ایک بچے نے بھی اپنی ماں کا ساتھ دیا۔ کافی رات تک جاگنے کے بعد بچے نے ماں سے کہا "امی! آپ سو کیوں نہیں جاتیں؟"

ماں نے جواب دیا "بیٹے! میں تمھارے ابو کی واپسی کا انتظار کر رہی ہوں!"

بیٹے نے جماہی لیتے ہوئے کہا "پھر امی کوئی کہانی ہی سنا دیجیے۔"

ماں نے جواب دیا "بیٹے! بس ذرا صبر سے کام لو، تمھارے ابو آنے ہی والے ہیں۔ وہ آتے ہی ہم دونوں کو ایک دلچسپ کہانی سنائیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔"

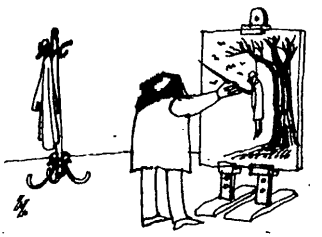

میں تمھارے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں تم پریشان نہ ہو، انشاء اللہ سب بہتر ہی ہوگا وقت آنے پر تمھیں خود ہی علم ہو جائے گا کہ مجھے تمھارا کتنا خیال ہے۔" وہ اسی طرح کی اور بہت سی باتیں کر کے چلے گئے لیکن وہ دیر تک اس گفتگو پر غور کرتا رہا۔ پھر اسے رفتہ رفتہ یہ محسوس ہونے لگا کہ بیگم صاحبہ بھی روز بروز اس پر مہربان ہوتی جارہی ہیں۔ بچے اب اسے ماسٹر صاحب کے بجائے بھائی جان کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ان تمام باتوں پر اس نے بڑے جذباتی انداز سے سوچنا شروع کر دیا اور ایک روز جب گھر پر بیوی سے پھر اس کی ان بن ہوگئی تو اسی جھنجلاہٹ میں اس نے طے کیا کہ اب وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر ڈالے گا۔ اس لیے کہ خانگی زندگی اس کے لیے اس قدر عذاب بن چکی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس سے نجات پا لینے ہی میں اپنی بہتری سمجھنے لگا۔

رات گئے تک وہ بے چینی سے جاگتا رہا۔ آخر اس نے بہت کچھ سوچ کر بیگم صاحبہ کے نام خط لکھا جس میں اس نے دبی زبان سے اس بات کا اظہار کر دیا کہ اگر اسے بہ حیثیت داماد قبول کر لیا جائے تو وہ ہمیشہ کی طرح ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا لیکن تمام دن وہ یہ خط لیے کر بیٹھا رہا۔ دراصل ابھی تک وہ کوئی فیصلہ کن بات طے نہیں کر سکا تھا۔ آخر اس نے رات کا کھانا کھانے کے بعد بیگم صاحبہ کو جراَت کر کے اپنا خط دے ہی دیا۔ یہ رات بھی بے چینی میں کٹی۔ کچھ تو ادھیڑ عمر نجومی کی بات اور کچھ ملک صاحب کے برتاؤ سے اسے یقین تھا کہ نتیجہ کچھ نہ کچھ بہتر ہی نکلے گا۔

لیکن صبح یہ دیکھ کر اسے تعجب ہوا کہ نہ تو دونوں لڑکے پڑھنے کے لیے اس کے پاس آئے اور نہ بیگم صاحبہ نے اسے بلوایا۔ البتہ دن چڑھے ملک صاحب خود اس کے کمرے میں آئے ان کے ماتھے پر بل دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ وہ ذرا دیر خاموش کھڑے رہے پھر انھوں نے جیب سے ایک سو بہتر روپے نکال کر اس کے سامنے ڈال دیے اور آہستہ آہستہ کہنے لگے۔ "یہ آپ کی تنخواہ ہے شام تک آپ کمرہ خالی کر کے اپنا کہیں اور انتظام کر لیجیے۔"

اور پھر کسی جواب کا انتظار کیے بغیر وہ تیزی سے کمرے کے باہر چلے گئے انصار یک بارگی سناٹے میں آگیا۔ اس نے بیگم صاحبہ سے ملنا چاہا تو وہ اس قدر ناراض تھیں کہ انھوں نے یہ بھی گوارا نہ کیا بہرحال اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے گھر واپس چلا جاتے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

گھر جاکر کئی روز تک وہ اسی کوفت میں بے حد اداس اداس رہا۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے کرتے اسے نجومی کا خیال آگیا۔ اس نے سوچا کہ کہیں وہ ملک صاحب کی کوٹھی پر نہ پہنچ جائے اور ان سے اس کی ملاقات ہو جائے۔ یہ تو اور بھی برا ہوگا اس لیے کہ وہ ان کی نظروں میں اس قدر ذلیل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس روز شام کو وہ لوٹس ریستوراں پہنچا مگر ادھیڑ عمر کا نجومی موجود نہیں تھا اس نے منیجر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کئی روز سے یہاں نہیں آرہا ہے۔ پھر اس نے مزید معلومات کے لیے پوچھا۔ "وہ کس دفتر میں ملازم ہیں؟"

تو یہ سن کر اسے تعجب ہوا کہ وہ منگھوپیر کے کسی کارخانے میں اکاؤنٹنٹ ہیں لیکن وہ اس روز کسی نہ کسی طرح اس سے ضرور مل لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کے گھر کا پتہ معلوم کر کے وہ وہیں پہنچ گیا گھر پر سب لوگ پریشان تھے۔ اس لیے کہ کل صبح سے اب تک وہ گھر نہیں پہنچا تھا یہ دیکھ کر اسے بہت دکھ ہوا کہ اس کے کئی چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور گھر پر پاس پڑوس کے لوگوں کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں تھا کہ اس کی تلاش میں پوری تن دہی سے کام لے۔

جب وہ وہاں سے لوٹا تو اس کے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ راستے میں اس نے شام کو شائع ہونے والا اخبار خریدا اور اسے پڑھنے لگا۔ اچانک اخبار کے ایک گوشے میں اس کی نظر پڑی تو وہ چونک پڑا۔ پاسپورٹ سائز کے ایک فوٹو کے نیچے یہ عبارت تحریر تھی۔ "یہ شخص بیس ہزار روپے کا غبن کر کے فرار ہو گیا ہے۔ پولیس اس کی تلاش میں ہے جو کوئی اس کی گرفتاری میں اعانت کرے گا اسے مبلغ ایک ہزار روپیہ بطورِ انعام پیش کیا جائے گا۔"

یہ اشتہار کسی فرم کی جانب سے شائع کیا گیا تھا۔ انصار نے فوٹو غور سے دیکھا۔ یہ ادھیڑ عمر کے نجومی کی تصویر تھی۔

بینڈ باجے والے جوکروں کی سی وردیوں میں ملبوس کوٹھی کے برآمدے میں اکتائے ہوئے سے بیٹھے بیڑیاں پی رہے تھے۔ ان کی نفیری اور شہنائیاں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ایک قطار میں پڑی تھیں۔ بینڈ ماسٹر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد شاید گھر والوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے اپنے نقارے پر ایک ہلکی سی چوٹ لگا دیتا تھا مگر اندر تو دعوت

ہمارے خاندان کی ایک داستان

اردو کے ممتاز افسانہ نگار

ہیرانند سوز کی تحریر

ان لوگوں کا افسانہ جنہیں موت نہیں آتی

تیسری کہانی

اس لڑکی کی کہانی جو ہماری بہن ہے کچھ اور نہیں

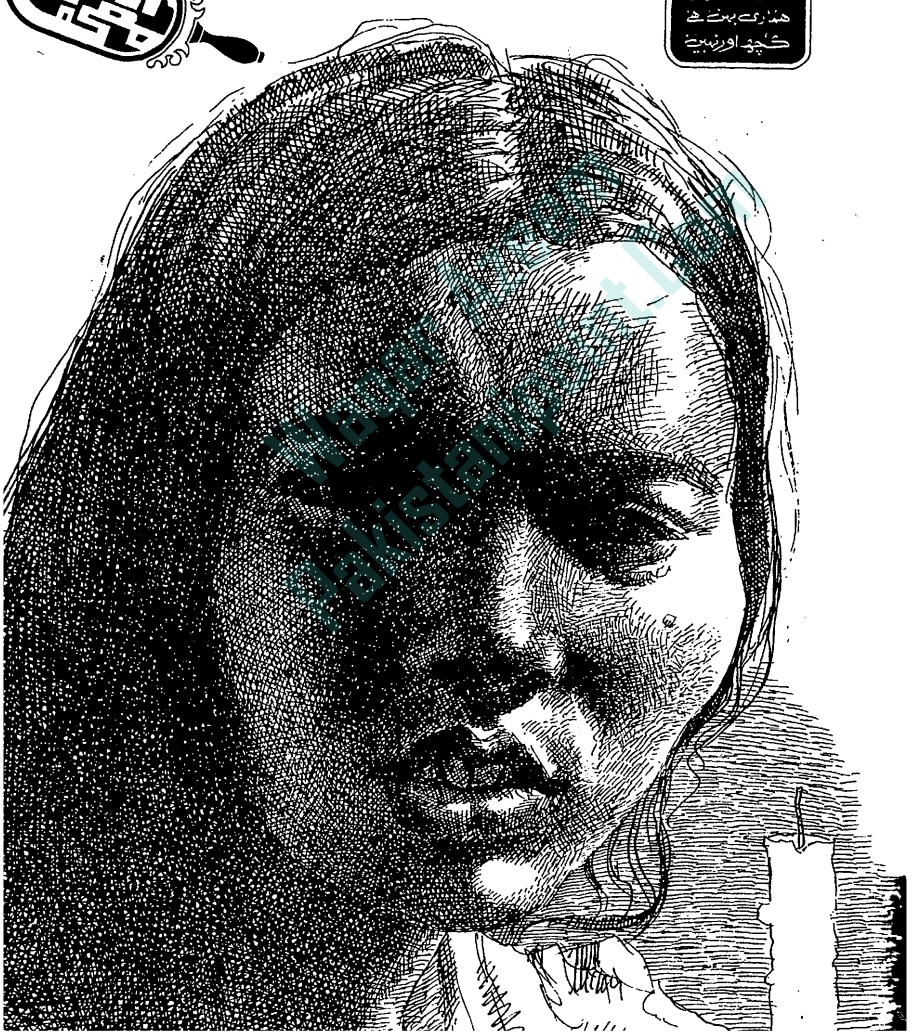

ابھی پورے جوبن پر تھی۔ مہمان ڈٹ کر کھا رہے تھے اور ان کی پلیٹیں بار بار مٹھائیوں سے بھر دی جاتی تھیں اور ہر مہمان سے تھوڑا سا اور کھا لینے کے لیے بار بار اصرار کیا جا رہا تھا۔ جیسے دعوت نہیں، کھانے کھلانے کی کوئی جنگ ہو رہی ہو۔ مٹھائیوں کے علاوہ سب کے سامنے گرم گرم دودھ کے گلاس بھی بھر کے رکھے تھے، وہ بھی ابھی اُن سب کو پہنچنے تھے۔ ریت ہی ایسی تھی۔ لڑکے کا بڑا بھائی اور بھاوج دونوں گلابی رنگ میں نہائے بیٹھے تھے۔ باقی مہمانوں پر بھی گلابی رنگ بڑی فراخ دلی سے چھڑکا گیا تھا۔ خاطر و مدارات کے ساتھ ساتھ اُن سب سے مذاق بھی ہو رہا تھا۔ چنانچہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کسی برجستہ فقرے پر صحن کی فضا قہقہوں سے گونج اٹھتی تھی۔

سوما اپنے کمرے میں بیٹھی کھڑکی کی جالی سے یہ سب تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں مٹھائیوں اور خشک میووں سے بھرے ہوئے چالیس تھال رنگ برنگ کاغذوں سے ڈھکے تخت پر رکھے تھے اُدھر ایک کونے میں تپائی پر پڑا ہوا ایک بڑا تھال کرنسی نوٹوں سے لدا ہوا تھا۔ دس دس روپے کے نئے نوٹوں کے تین بنڈل اُس میں بڑے قرینے سے دھرے تھے۔ اس کا چھوٹا بھائی مدن ابھی منڈی سے پھلوں کے ٹوکرے لے کر نہیں لوٹا تھا۔ اس کے آنے پر ہی اس کا شگن یہاں سے روانہ ہونا تھا۔

سوما کے لیے یہ تماشا نیا نہیں تھا۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ کتنی ہی دفعہ اس کی منگنی کا جلوس اسی طرح شان و شوکت سے نکالا گیا تھا لیکن یہ بیل اب تک منڈھے نہیں چڑھ سکی تھی جیسے ہی اس کی شکل و صورت کے بارے میں کچھ چرچا ہونے لگتا، منگنی کا شگن واپس آ جاتا۔ سوما کی زندگی کا یہ سب سے بڑا المیہ تھا کہ وہ بدصورت تھی۔ بھدّے نقوش اور گہرے سانولے رنگ والی یہ لڑکی اپنے خوبصورت دل اور روشن دماغ کے باوجود ابھی تک کسی کو پسند نہیں آئی تھی۔ اوّل تو لڑکے والے اُسے دیکھتے ہی رشتے سے کنّی کترا جاتے یا پھر اگر کسی جگہ اس کی بدصورتی کی طرف سے آنکھیں بند کروا کر یا اپنی امارت کے بل بوتے پر اس کا رشتہ کر بھی دیا جاتا تو بھید کھلتے ہی اس کی سسرال میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ لڑکا باغی ہو کر گھر سے بھاگ نکلتا اور رشتہ ٹوٹ جاتا۔ ایسا تین بار ہو چکا تھا۔ اس کا باپ اچھا کھاتا پیتا اور حوصلہ مند آدمی تھا۔ اس نے ہر چند اُسے سونے اور چاندی میں مڑھ کر دینا چاہا مگر اس پر بھی سب کو یہ سودا گھاٹے کا معلوم ہوا۔ خوبصورتی کی اپنی جو ایک الگ قیمت ہے، وہ کسی طرح بھی مال و زر سے چکائی نہ جا سکی۔ اس لیے پچیس سال کی ہو چکنے پر بھی سوما ابھی تک بن بیاہی تھی۔ وہ پہاڑ گنج کے ایک پرائیویٹ گرلز ہائی اسکول میں اسکول مسٹریس بن کر اپنی جوانی کاٹ رہی تھی۔ تین سو روپے مہینہ تنخواہ پاتی تھی اور اپنے والدین پر کسی طرح کا بوجھ نہیں تھی لیکن اس کی شادی کر دینا تو ان کا ایک سماجی اور اخلاقی فرض تھا۔ وہ اُس سے سبک دوش ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے اس سلسلے میں سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ اس نئے رشتے کی بات ابھی پچھلے ہفتے ہی اُن کے گھر میں چلی تھی۔ لڑکے کی دونوں بھاوجیں شگن سے پہلے اُسے آ کر دیکھ بھی گئی تھیں اس کے باوجود اُن کی طرف سے "ہاں" ہو گئی تھی اور آج دھوم دھام سے اس کی منگنی کا شگن دیا جا رہا تھا۔

سوما حیران تھی کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ اسے دیکھ لینے کے بعد بھی ان لوگوں نے ہاں کیوں کر دی؟ کہیں وہ بھاوجیں ہی تو گھر میں اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے اسے اپنے چھوٹے دیور کے سر نہیں منڈھ رہیں؟ ممکن ہے اُنھوں نے گھر جا کر اس کی جھوٹی تعریف کی ہو اور اس گھر سے اچھا جہیز ملنے کے لالچ میں اپنے گھر والوں کو یہ رشتہ لینے پر راضی کر لیا ہو؟

احساسِ کمتری نے سوما کے دل میں کئی وسوسے پیدا کر دیے تھے۔ اس کا دل ایک انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔ بار بار کے انکار نے اس کے اندر اس مسئلے کا روشن پہلو دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہنے دی۔ بدصورتی کے منحوس سائے اس کی سوچوں پر بہت گہرے ہو چکے تھے اس لیے اس کا دماغ ہمیشہ اندھیرے ہی کی طرف لپکتا تھا۔ روشنی میں اس کے خیالات کی آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ اس وقت بھی جب کہ سب کچھ ٹھیک طرح — ہو رہا تھا، اسے حالات کی مخالف لہر ہوا بن کر ڈرا رہی تھی اور وہ اپنے غیر یقینی مستقبل سے خوف زدہ ایک کونے میں دبکی بیٹھی تھی۔

مہمان دعوت اُڑا کر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ مدن بھی پھلوں کے ٹوکرے لے کر پہنچ گیا تھا اور شگن کے تھال اب لڑکے والوں کو سنبھلوائے جا رہے تھے۔ اتنا بھاری شگن دیکھ کر سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں مگر اس کا باپ اب بھی سب کے سامنے اپنی عاجزی اور کم مائگی کا اظہار کر رہا تھا۔ اسے اپنے بوڑھے باپ پر رحم آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور اپنے لیے اس کے اندر نفرت کا جذبہ جاگ اُٹھا۔ وہ اپنے آپ کو مجرم تصور کرنے لگی۔ جیسے بدصورتی

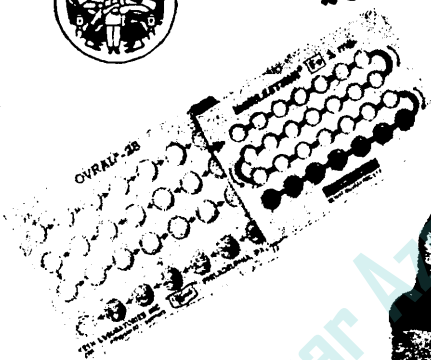

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

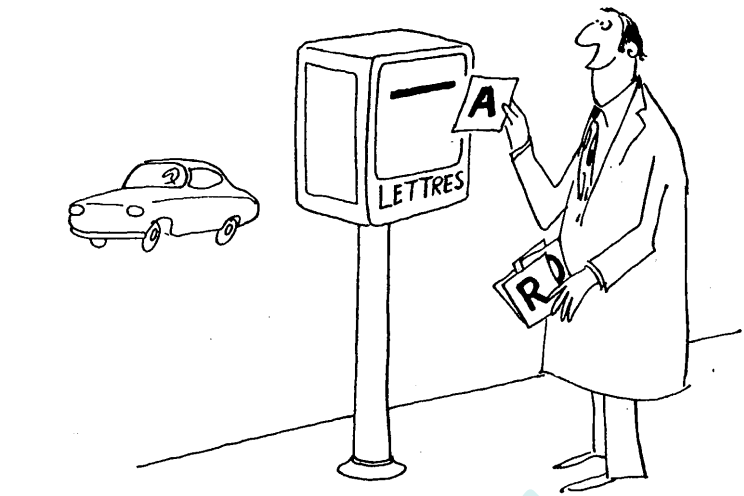

اس کا اپنا ہی گناہ تھا جس کی وجہ سے اس کے باپ کی بار بار ہیٹی ہو رہی تھی۔ کاش! وہ یہ سب کچھ دیکھنے سے پہلے ہی مر جاتی۔

باہر بینڈ والوں نے اپنے باجے سنبھال لیے تھے۔ کرائے کے مزدور شگن کے تھال سروں پر رکھے ایک قطار میں باہر نکل رہے تھے۔ پھر سمدھیوں نے بڑے تپاک سے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور ایک ایک کر کے باہر جانے لگے۔ باجوں کا شور بلند ہوا اور ایک بار پھر اس کا شگن جلوس کی صورت میں ان کے گھر سے سڑک کی طرف ہو لیا۔

گھر والے اب اپنے برتن بھانڈے سنبھالنے میں مصروف تھے۔ پلیٹوں، گلاسوں اور چمچوں کی گنتی ہو رہی تھی۔ سب لوگ مسرور اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔ جیسے سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہو اور اب خطر کی کوئی بات باقی نہ رہی ہو مگر سوما کو خطرہ اب بھی سر پر کھڑا نظر آتا تھا۔ اس کا یقین اب بھی متزلزل تھا۔ یہ بات اس کے دل میں بیٹھ چکی تھی کہ لڑکے کی بھاوجوں نے گھر جا کر اس کی شکل و صورت کے بارے میں جھوٹ بولا ہے اور جیسے ہی اس جھوٹ کا پول کھل گیا، بات پھر وہیں آ جائے گی۔

وہ خود تو اپنے منگیتر کو ایک بار دیکھ چکی تھی۔ گھر میں بڑوں کے درمیان کچھ ذکر اذکار سے اُسے پتہ لگ گیا تھا کہ اس کا نام گلشن ہے اور وہ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر ریزرویشن کلرک ہے اور پھر یہ بھی محض ایک اتفاق تھا کہ ایک دن اسے فوارے سے پہاڑ گنج کی بس بروقت نہ ملنے کے باعث دہلی مین اسٹیشن سے ٹرین کے ذریعے اسکول جانا پڑا اور نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کی ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے اس کی نظریں لاشعوری طور پر ریزرویشن آفس کی طرف اُٹھ گئی تھیں۔ بابو صاحب اس وقت کسی مسافر سے باتوں میں مصروف تھے۔ خاصے قبول صورت تھے۔ سوما نے محسوس کیا کہ وہ اُن کے لیے بالکل موزوں نہیں ہے۔ اس کی صورت دیکھ کر وہ یقیناً اس رشتے سے انکار کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شگن گئے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا تھا مگر کسی رُخ سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔ لڑکے والوں کے ہاں سے اس کے لیے سونے کی انگوٹھی بھی آ گئی تھی اور اب شادی کی تاریخ پکی کرنے کے لیے خط و کتابت ہو رہی تھی مگر سوما بدستور خوف زدہ تھی۔ اُسے یہ سلسلہ ریت کی ایک دیوار نظر آ رہا تھا اور شادی کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ اس کی گھبراہٹ برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو صلیب پر چڑھا ہوا محسوس کرتی۔ ہر گزرتا ہوا دن اس کے ذہن میں ایک نئی کیل ٹھونک جاتا۔ ہر روز اسکول سے واپس آتے ہوئے اسے ایک بار ضرور خیال آتا کہ آج اس کا شگن واپس آ گیا ہوگا مگر گھر پہنچ کر جب اسے یہ پتہ لگتا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تو وہ اُداس ہو کر فکرمند ہو جاتی۔ شگن کی واپسی کا انتظار وہ بالکل ایک متوقع جوابی خط کی طرح کر رہی تھی جس میں اس کی سزا کی منسوخی کا حکم آنے والا ہو۔ گھر میں بھی وہ جتنی دیر رہتی اس کے کان

ہم چاروں پہیّوں کی یکساں دیکھ بھال کرتے ہیں
تاکہ فاصلے قریب تر ہو جائیں

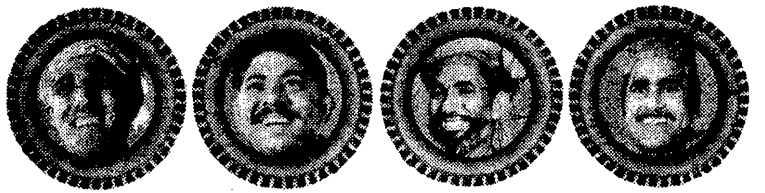

بیڈفورڈ

بسیں اور ٹرک۔ تیز رفتار، مضبوط اور مُنافع بخش

بیڈفورڈ کا ہر ہر پرزہ اعلیٰ ترین انٹرنیشنل معیار کے مطابق پائیداری میں اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔ نیشنل موٹرز کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے، جنہوں نے پاکستان میں موٹر سازی کی نبیاد رکھی۔

بیڈفورڈ اپنے طاقتور انجن کی وجہ سے ایک قابلِ اعتماد اور مہربان دوست کی طرح ہے۔ تیز رفتار، مضبوط اور منافع بخش بیڈفورڈ بسیں اور ٹرک پاکستان کے چاروں صوبوں میں مواصلات کی جان ہیں۔ پاکستان بھر کے ٹرانسپورٹر ہمیشہ بیڈفورڈ ہی کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ وہ برسوں سے جانتے ہیں کہ بیڈفورڈ سب سے قابلِ اعتماد نام ہے۔ اب اس کے زیادہ سے زیادہ پُرزے مقامی تقاضوں کے مُطابق مقامی وسائل سے تیار کئے جا رہے ہیں، جو پائیداری اور کارکردگی میں انٹرنیشنل معیار پر پورے اترتے ہیں۔

نیشنل موٹرز نے چاروں صوبوں میں جگہ جگہ اپنے ڈیلر مقرر کئے ہیں جو ہر ٹرانسپورٹر کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ ڈیلر ورکشاپ کی اعلیٰ سہولتیں مہیا کرتے ہیں۔ فاضل پرزوں کے اسٹاک رکھتے ہیں اور آپ کے بیڈفورڈ کو آپ کیلئے ہمیشہ رواں دواں رکھنے میں آپ کی پوری پوری مدد کرتے ہیں۔

نیشنل موٹرز لمیٹڈ
قابل اعتماد بس اور ٹرک بنانے والے

NM 3-74 193.00 K&I INTAS

مریض

ڈاکٹر سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھا، اس نے ڈاکٹر سے کہا "ڈاکٹر صاحب! ذرا توجہ سے علاج کیجیے۔ اِدھر کچھ دنوں سے نہ معلوم کیوں یہ حال ہوگیا ہے کہ ہر بات بھول جاتا ہوں۔ لمحے بھر پہلے کی بات بھی یاد نہیں رہتی۔ میں بہت عاجز آیا ہوا ہوں!"

ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا "یہ شکایت کب سے پیدا ہوئی؟"

مریض نے منہ کھول کر حیرت سے پوچھا "کون سی شکایت؟"

ہر وقت صدر دروازے پر کسی دستک کے منتظر رہتے۔ اس وقت اگر گھر کا کوئی اپنا آدمی بھی اچانک اندر داخل ہوتا تو وہ دروازے کی طرف یوں چونک کر دیکھتی جیسے اس کا شگن واپس آگیا ہو۔ وہ خود بھی حیران تھی کہ ایسی اُلٹی سیدھی باتیں کیوں اس کے ذہن میں اُبھر آتی ہیں؟ وہ تو شادی کی بڑی خواہش مند تھی۔ برسوں سے اس مقدس موقع کا انتظار کر رہی تھی۔ ازدواجی زندگی کے بارے میں اس نے کیسے کیسے سپنوں کے جال بُن رکھے تھے مگر اب جب کہ سب کچھ ٹھیک طرح ہو رہا تھا، وہ کیوں بُرے امکانات کے بارے میں سوچتی تھی؟ کیوں ان خوش آیند حقائق سے پہلو بچانا چاہتی تھی جو اس کی زندگی کے لیے ایک سیدھا راستہ مقرر کر رہے تھے؟ شاید اس کا اپنا ہی کوئی چور اس کے دل میں ڈر بن کر چھپ گیا تھا اور وہ ہزار کوشش کے باوجود اپنے ذہن میں ایک خوشگوار گرہستی زندگی کا تصور نہیں لا پاتی تھی۔ ہمیشہ اُس کے گھناؤنے پہلو ہی اس کے خیالات پر حاوی ہو جاتے تھے۔ گھر میں شادی کا ذکر ہوتے ہی اسے یوں لگتا جیسے اسے کسی بہت بڑے آپریشن کے لیے اسپتال میں داخل کرانے کی تیاریاں ہو رہی ہوں۔ دہشت سے اس کا رُواں رُواں کانپ جاتا۔

مذبح میں لے جانے والی کسی بکری کی طرح اُس کی رُوح سہم جاتی اور وہ سارا سارا دن پریشان خیالات کے تانوں بانوں میں اُلجھی رہتی اور پھر یہی دبے گھٹے ہوئے خیالات ڈراؤنے خواب بن کر سیاہ آوارہ بادلوں کی طرح اس کے ذہن پر چھا جاتے۔ وہ دیکھتی کہ وہ سب لوگ جو شگن کے موقع پر اُن کے ہاں دعوت کھانے آئے تھے، اب تیزاب سے اُس کے چہرے کی سیاہی دھو رہے ہیں۔ اُس کا جسم شکنجوں میں کس کر اسے دُبلا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس کی کھال اُدھیڑ کر اُس کے ڈھانچے پر نئی سفید کھال چڑھائی جا رہی ہے۔ وہ سخت اذیت محسوس کرتی، چیخنا چاہتی مگر ہر بار اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ جاتی اور وہ کسمسا کر جاگ پڑتی۔ اپنے ہونے والے شوہر کو اس نے کئی بار دوسری شادی رچاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اپنی سوتنوں سے تو وہ اکثر خواب میں جھگڑا کرتی تھی لیکن اس کی اس ذہنی کشمکش اور اپنے مقدر کے متعلق مکمل بے اعتمادی کے باوجود اس کی شادی کی تاریخ دسہرے کے دن کے لیے پکی ہوگئی۔ جس دن اُن کا پروہت شادی کا مہورت لے کر اُن کے گھر آیا، وہ دن اُس پر قیامت کی طرح گزرا۔ دو دھاری تلوار کی سی سوچوں نے اس کے دل و دماغ چھلنی کر ڈالے۔ اُس رات اُسے ایک نہایت بھیانک خواب دکھائی دیا کہ وہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑی ہے۔ سب لوگ حقارت سے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ جج اس کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا ہے۔ وکیلوں کے ہاتھ اس کے سامنے ہوا میں لہرا رہے ہیں اور چاروں طرف سے بھری ہوئی آوازیں بلند ہو رہی ہیں "طلاق۔ طلاق۔"

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے بعد نیند اس کی آنکھوں سے غائب ہوگئی۔ خیالات کے تُند ریلے اس کے ذہن کو شدت سے ہلورے دینے لگے۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اور پھر صبح جب وہ گھر سے تیار ہو کر اسکول روانہ ہوئی تو اس کے قدم بس اسٹینڈ کے بجائے آپ ہی آپ اسٹیشن کی طرف اٹھنے لگے اور اُسی دن کی طرح وہ ایک بار پھر گاڑی پر سوار ہو کر نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر جا اُتری اور ڈیوڑھی کے گیٹ سے گزر کر چپ چاپ ریزرویشن کاؤنٹر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ڈیوٹی پر بیٹھے ہوئے گلشن نے اس کی طرف دیکھ کر عام سے دفتری لہجے میں کہا۔ "کیا چاہیے آپ کو؟"

"مجھے؟ نہیں چاہیے تو کچھ بھی نہیں۔ میں۔ میں تو آپ کو صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ جس لڑکی سے آپ کی منگنی ہوئی ہے۔ وہ۔ وہ میں ہوں۔ یہ دیکھیے آپ کے گھر کی انگوٹھی۔ میرا مطلب ہے شادی سے پہلے آپ لوگ پھر اپنے فیصلے پر غور کر لیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ۔" اس سے آگے سوما کچھ نہ کہہ سکی۔ گلشن کے جواب کا بھی اُس نے انتظار نہیں کیا۔ بس فوراً وہاں سے چل پڑی اور تیزی سے قدم اُٹھاتی ہوئی اسکول کی جانب روانہ ہو گئی۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ اپنے پکے ہوئے پھوڑے کا مواد آج اس نے نکال دیا تھا۔

تیسرے دن اس کا شگن واپس آگیا۔ سارے گھر میں کھلبلی مچ گئی لیکن سوما اطمینان کا ایک گہرا سانس لے کر اندر اپنے پلنگ پر دراز ہو گئی جیسے ایک بہت بڑا بوجھ اُس کے سر سے اُتر گیا ہو۔

انا الحق

ضیا تسنیم بلگرامی ★

فارس کے شہر بیضا کو یہ فخر حاصل ہے کہ ۲۲۴ھ میں وہاں ایک ایسی حق گو اور بے باک ذات پیدا ہوئی جس کا تاریخ انسانی میں کوئی جواب نہیں ملتا۔ افکار اور کردار میں اتنی تندی اور تیزی کہ بڑے بڑے ہم عصر خوف زدہ ہو کے ان سے دُور ہو گئے اور ان کی ہم خیالی اور ہم مشربی سے برأت کا اظہار کرنے لگے۔ کئی صوفی ان کے ہم عقیدہ تھے لیکن جب سزا جھیلنے کا وقت آیا تو یہ اکیلے رہ گئے لوگ ان پر افسوس بھی کرتے تھے اور ہنستے بھی تھے لیکن لوگوں کی ہنسی یا افسوس کا خود ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

نو عمری ہی میں یہ عراق کے شہر واسط چلے آئے اور یہیں رہنے لگے۔ واسط کے لوگوں نے دیکھا، ایک نو عمر خاموش طبع انسان نظریں جھکائے، دنیا و مافیہا سے غافل کسی فکر میں غلطاں و پیچاں اِدھر اُدھر آتا جاتا رہتا ہے، اپنی ذات میں گم، جیسے کسی شے کی جستجو اسے اِدھر اُدھر بھگائے پھر رہی ہو۔ اس کے چہرے اور چال میں غیر معمولی مشابہت پائی جاتی تھی۔ چال کا اضطراب چہرے پر بے چینی اور تجسس بن کر ہویدا رہتا۔ لوگ اس خاموش طبع لیکن بے چین انسان کو دلچسپی سے دیکھتے اور کبھی کبھی کوئی پھبتی بھی کس دیتے لیکن اس کا اس شخص پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

دکان میں رُوئی بھری ہوئی تھی اور دکان دار تنہا کسی کا منتظر تھا۔ اس کی نظر جیسے ہی اس خاموش طبع شخص پر پڑی، اس نے آواز دی "اے بھائی حسین! ذرا یہاں تو تشریف لائیے گا!"

گم سُم، اپنے حال میں مگن نوجوان نے چونک کر دکان دار کی طرف دیکھا اور پوچھا "آپ نے کچھ مجھ سے فرمایا؟"

"ہاں بھائی! میں نے آپ ہی کو آواز دی تھی۔ ذرا ادھر آجائیے میری دکان میں، میرے پاس۔"

یہ نوجوان، اس رُوئی والے کی دُکان میں داخل ہو گیا اور کہا "فرمائیں، مجھ سے کیا کام ہے؟"

دکان دار نے کہا "بھائی حسین! مجھے ایک ضروری کام سے کہیں جانا ہے، کیا تھوڑی دیر کے لیے آپ میری دُکان میں بیٹھنا گوارا کریں گے؟"

"بالکل بیٹھ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر نوجوان دکان میں ایک طرف بیٹھ گیا۔

دکان دار نے کہا "میں ابھی واپس آجاؤں گا، آپ گھبرائیں نہیں۔" اس کے بعد جاتے جاتے کہا "بھائی حسین! میں یہ رُوئی دھنک کر جانا چاہتا تھا تاکہ بعد میں گاہکوں سے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے لیکن دیر اتنی ہو گئی ہے کہ یہ دھنکنے کا کام واپس آکر انجام دینا پڑے گا۔"

دکان دار اپنی روئی کی دکان حسین پر چھوڑ کے چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ حسین رُوئی کی گانٹھوں کے سامنے کھڑے ہاتھ کے اشارے سے کہہ رہے تھے "رُوئی الگ، بنولے الگ!"

یہ منظر کتنا دلکش اور اثر انگیز ہوگا کہ حسین کے حکم پر رُوئی خود بخود دھنک کر ایک طرف جمع ہونے لگی اور اس کے بنولے اُڑ اُڑ کر ایک کونے میں ڈھیر ہونے لگے۔

دُکان دار نے خوف زدہ ہو کر پوچھا "حسین! تم یہ کیا کر رہے ہو؟"

حسین نے مسکرا کر جواب دیا "وہی کام جو تم نہیں کر سکے تھے۔ میں نے سوچا تمہاری واپسی تک میں خود کیوں نہ کر دوں۔"

دکاندار نے خوف زدہ ہو کر کہا "تم نے تو ایک طرح سے

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

تذکرۃ الاولیا (فریدالدین عطار) ★ خزینۃ الاصفیا (مفتی غلام سرور) ★ تذکرۂ اولیا (رئیس احمد جعفری) ★ سفینۂ اولیا (دارا شکوہ) ★ طبقات الاولیا (علامہ شعرانی) ★ جنید بغداد (ترجمہ (مصری سے))

Waqar Azeem Pakistanipoint

جادو کر دیا۔"

"نہیں، اسے جادو نہیں کہتے، میں تو اسی کوشش میں ہوں کہ اپنی ذات سے بنولے اور رُوئی کی طرح دُوئی نکال باہر کروں۔"

دُکان دار ان کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا لیکن اپنی ذہنی استطاعت بھر ان کی عزت افزائی ضرور کی اور ان سے ہنس کر کہا "بھائی حسین! اگر تم بُرا نہ مانو تو ایک گزارش کر دوں؟"

"کرو گزارش!" حسین نے جواب دیا۔

دُکان دار نے کہا۔ "حضرت! آپ نے چونکہ میری رُوئی دھنک دی ہے اس لیے میں آپ کو حسین بن منصور حلاج کہا کروں گا، حلاج اس لیے کہ آپ نے میری رُوئی دھنک دی ہے!"

نوجوان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اُٹھا اور دُکان سے اُٹھ کر چلا گیا۔

یہ رُوئی والا واقعہ آناً فاناً پورے شہر میں مشہور ہو گیا اور لوگوں کی توجہ اس خاموش طبع اور بےچین فطرت نوجوان پر مرکوز ہو گئی۔ وہ اس سے کسی اور کرامت کی اُمید کر رہے تھے لیکن نوجوان حسین کسی اور ہی کربِ اذیت میں مبتلا تھا، وہی دُوئی مٹانے کی فکر۔ ذاتِ احدیت میں گم ہو جانے کی کوشش۔ اس فکر اور کوشش میں اہواز کے شہر تستر کا رُخ کیا کیونکہ تستر میں سہل بن عبداللہ نامی ایک نہایت مشہور و معروف صاحبِ عرفان ذات موجود تھی۔ یہ شب و روز ان کی صحبت میں رہنے لگے۔ اندر شوریدگی تھی کہ کم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

عمر کے ساتھ ساتھ اس میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سہل بن عبداللہ نے حسین کو اپنی قربت کا شرف بخشا تو ضرور تھا لیکن انھیں جلد ہی اس خطرے کا احساس ہو گیا جو یہ نوجوان اپنی ذات میں چھپائے پھر رہا تھا۔ انھوں نے دورانِ گفتگو کئی بار یہ محسوس کیا کہ حسین ان کی صحبت سے مطمئن نہیں ہے اور اندرونی جوش اور جذبے سے مغلوب ہو کر ایسی باتیں کہہ گزرتا ہے جو برسرِ عام کہنے کی نہیں ہوتیں۔ ایسے بھید جن کا دِل میں القا تو ہوتا ہے لیکن ان کے اظہار اور انکشاف کی اجازت نہیں ہوتی۔ سہل بن عبداللہ نے حسین کو خلوت میں بلا کر سوال کیا۔ "حسین! ہمیں خوشی ہے کہ تم جیسا صاحبِ حال مرید خدا نے ہمیں عطا فرمایا، لیکن تمھاری کچھ باتیں ایسی ہیں جن سے ہمیں ڈر لگنے لگتا ہے۔"

حسین نے پوچھا۔ "مثلاً؟ کون سی باتیں؟"

سہل بن عبداللہ نے جواب دیا۔ "ہر وہ راز جو خدا اپنے رازداں بندوں کے دلوں پر منکشف فرماتا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ اس کا برملا اظہار کیا جائے یہ تو نری جذباتیت ہے اور ایک طرح سے کم ہمتی بھی کہ ہم تو اپنے کسی مرید کو خصوصی توجہ کا مستحق سمجھ کر اپنا ہمراز بنا لیں اور وہ مرید ہمارے رازوں کا چرچا کرتا پھرے۔ خدا اور تصوف کے معاملے میں تمھارا طرزِ عمل ایسا ہی ہے۔"

حسین نے تلخی سے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں جو کچھ کرتا ہوں، اس میں میرے اختیار اور ارادوں کا دخل ہوتا ہے؟"

سہل بن عبداللہ نے جواب دیا۔ "حسین! تم اس بحث میں مت پڑو کیونکہ زیرِبحث موضوع خود بخود مسئلۂ جبر و قدر کی طرف منتقل ہوتا نظر آ رہا ہے، معلوم نہیں تم ذہنی طور پر جبریہ سلسلے سے تعلق رکھتے ہو یا قدریہ مسلک سے لیکن باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم جبریہ ہو۔"

حسین نے تند و تیز لہجے میں کہا۔ "میں اپنی وارداتِ قلبی اور انکشافاتِ رُوحانی چھپا نہیں سکتا اور انھیں اس لیے نہیں چھپا سکتا کہ وہ ذات جس کے یہ راز ہیں وہ خود نہیں چاہتی کہ میں انھیں راز رکھوں۔"

سہل بن عبداللہ نے پوچھا۔ "یہ تمھیں کس طرح معلوم ہوا کہ خدا خود نہیں چاہتا کہ تم اس کا راز، راز نہ رکھو۔"

حسین نے جواب دیا۔ "اگر وہ چاہتا کہ اس کا راز، راز رہے تو مجھے اس کے راز رکھنے کا حوصلہ بھی عطا فرماتا اور پھر یہ کہ ایک طرف تو وہ عالم الغیب ہے، چھپی ہوئی باتوں کا جاننے والا اور دوسری طرف اس کی لاعلمی کا یہ عالم ہے کہ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ اپنے جن رازوں کا میرے دل پر القا فرما رہا ہے انھیں میں فاش کر دُوں گا۔"

سہل بن عبداللہ اس گستاخ لب و لہجے پر کانپ گئے، بولے "حسین بس کرو، اب زیادہ کچھ سُننے کی ہم میں تاب نہیں۔"

اس گفت گو نے دونوں کو ایک دوسرے سے دل برداشتہ کر دیا۔ حسین نے سہل بن عبداللہ کا ساتھ چھوڑ دیا اور بصرے چلے گئے۔ بصرے میں عمر بن عثمان مکی کا بڑا شہرہ تھا اور اس عہد کی نہایت برگزیدہ شخصیتیں آپ کی مریدی کا شرف رکھتی تھیں۔ جب حسین بن منصور نے ان کی خدمت میں باریاب ہو کر اپنی حاضری کا مقصد بیان کیا تو عمر بن عثمان نے دریافت کیا۔ "کہاں سے آ رہے ہو؟"

حسین نے جواب دیا۔ "سہل بن عبداللہ کے پاس سے۔"

عمر بن عثمان نے سوال کیا۔" ان کا دامن کیوں چھوڑ دیا؟"

انھوں نے جواب دیا۔" وہ مصلحت اندیش تھے میں مصلحت فراموش ہوں صاف گو ہوں، وہ خاموش طبع، وہ سست رو تھے اور میں تیز رو، ہم دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا، پھر دونوں یکجا کس طرح رہ سکتے تھے؟"

عمر بن عثمان نے اس تیز و طرار نوجوان کو نظر بھر کے دیکھا اور کہا۔ "اچھا تو یہ بات ہے لیکن تم ٹکتے یہاں بھی نہیں نظر آتے، ایسا لگتا ہے کہ تم اپنی آگ میں خود ہی جل مرو گے۔" پھر پوچھا۔" ذرا ہمارے ایک سوال کا سوچ سمجھ کے جواب تو دینا۔"

حسین نے کہا۔" پوچھیے سوال؟"

عمر بن عثمان نے کہا۔" اگر حاکمِ وقت یا امیر المومنین تمھیں اپنے اعتماد میں لے کر اپنے چند راز تم پر منکشف فرما دیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیں کہ خبردار جو انھیں کسی اور پر ظاہر کیا، اگر سہواً بھی اس خطا کے مجرم ٹھیرے تو تمھیں قتل کر دیا جائے گا، ایسی صورت میں تم کیا کرو گے؟"

حسین نے بے باکی سے جواب دیا۔" میں ان رازوں کو ہر ایک پر ظاہر کر دوں گا۔"

عمر بن عثمان نے غصے اور کراہیت سے پوچھا۔" کیا مطلب؟ یعنی تم ان رازوں کو اپنے سینے میں نہیں رکھو گے؟"

حسین نے اطمینان سے جواب دیا۔" جناب یہ سوچنے کی بات ہے کہ جو راز حاکمِ وقت یا امیر المومنین خود اپنے سینے میں نہ رکھ سکیں، وہ دوسروں سے اخفائے راز کی کس طرح توقع کریں گے، رہا سزائے موت کا مسئلہ تو میں ہر وقت اپنا سر دینے کو تیار رہوں اور اس یقین کے ساتھ اپنی جان دوں گا کہ میں بے گناہ مارا جا رہا ہوں کیونکہ میں ایک ایسے جرم کا مرتکب ٹھیرایا گیا ہوں جس جرم کا ارتکاب حاکمِ وقت یا امیر المومنین پہلے ہی کر چکے ہیں۔"

"گستاخ! تیری باتوں میں موت کی بو پائی جاتی ہے۔" عمر بن عثمان نے کہا۔" ہم جانتے ہیں کہ تو کیا ہے اور تیرے دامن سے کتنے فتنے چھپے ہوئے ہیں، سب کچھ جاننے کے باوجود ہم تجھے اپنی صحبت میں رکھیں گے اور کوشش کریں گے کہ تیری جان بچ جائے۔"

حسین نے ان کا شکریہ تک نہیں ادا کیا، چپ چاپ ان کی خدمت میں رہنے لگے۔

چند ہی دنوں میں عمر بن عثمان کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ مرید ضرورت سے زیادہ تلخ ہے اور اس کی جرأت و جسارت میں تلوار کی کاٹ پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کئی بار سرزنش کی کہ حسین اپنی حد میں رہو اور اپنی زبان قابو میں رکھو لیکن اس حکم کی تعمیل حسین کے بس میں نہیں تھی۔

عمر بن عثمان کے پاس تصوف کی کچھ ایسی کتابیں بھی موجود تھیں جن کی بابت یہ کہا جاتا تھا کہ ان میں تصوف کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کیا گیا ہے۔ حسین ان مسودات کی جستجو میں تھے۔ خود مرشد کو بھی یہ بات معلوم تھی اور وہ اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ ہوشیاری سے کام لیتے تھے۔

حسین کو جب یہ پکا یقین ہو گیا کہ ان گراں مایہ مسودات تک ان کی رسائی ناممکن ہے تو انھوں نے اپنے پیر و مرشد سے درخواست کی۔" جنابِ والا! میں چاہتا ہوں کہ ان مسودات کا میں خود بھی مطالعہ کر لوں، براہِ کرم انھیں چند دنوں کے لیے مرحمت فرمائیں۔"

مرشد نے خفگی کا اظہار کیا۔ کہا۔" حسین! ابھی تم مبتدی ہو اور اس منزل میں نہیں داخل ہوئے جہاں ان مسودات کا مطالعہ ضروری قرار دیا گیا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ تم پہلے ہماری ضبط و آزمائش پر پورے اترو، اس کے بعد تمھیں یہ مسودات پڑھنے کے لیے دیے جائیں۔"

حسین نے بھی برہمی کا اظہار کیا، بولے۔" خیر، اگر آپ مجھے اس کا اہل نہیں سمجھتے تو نہ دیجیے، میں خود بھی زیادہ اصرار نہیں کروں گا۔"

یکایک عمر بن عثمان نے یہ محسوس کیا کہ حسین کی بے چینی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ وہ سجدے میں گر کے دعا مانگ رہے تھے۔

"اے الہ العالمین! تیرے بندے یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ میں کرتا ہوں، اس میں میرے ارادے شامل ہوتے ہیں لیکن تو عالم الغیب ہے اور انسانوں کے دلوں کا حال جانتا ہے۔ کیا میں تیرا آلۂ کار نہیں ہوں، کیا تو نے مجھے مجبورِ محض نہیں بنایا، کیا وہ تو نہیں ہے جس نے مجھے ہمیشہ اس بات پر مجبور کیا ہے کہ تو نے میرے دل میں جو باتیں القا کی ہیں انھیں فاش کر دوں، اگر تو ایسا نہیں چاہتا تو مجھے یہ بتا کہ مجھ جیسا کمزور اور مجبور انسان تیری مرضی اور حکم کے خلاف اتنا بڑا قدم کیونکر اٹھا رہا ہے۔"

عمر بن عثمان نے حسین کو سرزنش کی۔ تنبیہاً کہا۔" ابن منصور! ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ تم گمراہ ہو چکے ہو۔ تم جو کچھ سوچتے یا کہتے ہو کبھی ان کے نتائج پر بھی غور کیا، تم یقیناً ایک عالم کو خراب کر کے رہو گے لیکن ہمیں یہ بات بھی معلوم ہے کہ اس سے پہلے کہ تم انسانوں کو گمراہ کرو، خدا تمھیں کوئی عبرت ناک سزا دے چکا ہو گا۔"

حسین کا دِل عمر بن عثمان سے بھی اچاٹ ہوگیا۔ یہ اُس سیلاب کے گرد پشتے تعمیر کرنے کی فکر میں تھے جو حسین کے وجود کو ایک تنکے کی طرح اِدھر اُدھر متحرک کیے ہوئے تھا۔ اُس آگ کو بجھا دینے کی کوشش کر رہے تھے جس کی سوزش کے اہلِ طلب ایک عمر متمنّی رہ کر ناکام رہتے ہیں، حسین، عمر بن عثمان کا ساتھ بھی چھوڑ دینا چاہتے تھے لیکن وہ یہ ضرور جاننا چاہتے تھے کہ وہ خود جس آتشِ سوزاں میں پھنک رہے ہیں اور ان کے دل میں جو ایک بھٹی سی سلگ رہی ہے، عمر بن عثمان کی وارداتِ قلبی اور القائے ذاتی سے اس کی کس حد تک تصدیق یا تردید ہوتی ہے کیونکہ ان کے عقیدے اور فکر کے مطابق صداقت اور حق مجرد شے ہے یہ جہاں کہیں بھی ہوگی اس کی ایک ہی شکل ہوگی۔ عمر بن عثمان بھی اسی آگ میں جل رہے ہوں گے جس میں حسین ابنِ منصور پھنک رہے تھے پھر کیا وجہ تھی کہ عمر بن عثمان اس اضطراب اور بے چینی کے شکار نہیں تھے جس نے حسین ابن منصور کو آتش زیرپا کر رکھا تھا؟

یہ سوچ کر حسین ابن منصور نے پکّا ارادہ کر لیا کہ عمر بن عثمان کا وہ مسودہ ضرور چوری کرنا پڑے گا جس میں تصوّف کا ایک جہان قلبند کر دیا گیا تھا۔ اور عمر بن عثمان اس مسودے کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

عمر بن عثمان تلاوتِ قرآنِ پاک فرما رہے تھے۔ حسین ابنِ منصور ان کے قریب بیٹھے غور سے سُن رہے تھے۔ یکایک ان کے کان میں یہ آواز آئی۔ كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ ۔ ؎ (میں ایک مخفی خزانہ تھا، میں نے دوست رکھا دیہ ارادہ) کہ پہچانا جاؤں پس میں نے خلق کو پیدا کیا)

حسین ابن منصور کی حالت غیر ہوگئی۔ حالتِ وجد میں، بے اختیار کہا: "یہ کلام میرا ہے، ایسا کلام میں خود بھی کر سکتا ہوں۔"

عمر بن عثمان قرآنِ پاک کے احترام میں اپنی جگہ سے اُٹھ نہ
لیکن حسین کی بات نے انھیں تڑپا دیا، وہ غصّے میں بے قابو سے ہو
گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ تلاوت سے فارغ ہو گئے تو انھوں نے
پاک کو جز دان میں رکھا اور اندر سے برہنہ شمشیر لیے نمودار ہوئے۔
کے مرید اپنے مرشد کو شمشیر بکف دیکھ کر گھبرا گئے اور حیرانی سے سوال
"حضرت! آج ہم آپ کو اس حالت میں کیوں دیکھ رہے ہیں؟ کس
قتل کا ارادہ ہے؟"

عمر بن عثمان نے غصّے میں کہا: "ابن منصور کہاں ہے؟ آج
اسے قتل کر دیں گے۔"

مرید سناٹے میں آ گئے۔ کسی ایک نے جرأت کی، پوچھا: "حضر
ابن منصور کی خطا؟"

عمر بن عثمان نے جواب دیا: "وہ گمراہ ہو گیا ہے اور اپنی زبا
سے کلماتِ کفر ادا کرنے لگا ہے۔"

حسین ابن منصور کا کہیں پتہ نہ تھا۔ عمر بن عثمان کے دوسر
مرید یہ تو جانتے تھے کہ ابن منصور صاف گو اور گستاخ ہیں لیکن انھ
اس وقت یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ابنِ منصور نے کون سے کلماتِ کفر ادا
ہیں جن سے عمر بن عثمان اتنے برہم ہیں۔ حسین ابنِ منصور کہیں روپوش
ہو گئے تھے۔ آخر تھک ہار کے عمر بن عثمان واپس آ گئے اور مرید
سے کہا: "اگر میں کسی طرح ابن منصور کو پا جاتا تو اسے اپنے ہاتھوں سے قتل
کرنے کی سعادت حاصل کرتا۔"

دوسری طرف حسین ابن منصور وہاں سے رخصت ہو جانے کی
کوشش میں تھے لیکن یہ روانگی اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک وہ
اپنے پیر و مرشد کا مسوّدہ 'گنج نامہ' نہیں حاصل کر لیتے تھے۔ یہ مسودہ جائے نما
کے نیچے رکھا ہوا تھا اور وہاں تک پہنچنا اور پھر اسے حاصل کرنا بہت
دشوار تھا۔ اس سلسلے میں ابن منصور نے اپنے ایک سادہ لوح پیر بھائی
کا سہارا لیا اور یکایک اس کے سامنے ظاہر ہو کر پوچھا: "اس وقت
پیر و مرشد کہاں تشریف رکھتے ہیں؟"

سادہ لوح مرید انھیں دیکھتے ہی پریشان ہو گیا، بولا: "ابنِ منصو
تم خدا کے لیے یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ، پیر و مرشد تمھیں تلاش کرتے
پھر رہے ہیں۔ برہنہ شمشیر ان کے ہاتھ میں ہے اور غصّے میں بار بار یہ
فرما رہے ہیں کہ اگر میں کسی طرح ابنِ منصور کو پا جاؤں تو اسے اپنے ہاتھو
سے قتل کرنے کی سعادت حاصل کروں؟" پھر پوچھا: "ابن منصور! آخر یہ

سب مہک

SRX.1.300 74.UD

R LINTAS

معاملہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تم گمراہ ہوگئے ہو؟"

ابنِ منصور نے افسوس سے جواب دیا۔" میں کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو عقل و وجدان کے خلاف ہو اور میری یہ خطا نہیں ہے کہ میں غلط باتیں کرتا رہتا ہوں بلکہ خطا یہ ہے کہ میں ان اسرار کو کیوں فاش کر رہا ہوں جنھیں یہ صاحبانِ وجدان و دانش چھپاتے ہیں۔"

مرید نے کہا۔" اچھا تب پھر تم فوراً میرے مشورے پر عمل کرو اور اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔"

ابنِ منصور نے کہا۔" میں یہاں سے ایک شرط پر چلا جاؤں گا۔"

مرید نے کہا۔" بتاؤ، وہ شرط کیا ہے؟"

ابنِ منصور نے کہا۔" اچھا تم یہ بتاؤ، پیر و مرشد اس وقت کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟"

مُرید نے جواب دیا۔" ظہر کی نماز کے لیے وضو کر رہے ہیں اور اس وقت غسل خانے میں تشریف رکھتے ہیں۔"

ابنِ منصور نے کہا۔" اچھا، میں آخری بار پیر و مرشد کی جائے نماز کو بوسہ دینا چاہتا ہوں، اس کے بعد یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔"

مرید نے پہرے داری کا فریضہ انجام دیا۔ ابنِ منصور نے جائے نماز کے نیچے سے "گنج نامہ" نکالا اور اپنے پیر و مرشد عمر بن عثمان کا ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔

عمر بن عثمان نے وضو کے دوران داہنے پیر کو دھوتے ہوئے باآوازِ بلند فرمایا۔" لے گیا، بدبخت لے گیا۔ بہت بُرا کیا، اپنی دُنیا خراب کرلی، زندگی کا سودا کرلیا۔ افسوس افسوس۔"

کسی مرید نے ان ناقابلِ فہم کلمات کی وضاحت چاہی تو آپ نے جواب دیا۔" وہ ابنِ منصور گستاخ، اس نے یہ بہت بُری حرکت کی کہ ہماری جائے نماز کے نیچے سے گنج نامہ چوری کرلیا، وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا اور ہمیں یقین کی حد تک یہ ڈر ہے کہ اس نوجوان کے ہاتھ پاؤں اور سر قلم کردیے جائیں گے۔"

کسی مرید نے غیر معمولی جسارت سے کام لیا۔ کہا۔" جب آپ اس راز سے واقف ہی ہوگئے تھے کہ ابنِ منصور آپ کا مسودہ گنج نامہ چوری کرکے لیے جا رہا ہے تو آپ مزاحمت کرتے اور اسے اس حرکت سے باز رکھتے۔"

عمر بن عثمان نے جواب دیا۔" اس نے کلماتِ کفر ادا کیے ہیں، غیر معمولی اسرار فاش کیے ہیں، بے جا جسارتوں اور گستاخیوں کا مرتکب ہوتا جا رہا ہے آخر ان کی کوئی سزا تو ہوگی، اب گنج نامہ چرا لیا ہے یہ سب اُس ملنے والی عبرت ناک سزا کی فردِ جرم میں شامل ہیں۔"

ابنِ منصور نے بغداد کا رُخ کیا، اب وہ جنید بغدادی کی خدمت میں رہنا چاہتے تھے۔

★

گنج نامہ نظروں کے سامنے تھا۔ ابنِ منصور نہایت ذوق و شوق سے اس کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اس میں لکھا تھا" ہم نے تخلیقِ آدم کے بعد جب فرشتوں کو سجدے کا حکم دیا تو ابلیس کے سوا سبھی نے سجدہ کیا، فرشتے تخلیقِ آدم کے بھید سے ناواقف تھے اس لیے بے چون و چرا سجدہ کرلیا۔ ابلیس واقفِ اسرار تھا اس لیے سجدہ کرنے سے انکار کردیا پھر ہم نے کہا، زمین کے اندر ہم نے ایک ایسا خزانہ چھپا رکھا ہے کہ جو بھی اس سے واقفیت حاصل کرنا چاہے گا وہ ہلاک ہوگا لیکن ابلیس نے کہا کہ علم و آگہی کا جو خزانہ مجھ کو عطا کیا گیا ہے اس کے بعد کسی اور خزانے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ میں پھر بھی زمین کے پوشیدہ خزانے کا علم حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ ابلیس کو اجازت اور مہلت دے دی گئی۔"

ابنِ منصور نے زیرِ لب مسکرا کے کہا۔" خوب! گنج نامہ عمر بن عثمان، ایک انسان کی تصنیف ہے اور اس کا لہجہ یہ بتاتا ہے گویا کوئی انسان نہیں، خود خدا مخاطب ہے، اور جب یہی بات میں اپنی زبان سے کہتا ہوں تو مجھے کافر و زندیق گردانا جاتا ہے۔ میں اتنی منافقت تو نہیں کرسکتا کہ دل میں کچھ اور ہو اور زبان پر کچھ اور۔"

یہ جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچے اور ادب سے ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑے ہوگئے۔

جنید بغدادی نے سوال کیا۔" ابنِ منصور، تم ہمارے پاس کس لیے آئے ہو؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔" شیخ کی صحبت اختیار کرنے کی غرض سے۔"

جنید بغدادی نے بے رُخی سے جواب دیا۔" ابنِ منصور! افسوس کہ ہم دیوانوں کو اپنی صحبت میں نہیں رکھتے، تم کوئی اور در دیکھو۔"

ابنِ منصور نے مایوسی سے کہا۔" آخر یہ کیوں؟ اس در سے کسی کو کبھی بھی مایوس نہیں کیا گیا، پھر مجھے کیوں مایوس رکھا جائے گا۔"

جنید بغدادی نے جواب دیا۔" ابنِ منصور! حسنِ صحبت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان کسی حد تک اپنے ہوش و حواس میں ہو، اگر آدمی میں ہوش و حواس نہ ہوں تو اس کا طرزِ عمل بالکل معاندانہ ہوگا۔ تمھارے جیسا، تم نے سہل بن عبداللہ کی صحبت چھوڑی، عمر بن عثمان کی صحبت میں رہنے

لگے اور اب ان سے جدا ہو کر ہمارے پاس چلے آئے، ایسے متلون مزاج انسان کا کیا بھروسا؟ کل ہمارا ساتھ چھوڑ کے کسی اور کے پاس چلے جاؤ گے؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا "ہوش ہو یا مدہوشی، دونوں ہی انسانی صفات ہیں اور میں خدا سے دعا مانگتا رہتا ہوں کہ وہ مجھے سرخرو کرے۔ شیخ! ایک بات آپ بھی جان لیں کہ جب تک کوئی انسان اپنی صفات بالکل نیست و نابود نہ کر دے، وہ اپنے مالک سے نہاں اور مستور ہی رہتا ہے۔"

جنید بغدادی نے ذرا طیش میں کہا "ابنِ منصور! ہوش اور مدہوشی کے معاملے میں تم غلطی پر ہو اور تمھیں شاید یہ نہیں معلوم کہ ہوش اور مدہوشی انسان کی اختیاری حالت نہیں ہیں۔ انھیں محض اپنی کوشش سے نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ ابنِ منصور! ذرا ہوش و حواس سے کام لو، کیونکہ تمھارے اقوال اور فکر میں یا تو دیوانگی کا وافر حصہ ملتا ہے یا پھر حماقت کا۔"

ابنِ منصور نے جنید بغدادی سے زیادہ بحث نہیں کی، خاموشی اختیار کی اور خلوت و سکوت کی تربیت سے آراستہ ہونے کے بعد یہ حج کی غرض سے مکہ معظمہ چلے گئے۔ حج سے پھر بغداد واپس آگئے اور جنید بغدادی کی خدمت میں رہنے لگے۔ اسی دوران انھوں نے شادی بھی کر لی تھی۔

ایک دن جنید بغدادی سے سوال کیا "حضرت! مجھ سے سرزد ہونے والے افعال کا ذمّے دار کون ہے؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا "تم خود۔"

ابنِ منصور نے کہا "لیکن جناب، مجھے اس سے اختلاف ہے، اپنے سارے اعمال اور افعال کا ذمّے دار میں کیوں ٹھیرایا جاؤں، میں معلّم الملکوت نہیں ہوں کہ انکارِ سجدہ کا گناہ اپنی گردن پر رکھ لوں، میں جو کچھ کرتا ہوں یا آیندہ کروں گا وہ میرا فعل نہیں ہوگا بلکہ وہ من جانب اللہ ہوگا اور یہ ایک ایسا راز ہے جسے میں چھپا نہیں سکتا، چھپانا بھی چاہوں تو بھی نہ چھپا سکوں۔"

جنید بغدادی، ابنِ منصور کی باتیں نہایت غور سے سنتے رہے پھر فرمایا "ابنِ منصور! ہماری پیش گوئی اپنی گرہ میں باندھ لے، تو اپنی عمر کے کسی نہ کسی حصّے میں لکڑی کا سر سُرخ کرے گا، ہماری یہ بات ہمیشہ ذہن اور حافظے میں محفوظ رکھ!"

ابنِ منصور نے جواب دیا "اپنے انجام سے میں خود بھی واقف ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جب میری بابت سُولی دیے جانے کا حکم دیا جانے لگے گا تو خلیفۂ وقت کی طرف سے آپ کو حکم ملے گا کہ ابنِ منصور کے معاملے میں اپنے فیصلے سے مطلع کرو، اس وقت آپ مجبوراً

چند دوست آپس میں مختلف موضوعات پر بات چیت کر رہے تھے۔ گفتگو کہیں سے کہیں پہنچ گئی اور بات یہاں تک پہنچی کہ دُنیا کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی باتیں زیرِ بحث آنے لگیں۔

اسی سلسلے میں ایک دوست نے سوال کیا "دُنیا کا آسان ترین کام کیا ہے اور مشکل ترین کام کیا ہے؟"

بیوی کے ظلم و ستم جھیلا ہوا ایک دوست بولا "آسان ترین کام ہے شادی کرنا اور مشکل ترین کام ہے شادی کر کے نبھا دینا۔"

"علمائے ظاہر کا لباس پہن کر میرے خلاف فتوٰی صادر فرمائیں گے۔" جنید بغدادی نے ایک دم خاموشی اختیار کر لی۔

جنید بغدادی سے بھی نہ نبھ سکی اور یہ ناراض ہو کر تستر چلے گئے۔ یہاں ان کے گرد عقیدت مندوں کا ایک مجمع رہنے لگا۔ طبیعت کی بے باکی اور صاف گوئی کی وجہ سے اہلِ ظاہر آپ سے ناراض رہتے اور حسد کرتے۔ یہ بھی ان کی کوئی پروا نہ کرتے۔ عمر بن عثمان نے بھی معاندانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ حسین ابنِ منصور تستر میں مقیم ہیں تو انھوں نے ان کے خلاف، اپنے خطوط کے ذریعے لوگوں کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ ابنِ منصور کو اپنے مرشد کی اس روش سے بڑی اذیت پہنچی۔ ایک طرف علمائے ظاہر کی معاندانہ روش اور حسد، دوسری طرف عمر بن عثمان کے مخالفانہ خطوط کی یلغار، ابنِ منصور اتنے عاجز آگئے کہ دنیا داروں جیسی روش اختیار کر لی لیکن اس پر زیادہ دن نہیں چل سکے۔ اس عرصے میں یہ کتابیں بھی تصنیف کرتے رہے۔ ان بلند پایہ تصانیف پر انھیں حلاج الاسرار کا خطاب دیا گیا۔

اس کے بعد ابنِ منصور نے سیاحت شروع کر دی، جہاں جاتے وہاں کے لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے۔ اہواز کے راستے برصغیر میں داخل ہوئے اور یہاں سے خراسان ہوتے ہوئے ماوراء النہر پہنچے اور ماوراء النہر سے مغربی چین چلے گئے جہاں بھی گئے وہاں کے لوگوں نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔

آپ عبادت و ریاضت میں سخت محنت سے کام لیتے اور بڑی اذیتیں برداشت کرتے۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ "جب آپ عظمت اور بزرگی کے اتنے بڑے منصب پر فائز ہیں تو اتنی مشقت اور اذیت کیوں جھیلتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "عشق اور دوستی کا مفہوم ہی یہی ہے کہ مصائب پر صبر کیا جائے اور اس راہ میں جو فنا ہو جاتے ہیں، انھیں خوشی

Waqar Azeem
pakistanipoint.Com

اور غم کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔"

اس زمانے میں آپ ایک ہی گدڑی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

ایک عرصے بعد آپ کے عقیدت مندوں نے مجبور کیا کہ وہ اس پھٹی پرانی بوسیدہ گدڑی کو علیحدہ کر دیں، یہ اس پر مُصر تھے کہ "میں اس گدڑی کو نہیں چھوڑوں گا۔" عقیدت مندوں نے از راہِ عقیدت جبراً یہ گدڑی ان سے چھین لی، اس چھین جھپٹ میں گدڑی کے اندر سے ایک بچھو زمین پر گر کر رینگنے لگا۔ کسی عقیدت مند نے اسے مارنے کے لیے پتھر اٹھایا تو ابنِ منصور نہایت کرب سے آگے بڑھے اور اس شخص کے ہاتھ سے پتھر چھین لیا اور اسے ایک طرف پھینکتے ہوئے فرمایا۔ "اسے مت مارو کیونکہ یہ بارہ برس سے اس گدڑی میں فرضِ رفاقت ادا کر رہا ہے۔"

اس بار آپ نے اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ حج کا ارادہ کیا۔

آپ نے اپنے عقیدت مندوں کے ہجوم کے ساتھ حج کا سفر کیا۔ سفر طویل تھا اور زادِ راہ قلیل۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ بھوک سے پریشان ہونے لگے۔ ابنِ منصور نے بے نیازی اختیار کی تو لوگوں نے شکوہ کیا کہ "حضرت، آپ کے ساتھ سفر کیا اور بھوک کے شکار ہوئے۔ کچھ کھائے بغیر یہ سفر کیوں کر کٹے گا؟"

آپ نے پوچھا۔ "تم لوگ کیا کھانا چاہتے ہو؟"

کہاں تو خوراک نام کا ایک ذرہ بھی کسی کے پاس نہ تھا اور کہاں ابنِ منصور کا یہ سوال کہ "تم لوگ کیا کھانا چاہتے ہو؟"

کسی عقیدت مند نے جواب دیا۔ "حضرت، اس وقت جو بھی مل جائے غنیمت ہے۔"

ابنِ منصور نے پھر سوال کیا۔ "تمھیں خواہش کس چیز کی ہے؟"

عقیدت مند نے جواب دیا۔ "سری اور روٹیاں۔"

آپ نے انھیں حکم دیا۔ "تم لوگ اپنی اپنی چادریں بچھا کر ایک صف میں بیٹھ جاؤ۔"

لوگوں نے حکم کی تعمیل کر دی۔ ابنِ منصور صف کے ایک کنارے کھڑے ہو گئے اور دونوں ہاتھ پشت پر لے گئے اور فوراً ہی واپس لے آئے۔ اس وقت ان کے دونوں ہاتھوں میں ایک بھنی ہوئی سری اور دو گرم گرم روٹیاں موجود تھیں۔ آپ نے صف کے پہلے شخص کے سامنے دونوں چیزیں رکھ دیں اور کہا۔ "ذرا صبر سے کام لو، جب یہی چیزیں بقیہ دوسروں کے سامنے بھی رکھ دی جائیں تو سب ایک ساتھ کھانا۔"

پھر عقیدت مندوں نے یہ دلچسپ تماشا دیکھا کہ ابنِ منصور کے ہاتھ بار بار پیچھے جاتے اور جب سامنے آتے تو ایک سری اور دو گرم گرم روٹیاں ہاتھوں میں موجود ہوتیں۔ جب یہ عمل تکمیل کو پہنچا تو آپ نے انھیں حکم دیا۔ "اچھا بسم اللہ!"

لوگوں نے کھانا شروع کر دیا اور خوب شکم سیر ہو کر دم لیا۔

لوگوں کے لیے یہ ایک دلچسپ کرامت تھی۔ وہ ابنِ منصور کی موجودگی میں احتیاجاتِ زندگی کی طرف سے بے نیاز ہو گئے۔ اس سفر میں ایک جگہ کچھ دیر کے لیے قیام کیا تو عقیدت مندوں نے خواہش کی کہ وہ خرمے کھانا چاہتے ہیں۔

آپ نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو دُور تک خرمے کا کوئی درخت بھی نظر نہ آیا۔ آپ نے کہا۔ "خرمے کس طرح کھاؤ گے؟ نہ تو یہاں کوئی بازار ہے کہ خرمے خرید کر کھلائے جائیں، نہ خرمے کے درخت ہیں کہ انھیں توڑ لیا جائے۔"

عقیدت مندوں نے اصرار کیا۔ "ہم تو آپ کے سامنے اپنی احتیاج عرض کر کے خاموش ہو رہیں گے، وہ مطلوبہ شے کہاں سے اور کس طرح حاصل ہو گی، ہم مجبور اور گناہگار لوگ اس پر غور نہیں کرنا چاہتے۔"

آپ تن کر کھڑے ہو گئے اور لوگوں سے فرمایا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ مجھ سے کتنی عقیدت رکھتے ہو لیکن تم میں سے اکثر ان تماشائیوں اور لعن طعن کرنے والوں میں شامل ہوں گے جو مجھے کافر قرار دیں گے۔"

لوگوں نے بیک آواز کہا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا کبھی بھی نہ ہو گا۔"

ابنِ منصور نے کہا۔ "اچھا پھر تم لوگ باری باری میرے جسم کو اس طرح ہلاؤ جس طرح پھل والے درخت کو ہلایا جاتا ہے۔"

کئی آدمیوں نے باری باری آپ کو شانوں سے پکڑ کر ہلایا اور ہر بار جسم کے مختلف حصوں سے خرمے یوں گرنے لگے جس طرح درختوں سے گرتے ہیں۔ کچھ دیر بعد اتنے خرمے جمع ہو گئے کہ سبھوں کا اچھی طرح بھلا ہو گیا۔

ابھی یہ لوگ بغداد سے کافی دُور تھے۔ خرموں کے بعد کسی نے خواہش کی کہ "میں حلوہ کھانا چاہتا ہوں۔"

آپ نے قدرے توقف کے بعد حلوے کا طباق بھی ان کے سامنے رکھ دیا۔ لوگوں نے مزے لے لے کر حلوہ کھایا اور بیک زبان عرض کیا۔ "جناب! ایسا حلوہ تو بغداد کے سوا کہیں بھی نہ ملے گا، مزہ آ گیا۔"

ابنِ منصور خاموش رہے۔ رات کو جب لوگ آرام کر رہے تھے۔ ابنِ منصور نہایت دردناک آواز میں اپنے اشعار پڑھ رہے تھے۔ اس الحاح و زاری سے کئی کی نیندیں اُڑ گئیں اور وہ چھپ چھپ کر ابنِ منصور کا کلام سُننے لگے۔ ابنِ منصور خدا سے مخاطب تھے اور کہہ رہے تھے۔

"ہم دو روحیں ہیں جنھوں نے ایک بدن کی صورت اختیار کر لی ہے،

بچت سے خوشحالی ہے

اپنی بچت کو

قومی بچت کی اسکیموں میں لگایئے

- خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ
- نیشنل ڈپازٹ سرٹیفکیٹ
- ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ
- انعامی بانڈ
- پوسٹ آفس سیونگ بینک
- پوسٹل لائف انشورنس

یہاں رقم تیزی سے بڑھتی ہے

NATIONAL SAVINGS

قومی بچت کے مرکز، بینک یا ڈاک خانے سے خریدیئے

RIO (K) PID

NATIONAL 77 H

جب وہ مجھے دیکھتا ہے، میں اسے دیکھتا ہوں۔
جب میں اسے دیکھتا ہوں، وہ مجھے دیکھتا ہے۔
تو میرے رگ و پے اور قلب میں جاری و ساری ہے۔
بالکل اسی طرح جس طرح آنسو میری آنکھوں سے جاری ہیں۔
ضمیر، قلب میں اس طرح حل ہو گیا ہے۔
جس طرح روح بدن میں جذب ہو جاتی ہے۔
اے اللہ! تیری روح میری روح میں اس طرح سما گئی ہے جس طرح آبِ زلال میں شراب۔
جب کوئی چیز تجھے مس ہوتی ہے تو مجھے بھی مس ہوتی ہے۔
کیونکہ تو اور میں ہر حال میں ایک ہیں۔"

چھپ کر سننے والوں میں سے بعض نے کہا "ارے یہ تو بہک رہا ہے اور کفر بک رہا ہے۔" لیکن کسی اور نے تردید کی۔ جواب دیا۔
"نہیں، ابنِ منصور کافر نہیں ہو سکتے۔ یہ مقام وصلت ہے جہاں دُوئی کا جھگڑا مٹ جاتا ہے اور پھر کافر اور ملحد قرار دینا فقہا کا منصب ہے، ہم ایسی باتیں کیوں کریں۔"

ان آپس کے بحث مباحثوں میں کوئی ایک فریق بھی اپنے مخالف کو ہم خیال نہ بنا سکا اور وہ دو حصوں میں بٹ گئے۔ جب یہ لوگ بغداد کے بابِ الطاق میں داخل ہوئے اور کھانا خریدنے بازار میں پہنچے تو ان میں سے کسی ایک کے پاس وہ طباق بھی تھا جس میں انھیں ابنِ منصور نے گرما گرم حلوہ پیش کیا تھا۔ ایک حلوائی اس طباق کو غور سے دیکھ رہا تھا، پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور طباق والے شخص کو پکڑ لیا اور پوچھا۔
"یہ طباق میرا ہے، تمھیں کہاں سے ملا؟"

یہ شخص گھبرا گیا۔ بولا "تیرا ہی ہوگا، مجھے کیا پتہ؟" پھر اس نے ابنِ منصور کا واقعہ سناتے ہوئے کہا "ہمیں تو یہ ان سے ملا تھا۔ یہ انھیں کس نے دیا اور ان کے پاس کس طرح پہنچا، انھی سے جا کر معلوم کر لو، ہم کیا جواب دے سکتے ہیں؟"

حلوائی نے کہا "تم مجھے ابنِ منصور کے پاس لے چلو۔ میں اس عجیب و غریب شخص سے ملنا چاہتا ہوں۔"

حلوائی کو ابنِ منصور کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ لوگوں کا خیال تھا، یہ حلوائی ابنِ منصور سے اُلجھ جائے گا اور جھگڑا کرے گا لیکن وہ ابنِ منصور کے قدموں میں گر گیا اور رو رو کر عرض کیا "حضرت! اس ناچیز کو بھی اپنی ہم رکابی کا شرف عطا فرمائیں، ایسے برگزیدہ اور خدا رسیدہ لوگ آج کل ملتے کہاں ہیں۔"

ابنِ منصور نے جواب دیا "کیا تم خود کو اللہ کی راہ میں فنا کرنے کا عزم رکھتے ہو؟"
"بالکل، میں تو ہر اس بات کے لیے آمادہ و تیار ہوں جس کا آپ حکم فرمائیں گے۔"
ابنِ منصور نے پوچھا "اپنے اہل و عیال کا کیا بندوبست کیا؟"
حلوائی نے جواب دیا "انھیں خدا کے سپرد کر دیا۔"
"خوب!" ابنِ منصور نے کہا "اگر ایسا ہے تو بسم اللہ۔"
حلوائی اسی وقت سے آپ کے ساتھ رہنے لگا۔

بغداد میں ابنِ منصور کے خلاف چرچے شروع ہو گئے۔ علمائے ظاہر انھیں گھیر کر بیٹھ گئے اور زِچ کر دینے والے سوالات کرنے لگے۔ جنید بغدادی نے ناراضی کا اظہار کیا۔ جب لوگوں نے ان سے ابنِ منصور کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ شہر کے علما اور فقیہہ ان پر سوالات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہیں تو آپ نے افسوس اور دُکھ سے منہ پھیر لیا اور فرمایا "ابنِ منصور اپنا دشمن آپ ہے، ہم کیا کر سکتے ہیں؟ آخر یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ جن پر ابتدائے آفرینش سے پردہ پڑا ہوا ہے تم ان اسرار سے پردہ اٹھا دو اور جو کوئی ایسا کرے گا اس کی سزا بھی بھگتے گا۔"

حاسد اور نادان علما نے ابنِ منصور کو طرح طرح کے سوالوں سے ہلکان کر دیا۔ کسی عالم نے سوال کیا "جنابِ والا! ذرا یہ تو بتائیے کہ حضرت موسیٰؑ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"
ابنِ منصور نے جواب دیا "وہ پیغمبر تھے، پیغمبرِ حق۔ مبنی بر حق۔"
اس عالم نے دُوسرا سوال کیا "اور فرعون کی بابت کیا خیال ہے؟"
انھوں نے جواب دیا "وہ بھی سچا تھا۔"
طنز و استہزا کا پُرشور قہقہہ بلند ہوا "خوب، موسیٰ بھی حق پر تھے اور فرعون بھی حق پر۔ یہ کیا بات ہوئی؟"
ابنِ منصور نے جواب دیا "تم لوگ ہنستے کیوں ہو؟ کیا تم اتنی بات بھی نہیں جانتے کہ خدا نے دو طرح کے لوگ پیدا فرمائے ہیں، ایک عام اور دوسرے خاص ۔۔۔ اور یہ دونوں ہی قسم کے لوگ اپنے حصے کا کام انجام دیتے رہتے ہیں۔"
کسی شخص نے تند و تیز لہجے میں کہا "یہ تو کیا بک رہا ہے؟"
ابنِ منصور نے تحمل سے جواب دیا "پہلے پوری بات سن لو، ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ خدا نے دو طرح کے انسان پیدا فرمائے ہیں۔ عام اور خاص ۔۔۔ اور دونوں ہی کے ذمے جو کام لگائے گئے ہیں، یہ انھیں انجام دیتے رہتے ہیں۔ دونوں کو راستہ دکھانے والا خدا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.Com

ہے۔ حکمت ایک تیر ہے، خدا تیر انداز اور مخلوق اس کا نشانہ۔ خدا اور اس کی یاد میں دُنیا اور آخرت بھلا دینے والا واصل الی اللہ ہوتا ہے اور فقر یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا کی عبادت میں ہر شے سے مستغنی ہو جائے۔"

لوگ ان کی باتوں سے سخت برہم و بیزار تھے۔ کسی نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا: "ابن منصور! تم وہی ہو نا جسے لوگ حلاج کہتے ہیں کیا خدا تم جیسے معمولی خاندان کے حقیر انسان پر اپنی ذات منکشف کر سکتا ہے؟"

ابن منصور نے جواب دیا: "تم لوگ کیسی جہالت کی باتیں کر رہے ہو، ذاتِ خداوندی جس پر منکشف ہونا چاہتی ہے تو وہ ادنا اعلا نہیں دیکھتی۔ وہ ادنا شے قبول کر کے منکشف ہو جاتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اعمالِ صالحہ بھی قبول نہیں کرتی۔"

ایک شخص نے سوال کیا: "صبر کیا ہے؟"

ابن منصور نے جواب دیا: "صبر کا مفہوم یہ ہے کہ اگر صبر کرنے والے کے ہاتھ پیر کاٹ کر سُولی پر چڑھا دیا جائے تو وہ اُف نہ کرے۔ شکایت کرنے والا صابر نہیں کہلائے گا۔"

کسی شخص نے آہستہ سے کہا: "مت گھبراؤ ابن منصور! تمھیں بھی صبر کی اس کسوٹی پر کس کر دیکھ لیا جائے گا۔"

کسی عالم نے سوال کیا: "آخر انبیائے کرام بھٹکتے کیوں نہیں ہیں؟"

ابن منصور نے جواب دیا: "انبیائے کرام اعمال پر غالب رہتے ہیں، اسی وجہ سے اعمال انھیں گردش دینے میں بے بس رہتے تھے اور انبیائے کرام خود اعمال کو گردش دیا کرتے تھے۔"

لوگوں نے جدا ہونے سے پہلے انھیں تنبیہ کی: "ابن منصور! اگر تم یہ چاہتے ہو کہ کچھ دن اور زندہ رہو تو اپنے افکار اور خیالات کے اظہار میں ہوش مندی اور میانہ روی سے کام لو، ورنہ فی الحال تو ایسا نظر آتا ہے کہ تم کافر قرار دے دیے جاؤ اور اس جرم کی جو سزا تمھیں مل سکتی ہے، فقیہانِ شہر سے معلوم کر لینا۔"

ابن منصور نے خندہ پیشانی سے جواب دیا: "جو کچھ میں کہتا ہوں، میں خود نہیں کہتا بلکہ خدا کہتا ہے، میری زبان سے خدا خود کلام فرماتا ہے، آخر یہ بات تم لوگ کیوں نہیں سمجھتے۔"

کسی نرم دل عالم نے ازراہِ ہمدردی کہا: "ارحم الراحمین تم پر رحم فرمائے ابن منصور!"

ابن منصور نے جواب دیا: "ارحم الراحمین خود میری ذات میں موجود ہے، کیا وہ خود اپنی ذات پر رحم فرما سکتا ہے؟ تم فقیہانِ شہر اور علمائے ظاہر ان باطنی اور حقیقی رموز کو کیا سمجھو، اب جاؤ اور مجھے زیادہ پریشان نہ کرو۔"

لوگوں نے ان پر لعن طعن شروع کر دی اور کنکر پتھر برسانے لگے۔ وہ بیک آواز چیخ رہے تھے: "دیوانہ ہے دیوانہ، کافر ہے مشرک ہے، اسے مارو، سنگسار کر دو، یہاں تک کہ مر جائے۔"

لیکن کسی فقیہہ نے انھیں ایسا کرنے سے روکا۔ کہا: "لوگو! تم قانون کو اپنے ہاتھ میں کیوں لیتے ہو۔ اسے فقہائے عصر اور علمائے عہد کے رُوبرو پیش کیا جائے اور پھر شرع جیسا حکم دے گی اس پر عمل کیا جائے گا۔"

لوگ وہاں سے ہٹ گئے اور ابن منصور نے بغداد چھوڑ دیا۔ حج کے لیے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔

حسین ابن منصور نے اپنے چار ہزار ہمراہیوں کے ساتھ حج کیا لیکن انھیں لوگوں سے جیسی اذیتیں پہنچ رہی تھیں اس کا بڑا اثر تھا۔ انھیں اس ہجوم میں اکثر کی منافقت پر غصہ بھی تھا اور افسوس بھی۔ وہ لوگ جو ابن منصور کو سمجھ نہیں سکتے انھیں کافر کیوں قرار دیتے ہیں۔ اس بات پر وہ بہت برہم تھے۔ انھوں نے میدانِ عرفات میں ہزاروں آدمیوں کے سامنے بآوازِ بلند دُعا مانگی: "اے اللہ! تو سرگرداں لوگوں کو راہ دکھانے والا ہے۔ اگر میں تیرے نزدیک بھی کافر ہوں تو میرے کفر میں اضافہ فرما دے۔"

لوگ توبہ استغفار کرتے ہوئے ان سے علیحدہ ہو گئے کیونکہ اب ان سب کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ ابن منصور مسلمان نہیں رہے، کافر ہو چکے ہیں۔ ابن منصور نے تنہائی میں خدا کے سامنے گریہ وزاری کی۔ روتے ہوئے دل جلے لہجے میں کہا: "اے خدا! تو دلوں کے بھید جانتا ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ میں تجھے واحد سمجھتا ہوں اور تیری ہی عبادت کرتا ہوں، کسی اور کی عبادت نہیں کرتا، اپنے عجز کی وجہ سے تیرے انعامات کا شکریہ بھی نہیں ادا کر سکتا لہٰذا اگر تو میری خواہش جاننا چاہتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اپنا شکر تو خود ادا کر لے اس لیے کہ بندوں سے تیرا شکر کسی طرح بھی ادا نہیں ہو سکتا۔"

اب ابن منصور کے افکار اور اعمال میں زیادہ شدت پیدا ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور مریدوں کو جو خطوط لکھے، ان کا لب و لہجہ انتہائی آزادانہ اور ہوش رُبا ہوتا تھا۔ آپ نے ایک مرید کو خط لکھا۔

"مِن جانب ارحم الراحمین، بنام بندۂ خدا — تم نے پوچھا تھا کہ ابلیس نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا۔ ہر چند کہ یہ راز ایسا نہیں تھا جسے چھپایا جاتا لیکن لوگوں نے چھپایا۔ اس کا جواب میں دیتا ہوں، ابلیس بہت بڑا موحد تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنے

رب کا بھی وہ حکم نہیں مانا جس میں شرک کی بُو پائی جاتی تھی۔"

اس نوع کے خطوط خلیفہ کے ملاحظے میں بھیج دیے گئے اور اس سے درخواست کی گئی کہ "ابنِ منصوُر جیسی باتیں کر رہا ہے اس سے ایک عالَم گمراہ ہو جائے گا اور فتنوں کا ایسا در کھُلے گا کہ اسے بند کرنا ناممکن ہو جائے گا۔"

قمری سن کے اعتبار سے ۵۳ سال کی عمر میں (۲۹۷ھ) ابنِ داؤد اصفہانی کے فتوے کی بنیاد پر ابنِ منصوُر گرفتار کر لیے گئے لیکن ایک سال بعد قید خانے سے فرار ہو کر سوس چلے گئے اور وہاں پوشیدہ طور پر رہنے لگے لیکن کب تک خاموش رہتے؟ یہاں سے انھوں نے جو خطوط لکھے وہ بھی بڑے تند و تیز تھے۔ اب انھوں نے "انا الحق" کا نعرہ لگایا۔ 'انا الحق' یعنی 'میں ہی وجودِ خداوندی ہوں'۔ یہ ایسا نعرہ تھا جس نے دُور دُور تک زلزلہ برپا کر دیا۔ بڑے بڑے کانپ گئے۔ ذی فہم اور واقفِ اسرار کسی متوقع ہنگامے کی فکر میں گُنگ ہو گئے۔ نادان اور نااہل مشتعل ہو گئے اور ابنِ منصوُر پر سنگ باری کرنے لگے۔

انھوں نے ایک بار پھر اپنے مریدوں کو جو خطوط لکھے اور ان میں جن افکار اور خیالات کا اظہار فرمایا وہ ملا اور فقہا کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ انھوں نے لکھا۔

"من جانب ارحم الرّاحمین بنام بندۂ خُدا ___ تم نے ادیانِ عالم کی بابت جاننا چاہا ہے تو لو سنو اور غور کرو، تمام دین حقیقت میں ایک ہیں ان کا اختلاف فروعات میں ہے۔ تمام ادیان کا مرکز اور منبع خدا ہے اور یہ دین خدا کے لیے ہیں، ہر دین سے کوئی نہ کوئی گروہ وابستہ ہے اور یہ وابستگی انسانوں کی اپنی مرضی سے نہیں ہے بلکہ اس میں کسی بالادست قوت کی مرضی کارفرما ہے۔ وہ صرف اللہ ہے جو اپنے بندوں پر اپنی مشیت نافذ کرتا ہے اور یہ صرف خدا ہے جو اپنے بندوں کے بارے میں یہ فیصلے کرتا ہے کہ فلاں شخص یہودی ہو، فلاں عیسائی بنے اور فلاں کسی مسلمان کے گھر میں پیدا ہو۔ لہٰذا اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ یہ کہ کسی کو کسی کے دین پر معترض نہیں ہونا چاہیے اور نہ دین کے اختلاف پر کسی سے نفرت کرنی چاہیے۔ سارے دین خدا کے لیے ہیں اور جو شخص جو دین بھی اختیار کرتا ہے وہ حقیقتہً خدا کی مشیت پوری کرتا ہے۔"

۳۰۱ھ میں وہ دوبارہ گرفتار کر لیے گئے اور انھیں بغداد کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ بغداد اور اس کے آس پاس دُور دُور تک ابنِ منصوُر کی گرفتاری کی خبر پھیل گئی اور لوگ قید خانے میں ملاقات کے لیے پہنچنے لگے۔ انھی میں جنید بغدادی کے مشہور مُرید اور صاحبِ حال بزرگ ابوبکر شبلی بھی شامل تھے۔ شبلی بھی کچھ کم بے باک نہیں تھے۔ ان کا انداز بھی نہایت جارحانہ رہتا تھا۔ شبلی نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ ابنِ منصوُر کو اس کے جرم میں وہ خود قتل کر دیں۔ جب یہ اس نیت سے قید خانے میں داخل ہوئے تو ابنِ منصوُر نے دیکھتے ہی سوال کیا۔ "شبلی! کیا تم مجھے واقعی قتل کر دینا چاہتے ہو؟"

شبلی نے جواب دیا۔ "تیرا جُرم ناقابلِ معافی ہے۔"

ابنِ منصوُر نے حیرت اور افسوس سے کہا۔ "شبلی! تم بھی مجھے مجرم کہہ رہے ہو اور میرے مسلک کو جرم قرار دے رہے ہو؟"

شبلی نے جواب دیا۔ "تو نے اسرارِ خداوندی کو عامیوں پر کھول دیا ہے۔ تجھے ضبط اور احتیاط سے کام کرنا تھا۔"

ابنِ منصوُر نے افسوس سے کہا۔ "جب تک میں برداشت کر سکا برابر برداشت کرتا رہا لیکن اب معاملہ ضبط اور احتیاط کی دسترس سے نکل چکا تھا۔"

شبلی نے کہا۔ "پھر بھی تمھیں 'انا الحق' اور 'من جانب ارحم الرّاحمین' جیسے کلمات سے بچنا چاہیے تھا۔"

ابنِ منصوُر نے پوچھا۔ "کیا یہ واقعی اتنے بڑے جرم ہیں کہ مجھے معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

شبلی نے جواب دیا۔ "یہ بات فقیہانِ شہر ہی سمجھ سکتے ہیں یعنی وہ چاہیں تو معاف کر دیں اور نہ چاہیں تو مقدمہ چلاتے رہیں۔"

ابنِ منصوُر نے کہا۔ "شبلی! ایک بات میری بھی سُن لو، تم دیکھ رہے ہو کہ مجھ پر دیوانگی طاری ہو چکی ہے اور میں خود ہی اپنی موت کو دعوت دے رہا ہوں۔ ان حالات میں مجھے تم قتل نہ کرو، یہ گناہ کسی اور کو کرنے دو۔"

لوگوں نے جنید بغدادی سے دریافت کیا۔ "حضرت! حسین ابنِ منصوُر جو کچھ کہتے ہیں اس میں کوئی تاویل ممکن ہے یا نہیں کیونکہ اس کے بغیر وہ رہا نہیں کیے جائیں گے اور انھیں قتل کر دیا جائے گا۔"

جنید بغدادی نے جواب دیا۔ "اب تم لوگ خاموش ہو جاؤ کیونکہ تاویل کا وقت نکل چکا ہے، جو ہو رہا ہے اسے ہو جانے دو۔" ان لوگوں نے قید خانے میں ابنِ منصوُر سے ملاقات کی اور کہا۔

"ابنِ منصوُر! خلیفۂ وقت تم سے بہت ناراض ہیں لیکن اب بھی اتنا وقت باقی ہے کہ اگر تم انا الحق نہ کہو اور اپنے خطوط کا لب و لہجہ بدل دو تو تمھیں رہا کرایا جا سکتا ہے۔"

ابنِ منصوُر نے جواب دیا۔ "میں مجبوُر ہوں، تم اپنا کام کرو، میں اپنا کام انجام دے رہا ہوں کیونکہ ہم دونوں اپنے اپنے ذمے سونپی ہوئی خدمات انجام دینے پر مجبور ہیں۔"

چند عقیدت مند ان سے رات میں ملنے گئے لیکن ابنِ منصوُر قید خانے میں موجود نہ تھے۔ پہرے دار گھبرا گئے اور پوری رات تلاش

اور جستجو میں گزار دی لیکن صبح یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ابنِ منصُور اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ دُوسری شب اس سے بھی زیادہ عجیب واقعہ پیش آیا۔ ابنِ منصُور کے معتقد پُوری رات قید خانہ تلاش کرتے رہے۔ نہ قید خانہ مِلا' نہ ابنِ منصُور سے ملاقات ہوئی لیکن تیسری شب دونوں ہی مل گئے۔ ابنِ منصُور بھی اور قید خانہ بھی۔ لوگوں نے ابنِ منصُور سے اس کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا "ہاں' پہلی شب میں قید خانے میں موجود نہیں تھا، رسُول اللہؐ کی خدمت میں چلا گیا تھا"

کسی معتقد نے پوچھا "اور دُوسری شب ۔۔۔؟ ہم ساری رات قید خانہ تلاش کرتے رہے لیکن یہ نظروں سے اوجھل ہی رہا' آخر یہ کیا تھا؟"

ابنِ منصُور نے جواب دیا "ہاں' دوسری شب رسُول اللہؐ خود تشریف لے آئے تھے اس لیے آپ کی موجودگی میں قید خانہ اپنی حیثیت کھو بیٹھا تھا"

کسی مرید نے کہا "اگر آپ چاہیں تو یہاں سے فرار ہوسکتے ہیں"

"ہاں" ابنِ منصُور نے کہا "لیکن میں تحفظِ شریعت کی خاطر یہاں رہنے پر مجبُور ہوں"

قید خانے میں پوری پوری رات نماز میں گزر جاتی تھی۔ کسی نے ازراہِ مذاق سوال کیا "جب آپ نے 'انا الحق' کا نعرہ بلند کر دیا ہے یعنی وجودِ خداوندی آپ خود ہیں تو پھر یہ نماز کس کی پڑھتے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا "ہم اپنا مرتبہ خود سمجھتے ہیں"

جس قید خانے میں ابنِ منصُور قید تھے' وہاں تین سو قیدی اور موجود تھے۔ انھوں نے ایک دن قیدیوں سے کہا "اگر تم لوگ خواہش کرو تو میں تمھیں رِہا کرا سکتا ہوں"

قیدی انھیں دیوانہ سمجھتے تھے۔ ان میں سے کسی نے جواب دیا۔ "اگر تم میں اتنی ہی طاقت ہے تو تم خود کیوں رِہا نہیں ہو جاتے؟"

ابنِ منصُور نے کوئی جواب تو دیا نہیں' ایک ہلکا سا اشارہ کیا جس سے پیروں میں پڑی ہوئی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ قیدی حیرت سے ان کی صُورت تکنے لگے۔ آپ نے قیدیوں سے کہا "تم میری صُورت مت دیکھو بلکہ یہاں سے نکل بھاگنے کے لیے تیار ہو جاؤ"

قیدیوں نے کہا "قید خانے کے کئی دروازے ہیں اور یہ سبھی مقفل ہیں۔ پیروں کی زنجیریں ٹوٹ جانے سے رِہائی کا مسئلہ کہاں حل ہوتا ہے؟"

آپ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اُنگلی سے کھل جانے کا اشارہ کیا۔ دروازہ خود بخود کھُل گیا۔ آپ نے قیدیوں سے کہا "تم لوگ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ جس طرح یہ دروازہ کھُلا ہے' اسی طرح بقیہ دروازے بھی کھلے ہوئے ملیں گے، تمھارا کام یہاں سے نکل جانا ہے۔

عمرے اور مقاماتِ مقدّسہ کی زیارت ہو یا کاروباری یا تفریحی سفر،

اگر آپ مقدّس مقامات' مدینۂ طیّبہ' کربلائے معلّٰی' نجفِ اشرف' کاظمین شریف' بغداد شریف' مشہدِ مقدس کی زیارت سے مشرف ہونا چاہتے ہوں یا کاروبار، تفریح، ملازمت، عزیز و اقارب سے ملنے کے لیے دنیا کے کسی ملک کو جانا چاہتے ہوں، سفر کی ہر ممکن سہولت اور آسائش کے لیے ہم سے رجوع فرمائیے۔

ٹورالئو لمیٹڈ
اینڈ ٹور آپریٹر

بمبئی ہوٹل بلڈنگ
آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی ۱
فون:۔ ۲۲۶۲۵۸

اب مزید دیر نہ کرو۔"

قیدی ابنِ منصور کے بغیر جانے پر آمادہ نہ تھے۔ انھوں نے کہا۔ "ہمارے ساتھ آپ بھی چلیے۔"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔" میں یہیں ٹھیرے رہنے پر پابند کر دیا گیا ہوں۔ تم ان چکروں میں مت پڑو، میں جو کہہ رہا ہوں، اس پر عمل کرو۔"

مجبوراً سارے قیدی فرار ہو گئے۔

اس واقعے نے ایک تہلکا مچا دیا۔ آپ سے بہت سارے سوالات کیے گئے لیکن آپ نے انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ" مجھ سے جو پوچھنا ہے، صاف صاف پوچھو۔ میں نے سارے قیدیوں کو رہا کر دیا ہے۔ خود میں بھی فرار ہو سکتا تھا لیکن محض اس لیے رُک گیا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے یا جو کچھ لکھا ہے تحفظِ شریعت کی خاطر میں اس کی سزا بھی بھگت لوں۔"

لوگوں نے اس عجیب و غریب واقعے کی اطلاع خلیفہ کو دی اور درخواست کی کہ ابنِ منصور کے لیے جو فیصلہ مناسب ہو، فی الفور سنا دیا جائے کیونکہ یہ عجیب و غریب شخص کسی وقت بھی قید خانے سے فرار ہو سکتا ہے۔"

خلافت کی طرف سے حکم ملا کہ ابنِ منصور سے آخری بار ان کے افکار و اعمال پر جرح کی جائے، اگر وہ اس سے تائب ہو جائیں تو انھیں چھوڑ دیا جائے اور دوسری صورت میں علمائے عصر اور فقہائے عہد سے ان کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ طلب کیا جائے اور فتوے کے حصول کے بعد انھیں قتل کر دیا جائے۔"

فقہائے شہر اور علمائے عصر قید خانے میں ابنِ منصور سے ملے اور ان سے سوال کیا۔" ابنِ منصور! تم 'انا الحق' کا نعرہ لگا کے اپنی خدائی کا اعلان کر رہے ہو، کیا یہ کفر نہیں ہے؟"

ابنِ منصور نے کہا۔" تم لوگ اپنے سارے الزامات گنا دو، میں ان سب کا ایک ساتھ جواب دوں گا۔"

ان لوگوں نے ابنِ منصور کے وہ خطوط پیش کیے جو "من جانب ارحم الراحمین" سے شروع کیے گئے تھے۔ انھوں نے کہا۔" کچھ عرصے پہلے تک تو ہم سب کا یہ خیال تھا کہ تم پیغمبری کا دعوا کرنے والے ہو لیکن تمھارے خطوط اور نعرۂ انا الحق سے یہ انکشاف ہوا کہ تم خدا ہو، آخر یہ سب کیا ہے؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔" میں نے اپنی خدائی کا دعوا کب کیا ہے، بلکہ یہ تو وہ چیز ہے جسے ہم صوفی عین الجمع (ارادۂ خداوندی کے ساتھ اتصالِ کامل) کہتے ہیں۔ میں نے اپنے خطوں میں "من جانب ارحم الراحمین" لکھا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کاتب ہے اور خود میں آلۂ کتابت ہوں۔"

جب خلیفہ کے سامنے یہ تاویل پیش کی گئی تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ انھیں قتل کر دیا جائے۔

جب یہ قتل کیے جانے کی غرض سے باہر لائے گئے تو لاکھوں تماشائی انھیں دیکھنے کی غرض سے جمع ہو گئے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی لوگوں نے پتھر مارنے شروع کر دیے۔ اس مجمع میں ابو بکر شبلی بھی تھے، انھوں نے مٹّی کا چھوٹا سا ڈھیلا اٹھا کر ابنِ منصور کے مارا تو یہ پتھروں کی مار پر اُف نہ کرنے والا "آہ" کر بیٹھا۔ کسی نے پوچھا۔" جناب پتھروں کی مار تو ہنسی خوشی جھیل گئے لیکن ذرا سے مٹّی کے ڈھیلے کی چوٹ سے کراہنے لگے، یہ کیا بات ہے؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔" یہ ڈھیلا شبلی نے مارا تھا جو میرا محرمِ راز ہے، نادانوں کے مارنے سے اذیت نہیں پہنچتی لیکن واقفِ حال کی مار برداشت نہیں ہوتی۔"

پہلے ان کے تین سو کوڑے لگائے گئے۔ کوڑے کی ہر ضرب پر کوڑے لگانے والے نے ایک پُراسرار آواز سُنی جو ابنِ منصور سے مخاطب تھی، وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی۔" یا ابنِ منصور، لاتخف۔ یا ابنِ منصور لاتخف (اے ابنِ منصور خوف زدہ مت ہو، اے ابنِ منصور خوف زدہ نہ ہو)

تین سو کوڑے کی ضربات اس طرح جھیل گئے کہ منہ سے اُف تک نہ کی۔ اس وقت آپ نے عربی کے یہ شعر پڑھے۔

ندیمی غیر منسوب الی شیٔ من الحیف	سقانی مثل ما یشرب کفعل الضیف بالضیف
فلما دارت الکاس دعی بالنطع والسیف	کذا من یشرب الراح مع التنین بالصیف

(میرا ندیم ذرا سا بھی ظالم نہیں ہے۔ اس نے مجھ کو ایسی شراب عطا کی ہے جو میزبان مہمان کو دیا کرتا ہے اور جب جام کے کئی دور چل چکے تو اس نے تلوار اور چمڑے کی بساطِ طلب کی اور کہا کہ اس شخص کی یہی سزا ہے کیونکہ اس نے اژدہے کے سامنے سخت گرمی میں شراب پینے کی جسارت کی ہے۔)

قتل کیے جانے سے کچھ دیر پہلے کسی نے پوچھا۔" عشق کیا ہے؟"

جواب دیا۔" آج، کل اور پرسوں میں اس کا جواب موجود ہے۔"

ابو بکر شبلی نے سوال کیا۔" تصوّف کسے کہتے ہیں؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔" تم جو کچھ دیکھ رہے ہو، یہ تصوّف کا ادنا درجہ ہے اور اس کے اعلا درجے سے کوئی بھی واقف نہیں۔"

انھیں قید خانے کے باہر سیڑھی پر کھڑا کر دیا گیا، جلاد آگے بڑھا اور آپ کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے۔ آپ نے اُف کیے بغیر فرمایا۔ "گو میرے ظاہری ہاتھ کاٹ دیے گئے ہیں لیکن باطنی ہاتھ محفوظ ہیں،

Waqar Azeem Pakistanipoint

انھیں کون کاٹ سکتا ہے، اور یہی وہ ہاتھ ہیں جنھوں نے ہمت کا تاج عرش کے سر سے اُتار لیا ہے۔"

جلّاد کوئی پروا کیے بغیر پیروں کی طرف رجوع ہو گیا اور دونوں پیر کاٹ ڈالے۔ آپ نے فرمایا: "تم نے میرے ظاہری پاؤں کاٹ دیے، کوئی پروا نہیں کیونکہ ابھی باطنی پاؤں موجود ہیں اور تم انھیں نہیں کاٹ سکتے اور یہی وہ پاؤں ہیں جن سے میں اب بھی دونوں عالم کا سفر کر سکتا ہوں۔"

اس کے بعد آپ نے خون کے فوارے چھوڑتے ہوئے ہاتھ چہرے سے لگا لیے اور کہا: "لوگو! میری جواں مردی تم بھی دیکھ لو، میں سُرخ رو ہوں کیونکہ خون جواں مردوں کا اُبٹن ہوتا ہے۔"

پھر ہتھیلیوں اور انگلیوں سے محروم ہاتھوں کو کہنیوں سے لگا لیا اور بہتے ہوئے خون کو کہنیوں پر پھیرتے ہوئے کہا: "لوگو! میں نمازِ عشق کے لیے وضو کر رہا ہوں کیونکہ عشق کی نماز خون کے وضو کے بغیر ادا نہیں کی جا سکتی۔"

اس کے بعد آنکھوں کی باری آگئی اور دونوں آنکھیں بھی نکال لی گئیں۔ آنکھوں کے بعد زبان کا نمبر آگیا۔ آپ نے کہا: "بس ذرا توقف کرو اور مجھے ایک بات کہہ لینے دو۔" اس کے بعد اُوپر دیکھتے ہوئے کہا: "اے اللہ! میرے ہاتھ پیر تیرے راستے میں کاٹ دیے گئے، آنکھیں تیرے لیے نکال لی گئیں۔ ذرا دیر بعد زبان بھی کاٹ دی جائے گی۔ میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھے یہ حوصلہ بخشا کہ میں ساری اذیتیں اُف کیے بغیر جھیل گیا۔ اب میری تجھ سے التجا ہے کہ تو نے جس دولت سے مجھے سرفراز کیا ہے، اس سے ان سب کو بھی نواز دے۔"

پھر ایک ادائے خاص سے فرمایا: "یکتا کی دوستی بھی یکتا کر دیتی ہے۔"

اس کے بعد زبان بھی کاٹ دی گئی اور سب سے آخر میں سر قلم کر دیا گیا۔ کہتے ہیں اس وقت ہر طرف سے "انا الحق" کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دوسرے دن لاش جلا دی گئی اور تیسرے دن ان کی راکھ دریائے دجلہ میں بہا دی گئی۔

ابوبکر شبلی کو اس سانحے سے بڑا دُکھ پہنچا۔ ابنِ منصور جس جگہ قتل کیے گئے تھے، شبلی وہاں رات بھر عبادت کرتے رہے۔ صبح کے وقت انھوں نے مناجات میں خدا سے سوال کیا: "الٰہ العالمین! ابنِ منصور کی بابت جہاں تک میں جانتا ہوں وہ ایک مومن تھا اور ایک ایسا عارف اور محب جو وحدانیت پرست تھا، تو نے اسے اتنی اذیتوں سے قتل کرا دیا۔ یہ کیا بات ہے۔" اسی عالم میں شبلی پر غنودگی کا غلبہ ہوا۔ انھوں نے سُنا کوئی کہہ رہا تھا: "ہم نے ابنِ منصور کے ساتھ یہ سلوک اس لیے کرایا کہ وہ ہمارے رازوں کو برملا ظاہر کرتا پھرتا تھا۔"

کچھ دنوں بعد شبلی نے ابنِ منصور کو خواب میں دیکھا۔ شبلی نے پوچھا: "ابنِ منصور! کہو کیسے ہو؟ خدا نے تم سے کیسا سلوک کیا؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا: "مجھے یہاں مقامِ صدق عطا ہوا ہے۔"

شبلی نے پوچھا: "ابنِ منصور! یہ تو بتاؤ، جب تک تم دُنیا میں رہے تمھارا دو گروہوں سے واسطہ رہا۔ ایک تو وہ جو تمھاری عزت کرتا تھا اور تمھیں حق پر سمجھتا تھا اور دوسرا وہ جو تمھیں بُرا کہتا تھا اور جس نے تمھیں قتل کرا دیا۔ اس کی بابت تمھاری کیا رائے ہے؟"

ابنِ منصور نے مسکرا کر جواب دیا: "شبلی! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں جو کچھ دنیا میں کہتا تھا، اس سے منحرف ہو گیا ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ پہلا گروہ جس نے مجھے پہچان لیا تھا میرے ساتھ اچھی طرح پیش آیا اور مجھ پر مہربانیاں کیں اس پر خدا نوازشیں فرمائے گا اور دوسرا گروہ، جو مجھے پہچاننے سے قاصر رہا اور اس نے میرے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا۔ خدا اسے بھی اپنی مہربانیوں سے نوازے گا اور ان کی خطائیں معاف کر دی جائیں گی۔"

شبلی نے حیرت سے پوچھا: "وہ کیوں؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا: "محض اس لیے کہ دوسرے گروہ نے جو کچھ کیا، خدا کے لیے کیا تھا، وہ حق پر حرف آتے ہوئے نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ انسانی دعوائے خدائی پر خاموش نہ رہ سکتا تھا۔"

جس شخص نے قتل کیے جانے سے پہلے ابنِ منصور سے پوچھا تھا کہ عشق کیا ہے؟ اور آپ نے یہ جواب دیا تھا کہ "آج کل اور پرسوں میں اس کا جواب موجود ہے۔" ان تین دنوں میں جو کچھ ابنِ منصور پر بیت گیا تھا، اس سے سوال کرنے والا لرز گیا اور بحالتِ سراسیمگی میں کہا: "اگر یہی عشق ہے تو عشق کے کتنے دعوے دار اس راہ پر چلنے کا دعوا کر سکتے ہیں؟ شاید ایک بھی نہیں۔"

انسان کے گرد مختلف ناموں کی بہت ساری دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں اور یہ دیواریں خود انسان نے کھڑی کی ہیں، اپنے اقوال اور افعال کا پابند اور افکار کے اظہار میں مجبورِ محض اور شاید یہی وہ بوجھ ہے جس کو اٹھانے سے فرشتوں تک نے انکار کر دیا تھا، انسان نے اسے اُٹھا لیا اور اس کی سزا بھگت رہا ہے ورنہ ؎

مشکل ہے تو ایک ہماری، دار کا خطرہ رہتا ہے

ورنہ موجودات کا ذرّہ ذرّہ 'انا الحق' کہتا ہے!

اپریل ۱۹۷۴ء

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"وہ پانچویں منزل کی بالکونی دیکھو۔" باکوف نے اپنے ساتھی موریلے کی طرف دوربین بڑھاتے ہوئے کہا۔ "وہ عورت آج پھر بیراکی کے لباس میں آفتابی غسل کر رہی ہے اب یہ اس کا روز کا معمول ہوتا جا رہا ہے۔"

موریلے کی عمر ستر سال سے زیادہ تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قد آدمی تھا۔ دور سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہڈیوں کا کوئی ڈھانچا پھول دار قمیص اور گہری نیلی پتلون پہنے بیٹھا ہے۔ اس کا ساتھی باکوف قد و قامت اور حلیے میں اس سے مختلف تھا۔ عمر تو اس کی بھی ساٹھ ستر کے لگ بھگ تھی لیکن وہ ایک پستہ قد اور موٹا تازہ آدمی تھا۔

"چھوڑو بھی۔ بیراکی کے لباس تو مجھے روز نظر آتے ہیں۔" موریلے نے بور ہوتے ہوئے کہا۔

"لیکن لباسوں میں ایسی چیز کہاں نظر آتی ہے؟ تم دیکھو تو سہی۔" باکوف نے اصرار کیا۔

موریلے نے بے دلی سے دوربین لے کر عمارت کی پانچویں منزل پر نظر ڈالی۔ چند لمحوں تک وہ اسی بالکونی پر دوربین جمائے رہا پھر اس نے اس کا رخ سمندر کی طرف کر دیا۔ "کیا بات ہے موریلے؟" باکوف نے تشویش سے کہا۔ "آج تمہیں یہ ہو کیا گیا ہے؟ کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" موریلے نے دوربین آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔ وہ دونوں اس وقت کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ کرسیاں سرخ اینٹوں والی عمارت کی دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ یہ عمارت سمندری ساحل کے ساتھ تھی اور بوڑھوں کے رہنے کے لیے خاص طور پر بنائی گئی تھی۔ ایسے بوڑھوں کے لیے جنہیں کھلی ہوا اور دھوپ کی ضرورت ہوتی ہے اور جن کی آمدنی زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ بہت بڑی عمارت تھی۔ اس میں چھوٹے چھوٹے بے شمار کمرے تھے۔ کمروں کے کرائے اتنے کم تھے کہ پنشن پانے والے سبکدوش لوگ اپنی قلیل آمدنی کے باوجود ان میں رہ سکتے تھے۔ عمارت اپنے محل وقوع کی وجہ سے ضعیفوں میں بہت مقبول تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ آٹھ بجے تھے۔ باہر شبنم کی وجہ سے گھاس گیلی ہو رہی تھی۔ عمارت کے دوسرے مکین ابھی ناشتے میں مصروف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں وہاں تنہا تھے اور فطری نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"آج تمہارا موڈ کیوں خراب ہے؟" باکوف نے کچھ حیرت سے کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ ہم نے ساری عمر جھک ماری۔ ہمیشہ دیانتداری اور محنت سے کام کیا مگر اس کا صلہ کیا ملا؟ مجھے دیکھو، ہر ہفتے چند ڈالر

دو شریر بوڑھوں کی شوخیاں
نوجوانوں کے لیے
مغرب کی ایک
تلخ، تند، رس بھری تحریر

★ اسٹیفن وینی ڈیکنڈ

★ جاوید مرتضیٰ

کرنی الاؤنس

پنشن ملتی ہے۔ میں ساری رقم کرائے میں دے دیتا ہوں۔ اتنے پیسے بھی نہیں بچتے کہ بس میں بیٹھ کے ایک آدھ بار شہر کا چکر لگا آؤں۔ اگر کسی طرح شہر چلا بھی جاتا ہوں تو وہاں خالی ہاتھ گھومنے میں مزہ نہیں آتا۔"

"تو کچھ پیسے مجھ سے لے لو۔ میرا لڑکا مجھے ہر ہفتے پانچ ڈالر جیب خرچ بھیجتا ہے" باکوف نے بڑے خلوص سے کہا۔

"پانچ ڈالر سے کیا ہوتا ہے؟" مورلے نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ہم دونوں نے زندگی بھر بڑی محنت اور دیانتداری سے کام کیا ہے مگر ہمیں حاصل کچھ نہیں ہوا، کچھ بھی نہیں۔ ہم نے ساری عمر قانون کی پابندی کی۔ نتیجہ دیکھ لو کہ آج ہمارا کیا حشر ہے؟ جو کچھ ہم نے پس انداز کیا تھا، وہ روز افزوں مہنگائی کی نذر ہو گیا۔ شاید تمھیں معلوم نہیں ہے باکوف کہ کل اس عمارت کے مالک نے کہہ دیا ہے کہ آئندہ مجھے اپنے کمرے کا کرایہ ہر ہفتے دس ڈالر زیادہ دینا پڑے گا۔ اس نے جواز یہ پیش کیا ہے کہ مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے وہ کہہ رہا تھا کہ اگر مجھے یہ اضافہ منظور نہ ہو تو میں کمرہ خالی کر دوں۔ کیوں کہ کئی اُمیدوار صرف دس نہیں بلکہ پندرہ ڈالر فی ہفتہ زاید دینے کے لیے تیار ہیں۔ اب بتاؤ، میں یہ مزید دس ڈالر کہاں سے لاؤں گا؟ یا دوسری صورت میں کہاں سر چھپاؤں گا؟"

"اچھا، عمارت کا مالک کرایہ بڑھا رہا ہے؟" باکوف کے گول مٹول چہرے سے حیرت ہویدا ہوئی۔ "اس نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا؟"

"ممکن ہے آج وہ تم سے بھی بات کرے۔"

باکوف نے ایک گہرا سانس لیا۔ "پھر تو ہم دونوں کو اپنے اپنے کمرے چھوڑنے پڑیں گے۔ میں بھی دس ڈالر زائد ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن مورلے! اتنی اچھی جگہ چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ سمندری ساحل، کھلی ہوا اور نرم نرم دھوپ۔ یہ نعمتیں شہر میں کہاں میسر ہوں گی؟ تمھارا ایک لڑکا ہے وہ تمھاری مدد کرے گا، تمھیں کیا غم؟"

"نہیں دوست۔ اُس کا اپنا گھر بھی ہے، بیوی ہے، بچے ہیں۔ وہ مجھے دس ڈالر کیسے دے سکتا ہے۔"

"میں اس مسئلے پر کل رات سے غور کر رہا ہوں اور اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہم نے ساری عمر جھک ہی ماری۔" مورلے کا لہجہ بہت تلخ تھا۔ "میرا اشارہ ان سرمایہ داروں کی طرف ہے جو قانونی طور پر عوام کو لوٹتے ہیں اور حکومت کو پورا ٹیکس ادا نہیں کرتے۔ پھر وہ سیاستداں ہیں جو بڑی بڑی رشوتیں لے کر بڑے بڑے کام کراتے ہیں اور اگر کبھی پکڑے جاتے ہیں تو ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ تعلقات کی بنا پر معاملہ دبا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح سرکاری افسر ہیں جتنی تنخواہیں انھیں ملتی ہیں، اتنے پیسے تو وہ صرف پٹرول میں پھونک دیتے ہیں۔ ان کے بعد نمبر آتا ہے باقاعدہ چوروں، ڈاکوؤں، اسمگلروں اور بینک لوٹنے والوں کا۔ باکوف! میں کہتا ہوں کہ یہ سب لوگ بالکل ٹھیک کرتے ہیں، یہ ہمارے حال سے عبرت حاصل کر کے اپنے مستقبل کی فکر کرتے ہیں۔ جب یہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ان کے پاس اتنی ناجائز دولت جمع ہوتی ہے کہ انھیں کرایہ بڑھنے کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ میں کل رات بھر اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ کل شام تم نے اخبار پڑھا تھا باکوف؟ اس میں ایک بینک پر ڈاکا پڑنے کی خبر شائع ہوئی تھی۔ ایک آدمی کسی بینک کی خاتون خزانچی کے پاس گیا، اس نے اسے کاغذ کا ایک پرزہ دیا۔ پرزے پر لکھا تھا کہ خاموشی کے ساتھ دراز سے ساری رقم نکال کر میری ہتھیلی میں ڈال دو۔ ورنہ میرے پاس پستول موجود ہے، میں تمھارا بھیجا اڑا دوں گا۔ خزانچی نے پرزہ پڑھ کر انتہائی خاموشی کے ساتھ کپکپاتے ہاتھوں سے اس کی ہتھیلی میں چھ ہزار ڈالر ڈال دیے۔ ڈاکو رقم لے کر فرار ہو گیا۔ خاتون نے جب شور مچایا تو وہ باہر نکل کے سڑک کے ہجوم میں غائب ہو چکا تھا۔ مجھے یہ بتاؤ باکوف! اتنے بڑے شہر اور اتنی بڑی آبادی میں آخر پولیس اُس شخص کو کیسے تلاش کرے گی؟ جرم کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔ شرط صرف جرأت کی ہے۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہے کہ یہ خیال آج سے پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا؟"

"کیا تم بینک لوٹنا چاہتے ہو مورلے؟" باکوف نے غیر یقینی انداز سے اسے گھورا۔

"کیوں نہیں! کیا حرج ہے؟ بس ذرا سی جرأت کی ضرورت پڑے گی۔ اتنی جرأت مجھ میں موجود ہے۔"

"لیکن تمھارے پاس پستول کہاں ہے؟" باکوف نے اعتراض کیا۔ "ہم دونوں کے پاس ملا کر بھی کبھی اتنی رقم جمع نہیں ہو گی کہ ہم ایک سستا سا پستول خرید لیں۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تمھیں کہیں سے ایک پستول مل جائے تو تم اس کا کرو گے کیا؟ تمھیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہو گا کہ اس میں گولی کیسے ڈالی جاتی ہے اور پھر تم اپنے ہاتھ کا رعشہ کیوں بھولتے ہو؟ تم تو پستول سیدھا پکڑ بھی نہیں سکو گے۔"

مورلے نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "میں نے تمام زاویوں سے غور کر لیا ہے۔ ہمیں پستول کی ضرورت نہیں ہے۔ میں گتے کا ایک خالی ڈبا لے کر اس پر کاغذ وغیرہ چپکا دوں گا اور ایک پرزے پر یہ لکھ دوں گا کہ اس ڈبے میں بم موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح خالی ڈبے ہی سے کام چل جائے گا۔"

"کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟"

مورلے دور بین سے سامنے والی عمارت کی بالکونیاں دیکھنے لگا

کچھ دیر بعد اس نے دوربین آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "ہاں میں واقعی سنجیدہ ہوں باکوف! میں یہ جگہ کسی حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔ محلِ وقوع کے اعتبار سے مجھے یہ جگہ بہت پسند ہے۔ پُرسکون اور صحت افزا۔ یہاں کے منتظمین بھی اچھے ہیں، کرائے داروں کا ہر طرح خیال رکھتے ہیں اور کھانا بھی اچھا دیتے ہیں۔ اگر صرف دس ڈالر کی وجہ سے ہمیں یہ جگہ چھوڑنی پڑی تو پھر شہر کی کسی گندی بستی میں کوئی فلیٹ لینا پڑے گا جہاں راہگیر دن دہاڑے لوٹ لیے جاتے ہیں اور بوڑھوں کو تو کوئی چھوڑتا ہی نہیں۔ ایک تو جگہ گندی، صحت کے لیے نقصان دہ، اس پر لُٹ جانے کا خطرہ۔ پھر وہاں ہمیں کھانا بھی خود پکانا پڑے گا۔ میں پوچھتا ہوں باکوف! کیا تم ایسی جگہ رہنا پسند کرو گے؟"

"ہرگز نہیں۔" باکوف نے پوری سچائی سے جواب دیا۔

"اچھا تو یہ لو دوربین۔ اُدھر دیکھو، میری انگلی کی طرف۔ وہاں تمھیں کیا نظر آ رہا ہے؟"

باکوف نے دُوربین سے دیکھا۔ "وہ۔ وہ تو گیراج ہے۔ وہاں ایسی کیا خاص بات ہے؟"

"گیراج کے دائیں طرف دیکھو۔"

باکوف نے دُوربین دائیں جانب موڑ دی۔ "کیا تمھارا مطلب اُس بینک سے ہے؟"

"ہاں۔ وہ بینک اس قدر نزدیک ہے کہ ہمیں وہاں پہنچنے کے لیے بس کا کرایہ بھی نہیں دینا پڑے گا۔" موریے نے کہا۔

"ہمیں؟"

"ہاں۔ میں یہ عظیم کام تنہا تو کرنے سے رہا۔ مجھے تمھاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔"

"لیکن مجھے تو بینکوں کے متعلق کچھ نہیں معلوم۔"

"بینک لوٹنے کے لیے ان کے بارے میں کچھ معلوم ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ جو لوگ آئے دن بینک لوٹتے ہیں، کیا تم سمجھتے ہو کہ انھیں بینکوں کے متعلق سب کچھ معلوم ہوتا ہے؟ نہیں باکوف! وہ بس دروازے سے اندر گھستے ہیں اور بینک لوٹ کر اسی دروازے سے فرار ہو جاتے ہیں۔"

"اندر جاؤ اور بینک لوٹ کر باہر آ جاؤ! بڑا آسان کام ہے۔" باکوف نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "تم بینک کے مسلح محافظوں اور پولیس والوں کو بھول رہے ہو۔ وہ بے تکلف گولی مار دیتے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہوتا باکوف!" موریے نے اصرار کیا۔ "ہم روزانہ اخبارات میں بینک لٹنے کی خبریں پڑھتے ہیں۔ اگر یہ ایسا مشکل کام ہوتا تو اتنے بہت سے لوگ اس میں اپنی قسمت نہ آزماتے۔ میں کہتا ہوں، ہر سال اتنے بینک لوٹے جاتے ہیں کہ اگر ہم حساب لگائیں تو معلوم ہوگا کہ امریکہ میں ہر دس آدمیوں میں سے ایک آدمی نے اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی کوئی بینک ضرور لوٹا ہوگا۔ رہا صرف سوچنے کا سوال تو ہر دس آدمیوں میں سے پورے دس آدمی کبھی نہ کبھی بینک لوٹنے کے بارے میں ضرور سوچتے ہوں گے۔ بس ان میں جرأت کی کمی ہوتی ہے۔ میں نے کل رات پورا منصوبہ تیار کر لیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ہم صد فی صد کامیاب لوٹیں گے۔"

"اور اگر پکڑے گئے تو؟"

"پکڑے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" موریے نے کہا۔ "اور فرض کرو، اگر ایسا ہوا بھی تو پولیس ہمارا کیا بگاڑ لے گی؟ ہم بوڑھے تو ہو ہی چکے ہیں۔ زیادہ عرصے زندہ رہنے کے امکانات بہت کم ہیں اس لیے اگر چند سال جیل میں گزر جائیں گے تو کیا فرق پڑے گا؟ ہمارا مستقبل تو برباد ہوگا نہیں۔ ہماری ملازمتیں بھی نہیں چھٹیں گی، ہمارے بچوں کی زندگی بھی تباہ نہیں ہوگی۔ جتنی مدت ہم جیل میں رہیں گے، تمام اخراجات سے جان چھوٹ جاتے گی، مکان کا کرایہ، کھانے پینے کا خرچ، کپڑوں کی دھلائی وغیرہ کے اخراجات۔ اس صورت میں بھی یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہوگا۔" موریے نے دُوربین باکوف سے لے کر اپنی آنکھوں پر لگا لی۔ اس کے پتلے پتلے سوکھے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ہم پکڑے نہیں جائیں گے۔ میں نے ہر پہلو سے غور کر لیا ہے۔ میں نے تو پٹرول پمپ، ڈیپارٹمنٹل اسٹور، شراب خانے اور پنساریوں کی دکانیں تک لوٹنے کے بارے میں غور کیا لیکن اس مقصد کے لیے بینک سے زیادہ مناسب جگہ کوئی نظر نہیں آئی۔"

"ہمارا جو قصائی ہے تم نے کبھی اسے لوٹنے کے بارے میں بھی غور کیا ہے؟" باکوف نے دریافت کیا۔ "وہ برسوں سے محلے والوں کی کھال اتار رہا ہے۔ کیوں نہ اُسے لوٹ لیا جائے؟"

"تم میری باتوں پر پوری توجہ نہیں دے رہے ہو باکوف!" موریے نے شکایت کی۔ "میں کہتا ہوں، آخر قصائی کو لوٹنے سے ہمارے ہاتھ کیا آئے گا؟"

"اسے صبح سے دوپہر تک نوٹ گننے سے فرصت نہیں ملتی موریے!"

"ٹھیک ہے مگر ہمارے مقصد کے لیے بینک انتہائی موزوں مقام ہے۔ اسی بینک کی مثال لے لو جو میں نے تمھیں ابھی دکھایا ہے۔ وہ ایک چھوٹا سا بینک ہے۔ اس کا صرف ایک دروازہ ہے۔ دوپہر کے وقت اس کے باہر فٹ پاتھ پر خوب چہل پہل رہتی ہے۔ بینک کا محافظ یا پولیس والے اتنے بھرے پرے علاقے میں گولی چلانے کی جرأت ہرگز نہیں

Waqar Azeem Pakistanpoint.Com

کریں گے۔ ہم آسانی سے راہگیروں میں شامل ہو کر رفوچکر ہو جائیں گے۔"

"میں اپنے مٹاپے کی وجہ سے صرف دو قدم بھاگنے سے بھی ہانپنے لگتا ہوں۔ مجھے خون کے دباؤ کی شکایت بھی ہے کیا تم مجھ سے دوڑنے کی امید رکھتے ہو؟"

مورلے نے بے صبری سے کہا۔ "میں دوڑنے کو نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ عام آدمیوں کی طرح تیز تیز قدم اٹھانے کو کہہ رہا ہوں۔ راہگیروں کی بھیڑ میں ہمیں کوئی تلاش نہیں کر سکے گا اور اگر دوڑنے کی ضرورت پیش آئے تو تم نہ دوڑنا۔ یہ کام میں کر لوں گا۔"

"تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے مورلے!" باکوف نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ "اگر تم دوڑے تو دیکھنا، تمھیں دل کا دورہ پڑ جائے گا۔"

ٹھیک اسی وقت سفید بالوں والی بوڑھی عورت چھڑی کا سہارا لیتی ہوئی ان کے سامنے سے گزری۔ وہ چند قدم کے فاصلے پر جا کے ایک اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ "چلو میرے کمرے میں چلو۔" مورلے نے باکوف کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ مس اریکا ہماری گفتگو سنے۔"

مورلے کا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ مورلے نے اندر داخل ہو کر دروازہ اچھی طرح بند کر لیا۔

"میرا خیال ہے کہ کسی کو لوٹنے کا ارادہ ہی سرے سے غلط ہے۔" باکوف نے کہا۔

"بینک ہمیشہ بیمہ شدہ ہوتے ہیں۔ ہم جو بینک لوٹیں گے اُس کا سارا نقصان بیمہ کمپنی ادا کرے گی اور ہمیں جو چند ہزار ڈالر ملیں گے، ان سے ہمارے آیندہ چند سال اطمینان سے بسر ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں باکوف! ہم زیادہ عرصے زندہ نہیں رہیں گے۔ تم دیکھتے نہیں ہو کہ روزانہ کسی نہ کسی کے مرنے کی خبر آ جاتی ہے۔"

"میرا خیال ہے، میں ابھی بڑے آرام سے بیس سال اور زندہ رہ سکتا ہوں۔ میری صحت بہت اچھی ہے۔" باکوف نے کہا۔

"آہ یہ خواہش کس کے دل میں نہیں ہوتی میرے دوست! لیکن سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟ ویسے بھی ہم اس وقت مستقبل کے متعلق غور نہیں کر رہے ہیں بلکہ حال کے لیے فکرمند ہیں۔ آیندہ ہفتے ہم دس ڈالر زاید کرایہ کہاں سے ادا کریں گے؟"

"ساری زندگی ایمان داری اور محنت سے کام کرنے کے بعد اب اس عمر میں جرم کی طرف مائل ہونا سخت بے وقوفی ہے مورلے!"

"یہ تم جوانی کی باتیں کر رہے ہو۔ جوانی میں دس ڈالر کا اضافہ کوئی خاطر میں نہیں لاتا لیکن بڑھاپے میں وہی دس ڈالر بہت بڑی چیز بن جاتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں، کیا تم جوانی میں بینک میں رقم نہیں رکھتے تھے؟"

"رکھتا تھا لیکن بہت تھوڑی۔"

"مجھے تھوڑی اور زیادہ سے کوئی بحث نہیں ہے۔ تم جو رقم بینک میں جمع کرتے تھے، بینک والے اُس کی سرمایہ کاری سے بے حد نفع حاصل کرتے تھے۔ یوں سمجھو کہ اگر میں ایک ہزار ڈالر سے سرمایہ کاری کروں تو مجھے دس فی صد سے زیادہ منافع نہیں ہو گا لیکن اگر وہی ایک ہزار ڈالر دوسرے دس لاکھ ڈالروں میں ملا کر کسی کاروبار میں لگائے جائیں تو ایک سال میں صد فی صد سے بھی زیادہ منافع حاصل ہو سکتا ہے۔ بینک والے ہمیں محض چار پانچ فیصد سود پر ٹرخا دیا کرتے تھے، باقی سارا منافع خود ہضم کر جاتے تھے اس لیے اب جو حرکت ہم کریں گے اسے بینک لوٹنا نہیں کہنا چاہیے بلکہ اپنا باقی منافع حاصل کرنے کا ایک غیر قانونی طریقہ کہنا چاہیے۔"

باکوف کچھ دیر تک اس نکتے پر غور کرتا رہا۔ "کہتے تو تم ٹھیک ہو۔" اس نے کہا۔ "اچھا تم مجھے اپنا منصوبہ تو بتاؤ۔"

مورلے نے ہاتھ بڑھا کر میز کی دراز کھولی اور ایک سٹیل کا ڈبا نکالا جس پر بھورا کاغذ چڑھا ہوا تھا۔ "یہ ہے میرا بم۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم نے جوتے کے ڈبے پر کاغذ چپکا دیا ہے۔"

مورلے کا منہ لٹک گیا۔ "ہاں یہ جوتے ہی کا ڈبا ہے لیکن بینک والی لڑکی کو کیسے معلوم ہو گا کہ یہ اندر سے خالی ہے۔ وہ بے چاری تو یہی سمجھے گی کہ اس میں بم رکھا ہوا ہے۔" مورلے نے کوٹ کی اندرونی جیب سے

سوئٹزرلینڈ میں چھوٹے قصبات کے لوگ اپنے ہی ملک کے دوسرے قصبے والوں کو غیر ملکی تصور کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک قصبے کے باشندوں کو پھانسی کے پھندے کی ضرورت پیش آئی اور انھوں نے دوسرے قصبے والوں سے مستعار مانگ کر کام چلانا چاہا لیکن دوسرے قصبے والوں نے اِن غیر ملکیوں کو اپنا پھانسی کا پھندا دینے سے صاف انکار کر دیا اور معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"افسوس کہ ہم اپنا پھانسی کا پھندا دینے سے معذور ہیں کیونکہ یہ پھندا ہمارے اور ہماری آیندہ نسلوں کے لیے ہے!"

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

کاغذ کا ایک پُرزہ نکال کے باکوف کے سامنے بڑھایا۔ "یہ ہے وہ پُرزہ جو میں اس لڑکی کے سامنے رکھوں گا۔"

باکوف نے پرزے پر لکھی ہوئی تحریر پڑھی۔ "میرے ہاتھوں میں جو ڈبا ہے اس میں بم موجود ہے۔ کاؤنٹر کی ساری رقم میرے تھیلے میں ڈال دو۔ میرے جانے کے بعد پانچ منٹ تک شور مچانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں پورا بینک بم سے اُڑا دوں گا اور دوسروں کے ساتھ تمھارے بھی چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔" باکوف نے چند لمحوں تک غور کرنے کے بعد کہا۔ "تحریر ضرورت سے زیادہ طویل ہو گئی ہے۔ آخر یہ لکھنے کی کیا ضرورت ہے کہ دوسروں کے ساتھ تمھارے بھی چیتھڑے اُڑ جائیں گے؟ ظاہر ہے کہ جب بم کے دھماکے سے بینک تباہ ہوگا تو وہ خود بھی نہیں بچے گی۔"

"یہ کوئی ادبی شہ پارہ نہیں ہے۔ مجھے تمھاری تنقید کی کوئی ضرورت نہیں۔" مورلے نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔

"اس پرزے سے ہمارا مقصد حل ہو رہا ہے اس لیے خواہ مخواہ اس پر بحث کرنے سے کیا فائدہ؟" اس نے کوٹ کی جیب سے ایک مڑی تڑی چکنی سی تھیلی نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ میں نے آج صبح باورچی خانے سے حاصل کی ہے۔ رقم اس میں رکھوائی جائے گی۔"

"یہ؟" باکوف نے حیرت سے کہا۔ "تمھیں مچھلی والا تھیلا لینا چاہیے تھا۔ یہ تھیلی تو بہت خراب ہو رہی ہے۔"

"ہونے دو۔" مورلے نے بے صبری سے اپنا استخوانی ہاتھ فضا میں لہرایا۔ "وہ لڑکی اس تھیلی میں رقم ڈال دے گی اور میں اسے لے کر چلتا بنوں گا۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"تم بینک کے باہر فٹ پاتھ پر کھڑے رہنا۔" مورلے نے کہا۔ "میں باہر آتے ہی یہ تھیلی تمھارے حوالے کر دوں گا۔ تم اسے اپنے کوٹ میں چھپا کر فوراً راہگیروں میں شامل ہو جانا۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اگر میں پکڑا گیا تو میرے پاس سے رقم برآمد نہیں ہوگی اور ثبوت کی عدم موجودگی میں پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔"

"اگر بینک کے ملازم چوکیدار نے تم پر گولی چلا دی تو؟"

"جب تک لڑکی شور نہیں مچائے گی، چوکیدار کو کچھ خبر نہیں ہوگی اور جب تک لڑکی کو یہ یقین رہے گا کہ میرے ڈبے میں بم موجود ہے، وہ شور نہیں مچائے گی اور میرے باہر نکلنے کے بعد جب لڑکی شور مچائے گی، اس وقت تک میں بھی سڑک کی بھیڑ میں گم ہو چکا ہوں گا۔ چوکیدار ہجوم پر گولی چلانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ تم فوراً اسٹرک پار کر کے گھر واپس آجانا۔ جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ کوئی میرا تعاقب نہیں کر رہا ہے تو میں بھی وہیں آجاؤں گا۔"

"فرض کرو، کسی نے تمھیں رقم کی تھیلی مجھ تک منتقل کرتے دیکھ لیا تو؟"

"بازار میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ہوتی۔ تم فکر نہ کرو۔ میں پچاس سال سے اخبارات میں ایسی وارداتوں کی تفصیلات پڑھ رہا ہوں۔ کامیاب ڈاکے ہمیشہ اسی طرح ڈالے جاتے ہیں۔ ہمیں صرف زائد کرایہ ادا کرنے کے لیے کچھ رقم کی ضرورت ہے باکوف۔ ہم وہ رقم عیاشی پر تو صرف کریں گے نہیں اور پھر محض چند ہزار ڈالر پر کوئی بینک زیادہ شور نہیں مچاتا بلکہ اپنی ساکھ قائم رکھنے کے خیال سے عموماً خاموش ہو جاتا ہے۔ تم خواہ مخواہ فکرمند ہو رہے ہو۔"

"یہ دیوانگی ہے، پاگل پن ہے۔" باکوف نے کہا۔

"ہر نئی چیز پہلے پہل دیوانگی معلوم ہوتی ہے۔ اگر تم میرا ساتھ نہیں دینا چاہتے تو تمھاری مرضی۔ میں تمھیں مجبور نہیں کروں گا لیکن میں آج ہی اپنے اس منصوبے پر عمل کروں گا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے میرے ارادے سے نہیں روک سکتی۔"

باکوف نے اپنے گول مٹول چہرے پر ہاتھ پھیرا، چٹکی سے ناک رگڑی، انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کی اور قمیص کا کالر درست کیا۔ وہ کچھ اداس نظر آنے لگا۔ "بہت اچھا دوست!" اس نے غمگین لہجے میں کہا۔ "اگر تم جیل جانے پر مصر ہو تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا تاکہ تم وہاں تنہائی محسوس نہ کرو۔ کیا آج کا دن جیل جانے کے لیے موزوں ہے؟"

"اس کام کے لیے ہر دن موزوں ہوتا ہے۔ آؤ باہر چل کر دھوپ میں بیٹھتے ہیں۔"

دوپہر کو ساڑھے بارہ بجے کے قریب مورلے اور باکوف بینک کے پاس پہنچے۔ مورلے فوجی انداز میں تنا ہوا آگے چل رہا تھا۔ اس کی کمر بالکل سیدھی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں گتے کا ڈبا تھا۔ باکوف اس سے چند قدم کے فاصلے پر موجود تھا۔ اس کے کاندھے جھکے ہوئے تھے۔ وہ تھکے تھکے انداز میں چل رہا

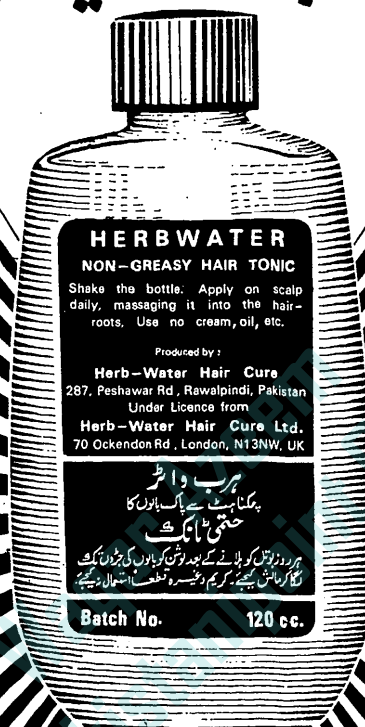

ایک خواب ✦ ایک حقیقت
HERBWATER
NON-GREASY HAIR TONIC
Shake the bottle. Apply on scalp daily, massaging it into the hair-roots. Use no cream, oil, etc.
Produced by :
Herb-Water Hair Cure
287, Peshawar Rd, Rawalpindi, Pakistan
Under Licence from
Herb-Water Hair Cure Ltd.
70 Ockendon Rd, London, N13NW, UK
ہرب واٹر
چکناہٹ سے پاک بالوں کا
حتمی ٹانک
ہر روز بوتل کو ہلانے کے بعد لوشن کو بالوں کی جڑوں تک لگا کر مالش کیجئے۔ کریم وغیرہ قطعاً استعمال نہ کیجئے۔
Batch No. 120 cc.
ہرب واٹر
ہیئر ٹانک
گنج کا حتمی علاج ✦ گرتے بالوں کو روکتا ہے
بالوں کو بالیدگی بخشتا ہے ✦ چکناہٹ اور الکوحل سے مبرا ہے
مدت کورس چھ ماہ تا ایک سال
احتیاط:۔ چکناہٹ اور الکوحل بالوں کی جڑوں کے لئے نقصان دہ ہیں۔
ORIENT

تھا۔ باکوف بینک کے دروازے کے باہر فٹ پاتھ پر رک گیا موریے سیڑھیاں چڑھتا ہوا بینک میں داخل ہوا۔ اس نے اندر جانے سے پہلے سر موڑ کر معنی خیز نظروں سے باکوف کو دیکھا اور ایک دم اندر داخل ہو گیا۔ بینک میں خاموشی طاری تھی۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ دروازے کے سامنے ایک لمبا کاؤنٹر تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے تین خزانچی لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہر کھڑکی کے سامنے چیک بھنانے والوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ موریے نے باری باری غور سے تینوں کھڑکیاں دیکھیں۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آخر کس لڑکی کو لوٹا جائے؟ پھر اس نے وہ لڑکی منتخب کر لی جو دروازے کے سب سے قریب تھی، وہ قطار میں شامل ہو گیا۔

موریے کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ رہی تھیں۔ وہ بار بار انھیں اپنے کوٹ سے رگڑ کر خشک کر رہا تھا۔ اسے اپنے پیٹ میں مروڑ کا احساس ہوا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ وہ صبح ہاضمے کی گولی کھانا بھول گیا تھا۔ اس نے جب ڈرپوک باکوف کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا تھا تو اسے اس پر عمل کرنا بہت آسان معلوم ہو رہا تھا لیکن اب محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ایسا آسان کام نہیں ہے ایک بار تو اس کا دل چاہا کہ واپس چلا جائے مگر دوسرے ہی لمحے دس ڈالر زائد کرائے کے خیال نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ قطار میں اس کا چوتھا نمبر تھا۔ اس کے آگے والا آدمی دراز قد اور چوڑے سینے کا مالک تھا۔ اس کی وجہ سے اسے کھڑکی میں بیٹھی ہوئی لڑکی نظر نہیں آ رہی تھی۔ موریے کو بڑی جھنجلاہٹ ہوئی۔ وہ قطار سے ایک طرف کھسک گیا۔ کھڑکی میں بیٹھی ہوئی لڑکی نوجوان اور خوب صورت تھی۔ اس کے بال سنہرے تھے اور رخسار سیب کی طرح سرخ تھے۔ اس کی جلد اس طرح دمک رہی تھی جیسے اس کے بدن میں برقی قمقمے لگے ہوئے ہوں۔ قطار سست رفتاری سے آگے بڑھتی رہی۔

موریے نے سر موڑ کر بینک کے دروازے کی طرف دیکھا، اسے وہاں باکوف کھڑا ہوا نظر آیا۔ وہ جھانک کر اندر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا گنجا سر پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ گدھا کہیں کا، موریے نے دانت پیستے ہوئے سوچا۔ یہ بے وقوف اس طرح خواہ مخواہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لے گا۔ اس نے مڑ کر قطار کی طرف دیکھا۔ اس کے آگے کا آدمی اب کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ موریے نے کھسک کر ذرا قریب سے کھڑکی کی لڑکی کا جائزہ لیا۔ لڑکی کی شادابی رخصت ہو گئی تھی اور سیب جیسے سرخ رخسار سفید دکھائی دے رہے تھے۔ وہ نچلا ہونٹ دبائے نوٹوں کی گڈیاں کاغذ کی ایک تھیلی میں ڈال رہی تھی۔ موریے کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لڑکی بینک کا اصول نظر انداز کرتے ہوئے کرنسی نوٹ گننے کی بجائے گڈیاں گنے بغیر تھیلے میں ڈال رہی ہے۔ آخر اس حرکت کا مطلب کیا ہے؟ اس نے سوچا۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس لڑکی نے جب آگے کے دو گاہکوں کو رقم دی تھی تو نوٹوں کا ہر بنڈل بڑی احتیاط سے دو مرتبہ گنا تھا اور اب وہ ایک بار بھی نوٹ نہیں گن رہی تھی۔ بس جلدی جلدی گڈیاں کاغذ کی تھیلی میں ٹھونس رہی تھی۔ اچانک اس کے ذہن میں بجلی سی کوند گئی۔

آگے والا آدمی کوئی چیک نہیں بھنوا رہا تھا بلکہ بینک لوٹ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکی نے نوٹوں کی کوئی گڈی نہیں گنی۔

اس نے دراز میں رکھی ہوئی تمام گڈیاں نکال کر جلدی جلدی اس کی تھیلی میں ڈال دیں۔ لڑکی کا چہرہ اب بھی خوف سے سپید ہو رہا تھا۔ موریے نے غور سے لڑکی کے ہاتھ دیکھے۔ وہ واضح طور پر کانپ رہے تھے۔ موریے کا خون کھول گیا۔ آگے والا آدمی دراصل بینک کو نہیں بلکہ اُسے لوٹ رہا تھا۔ یہ رقم اصولاً اس کی تھی کیونکہ اسے تو وہ لوٹنا چاہتا تھا۔ اگر وہ شخص مداخلت نہ کرتا تو لڑکی نوٹوں کی گڈیاں اس وقت موریے کے حوالے کر رہی ہوتی۔

آگے والے آدمی نے تھیلی لینے کے لیے کھڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لڑکی نے پہلی بار نظریں اٹھائیں اور جب اس کی نظریں موریے کی نظروں سے ملیں تو موریے کو ایسا محسوس ہوا جیسے لڑکی اس سے آنکھوں کی زبانی مدد کی درخواست کر رہی ہو۔ اب اسے اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ آگے والا آدمی بینک لوٹ کر جا رہا ہے۔ یہ ظلم اور کمینگی کی انتہا تھی۔ رقم کی ضرورت تو اسے اور اس کے دوست کو تھی۔ منصوبہ تو اُس نے بنایا تھا اور رقم وہ شخص لے جا رہا تھا۔ موریے یہ ستم کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی محنت کی کمائی کسی اور کو کھانے کی اجازت کیسے دے دیتا؟

دراز قد آدمی نے رقم کی تھیلی کھڑکی سے نکالی اور دروازے کی طرف مڑا۔ اس اثنا میں موریے کو ایک ترکیب سوجھ گئی۔ وہ

دراز قد آدمی سے پہلے ہی دروازے کی طرف چل دیا۔ اُسے یہ دیکھ کر شدید حیرت بھی ہوئی اور غصّہ بھی آیا کہ باکوف بینک کے اندر داخل ہو رہا ہے۔ وہ فضا میں اپنی ہتھیلی بلند کیے مورلے کی طرف آ رہا تھا۔ مورلے فی الحال باکوف کی طرف توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے باکوف سے بعد میں جواب طلب کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت اسے صرف اس آدمی کی فکر تھی جو اس کی رقم لوٹ کر لے جا رہا تھا۔ مورلے چند قدم آگے بڑھ کر دائیں طرف ہو گیا۔ وہ آدمی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا تیزی سے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ مورلے نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اسے ٹانگ ماردی۔ دراز قد آدمی لڑکھڑایا۔ اس کا جسمانی توازن بگڑ گیا۔ مورلے نے فوراً اس کی پشت پر لات جمادی۔ اس نے ایک کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فضا میں ہاتھ لہرایا اور ایک زوردار آواز کے ساتھ اس پر گرا۔ باکوف سامنے سے آ رہا تھا۔ وہ اس کی لپیٹ میں آ گیا اور اوندھے منہ فرش پر آ رہا۔ رقم کی تھیلی زمین پر گر کر پھٹ گئی۔ تمام گڈیاں تتر بتر ہو گئیں۔ ساتھ ہی دھات کی کوئی چیز فرش پر گرنے کی آواز سنائی دی۔ یہ دراز قد آدمی کے ریوالور کی آواز تھی۔

دوسرے ہی لمحے خزانچی لڑکی کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ہر شخص اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ بینک میں بھونچال آ گیا۔ بینک کے دو مسلّح محافظ جنّات کی طرح کہیں سے نمودار ہو کر دراز قد آدمی کے سر پر سوار ہو گئے۔ باکوف نے بڑی مشکل سے اپنا دبا ہوا ہاتھ اس کے نیچے سے نکالا اور کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس نے پہلے اپنے قدموں میں پڑے ہوئے ڈاکو کو دیکھا پھر مورلے کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”دیکھا، میں کیا کہتا تھا؟“ اس کا چہرہ خوف سے زرد ہو رہا تھا۔

♥

دوسری صبح بہت خوش گوار تھی۔ گھاس شبنم کی وجہ سے گیلی ہو رہی تھی۔ مورلے اور باکوف حسبِ معمول اپنی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ مورلے کی آنکھوں پر دُوربین تھی۔ ”لو وہ آ گئی۔“ اس نے کہا۔

”کون؟“

”وہی پیراکی کے لباس میں آفتابی غسل کرنے والی جسے کل تم مجھے دکھا رہے تھے۔“

”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ باکوف نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”میری کہنیوں اور گھٹنوں میں اب تک درد ہو رہا ہے۔ کل زمین پر گرنے سے میری جلد بُری طرح چھل گئی تھی۔“

”فکر نہ کرو۔ جس کی وجہ سے تمھیں یہ تکلیف پہنچی ہے وہ اس وقت جیل میں سڑ رہا ہے۔ کیا اب بھی تمھارے انتقامی جذبے کو تسکین نہیں پہنچی؟“

”یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اُس کی جگہ آج تم جیل میں ہوتے“

”نہیں۔“ مورلے نے دوربین ہٹا کے باکوف کی طرف دیکھا۔ ”تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ وہ آج جیل میں صرف میری وجہ سے بند ہے۔ میں نے اسے ٹنگڑی مار کر گرایا تھا۔ اگر اُس کی جگہ میں ہوتا تو مجھے کون گراتا؟ تھی کسی میں اتنی ہمت؟ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ میرا منصوبہ بہت عمدہ اور قابلِ عمل تھا۔ کسی نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں آخر بینک میں کیا کر رہا تھا؟ پچھپّر سال کی عمر میں انسان کا چہرہ فرشتوں کی طرح معصوم ہو جاتا ہے۔ کوئی تمھاری طرف توجہ نہیں دیتا۔ کسی کو تمھاری پروا نہیں ہوتی۔ یہ بات الگ ہے کہ تم ان کے سامنے مُردہ ہو کے گر جاؤ۔ خیر چھوڑو یہ باتیں۔ مجھے تم سے یہ پوچھنا ہے کہ تم آخر بینک میں داخل کیوں ہوئے تھے؟ تم نے سارے منصوبے کا بیڑا غرق کر دیا۔“

”میں تمھیں آخری لمحے میں بھی جرم کرنے سے روکنا چاہتا تھا۔“ باکوف نے جواب دیا۔ ”اب ہماری عمریں ایسی نہیں ہیں کہ ہم نئے سرے سے ایک زندگی شروع کریں اور وہ مجرمانہ زندگی ہو۔ ہم اپنی عمر کے کسی حصّے میں جرم کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔“

”میں تم سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اس عمارت میں ہمارے ہم عمر بہت سے بوڑھے رہتے ہیں۔ ان میں ایک سے ایک باصلاحیت آدمی پڑا ہے۔ میں ان بوڑھوں پر مشتمل باقاعدہ

●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●

پادری نے میونسپل کارپوریشن کو فون کیا، ”میں چرچ سے بول رہا ہوں فادر ولیم، میری قیام گاہ کے سامنے ایک گدھا مرا پڑا ہے۔ براہِ کرم اسے اٹھوا دیجیے!“

فون ریسیو کرنے والے کو مذاق سوجھا، اُس نے کہا۔ ”لیکن فادر، مرنے والوں کے کفن دفن کا انتظام تو آپ ہی لوگ کرتے ہیں۔“

فادر ولیم نے جواب دیا۔ ”بے شک یہ انتظام ہم ہی لوگ کرتے ہیں لیکن ہم پہلے مرنے والوں کے عزیزوں سے اجازت ضرور لے لیتے ہیں!“

ایک گروہ ..... "

"عمدہ خیال ہے۔" باکوف نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"ہم بینک لوٹا کریں گے اور فرار ہونے کے لیے پہیّوں والی کرسیاں استعمال کیا کریں گے۔ بھلے آدمی! کبھی تو دانش مندی کا ایک آدھ جملہ کہہ دیا کرو۔"

"حیرت ہے کہ تمھیں پچھتر سال کی عمر میں تکلیفیں برداشت کرنا منظور ہے لیکن ذرا سی محنت کرنا منظور نہیں ہے؟"

"مسلسل پچھتر سال تک مصائب برداشت کرنے کے بعد مزید تکلیفیں اُٹھانا آسان ہو جاتا ہے۔ ہم کسی نہ کسی طرح کام چلا ہی لیتے ہیں۔" باکوف نے کہا۔

موریے نے ایک گہری سانس لی۔ "خیر، ویسے بھی اب کچھ عرصے کے لیے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بینک کے مینیجر نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے لٹنے والی رقم کا دس فی صد حصہ انعام کے طور پر دلوائے گا۔ تقریباً ایک ہزار ڈالر بنیں گے۔ اس کے علاوہ جس اخبار نے میرا انٹرویو لیا تھا اس کے رپورٹر نے مجھ سے کہا ہے کہ میری یہ کہانی شائع ہونے پر کہ میں نے اس ضعیفی میں کس طرح ایک ڈاکو کو پکڑا، اخبار مجھے معقول معاوضہ ادا کرے گا۔ ایسے جرم بہت کم ہوتے ہیں جن میں بوڑھے کوئی کردار ادا کریں۔ انھیں کیا معلوم کہ میں نے ڈاکو کو کیوں پکڑا تھا؟ اب ہمارے پاس اتنی رقم جمع ہو جائے گی کہ ہم مزید ایک سال تک آسانی سے دس ڈالر فی ہفتہ زائد کرایہ ادا کرتے رہیں گے۔ اس کے بعد کوئی اور منصوبہ سوچ جائے گا۔" موریے نے کہا۔

"ایسے، تم صرف ایک سال کی بات کر رہے ہو؟ میں کہتا ہوں، ہمیں دو سال تک فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے"
باکوف نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی ایک گڈّی باہر نکالی۔ موریے حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ گڈّی دس دس ڈالر کے نوٹوں پر مشتمل تھی۔ "یہ پورے ایک ہزار ڈالر ہیں۔" باکوف نے کہا۔ "جب میں فرش پر گرا تھا تو یہ گڈّی میرے نیچے دب گئی تھی۔ میں نے چپکے سے اسے اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ یہ بتاؤ موریے! بینک والوں کو یہ رقم غائب ہونے کا احساس تو نہیں ہو جائے گا؟"

"ضرور ہو جائے گا۔" موریے نے جواب دیا۔ "لیکن اُس وقت بینک میں عملے کے افراد اور گاہک سبھی موجود تھے۔ اس لیے تمھیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بینک والے یہی سمجھیں گے کہ ان کا کوئی گاہک موقع دیکھ کر ایک گڈّی پر ہاتھ صاف کر گیا۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ رقم بینک کو واپس کر دینی چاہیے۔" باکوف نے بھولپن سے کہا۔

موریے چند لمحوں تک اس تجویز پر غور کرتا رہا۔ "ابھی نہیں! جلدی کیا ہے؟ ہو سکتا ہے ہم اتنی مدّت زندہ نہ رہیں کہ ہمیں اس رقم کی ضرورت پڑے۔ اس لیے ہم وصیّت کر دیں گے کہ ہماری موت کے بعد یہ رقم بینک کو واپس کر دی جائے کیونکہ یہ ہم نے بینک سے بلا سود قرض کے طور پر حاصل کی تھی۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" باکوف نے اطمینان کی سانس لے کے کہا۔ "اب میں سکون سے سو سکوں گا۔ کل رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ ذرا دُوربین دینا۔ وہ اب تک اپنی گیلری میں آفتابی غسل کر رہی ہو گی۔ بڑی لاجواب چیز ہے بھئی۔"

"ہمیں ایک کام فوری طور پر کرنا چاہیے۔" موریے نے دُوربین باکوف کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "ایک دُوربین اور خریدنی چاہیے کیونکہ ہم دونوں کی نظریں مختلف ہیں۔ مجھے یہ دوربین ہر مرتبہ اپنی نظروں کے مطابق ٹھیک کرنی پڑتی ہے۔"

"مجھے خود اس سے بہت اُلجھن ہوتی ہے۔ ہم آج ہی شہر چل کر ایک دوربین اور خرید لیں گے۔"

"شام کو چلیں گے۔" موریے نے باکوف کو کہنی ماری۔ "شام کے وقت شہر میں بڑی رونق ہوتی ہے۔ رنگ برنگی تتلیاں اڑتی نظر آتی ہیں۔"

"واہ مجھے تو اس کا خیال ہی نہیں تھا۔" باکوف نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "اچھا ہی ہوا کہ تم نے بینک نہیں لوٹا۔ اگر ہم پکڑے جاتے تو جیل میں ایسے نظارے کہاں دیکھنے کو ملتے؟ کیا تم ایسی زندگی پر موت کو ترجیح نہ دیتے؟"

موریے کچھ دیر اس سوال پر غور کرتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے اقرار میں گردن ہلائی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو باکوف۔"

ہر گام سکون - ہر لمحے راحت
SUPER-1
پائیدار - جاذبِ نظر
ساخت میں مختلف
بناوٹ میں لاجواب
عمدہ مائیکرولون سے
تیار کردہ
ہلکا، پھلکا
باٹا
باٹا
Bata
Bata
سپر-1
بہت آرام، اونچا نام
SV

اقبال مہدی

★ غازی صلاح الدین

مصوّروں اور مصوری کے پرستاروں کی ایک چھوٹی سی دُنیا ہے جس میں اچھے، سچے لوگ بھی رہتے ہیں جو رنگوں اور لکیروں کی پیچیدہ زبان سمجھتے ہیں اور بہروپیے بھی ہیں جو ابہام کو معنی کی رُوح جانتے ہیں اور جن کا سارا کلام چند پُرانے استعاروں تک محدود ہوتا ہے۔ اس چھوٹی سی دُنیا کی اپنی چمک دمک ہے۔ تصویروں کی نمائش کا افتتاح ہوتا ہے تو لوگ یوں آتے ہیں جیسے کسی سالگرہ کی ضیافت میں آئے ہوں۔ بنی سنوری لڑکیاں، جن کی تصویریں کئی دنوں بعد تک شام کے اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ انگریزی اخباروں میں بڑے اہتمام سے تبصرے چھپتے ہیں۔ (یہ کام یعنی انگریزی میں تنقید لکھنے کا کام میں نے برسوں کیا ہے اور اس کا اکیلا طریقہ یا گُر جو مجھے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ خود تصویریں بنانے والے یا اُس کی تعریف کرنے والے کسی دوسرے مصور کے جُملے نقل کر دیے جائیں)

مصوری کے اس بالاخانے سے باہر کی جو دُنیا ہے، اُس کی مصوری سے شناسائی خاصی مشکوک ہے۔ عام لوگ جو ایک انبوہ کی شکل میں سڑکوں پر پھیلے ہوئے ہیں اور جو اپنی پسند کسی طے شدہ معیار سے نہیں ناپتے ہیں، یا تو مونالزا کی مسکراہٹ کو رومانوی افسانوں کے توسط سے جانتے ہیں یا انھوں نے پکاسو اور تجریدی مصوری کے بارے میں لطیفے سُن رکھے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اپنے ذوق کی بلندی اور پستی کی قطعاً پروا نہیں ہے۔ اقبال مہدی کا رشتہ بنیادی طور پر انھی لوگوں سے ہے اور یہ ایک قابلِ احترام رشتہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں گہری اور گمبھیر معنویت ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اقبال مہدی اس ملک کے پہلے اور ایک بہت کامیاب "میگزین السٹریٹر" ہیں یعنی وہ ایک رسالے کی فنی تزئین کے ماہر ہیں۔ ایک کہانی تو "سب رنگ" کی ہے جو ایک نئی عوامی تہذیب کے مظاہر میں سے ہے۔ سماجی تبدیلی، ذرائعِ ابلاغ کی نئی وسعتوں اور تعلیم عام ہونے کا جو اثر عام لوگوں اور قومی تہذیب پر پڑ رہا ہے، وہ ایک الگ موضوع ہے۔ ریڈیو، فلم اور ٹیلی وژن نے جس طرح اکیلے اور تھکے ہوئے انسانوں کے ذہنوں اور ان کے خوابوں پر شب خون مارا ہے، اُس نے عام آدمی کی سطح پر ایک نیا طرزِ احساس جنم دیا ہے۔ "سب رنگ" اس ہمہ گیر اور پُراسرار سماجی تبدیلی کا مزاج داں ہے اور اسے اپنی تصویروں سے سجا کر اقبال مہدی نے اپنے لیے ایک الگ اور پوری دُنیا بنائی ہے۔ اصولاً یہ ایک تجارتی انداز کا کام ہے لیکن یہ ایک اسی طرح کا فن ہے جس طرح فیچر فلمیں بنانا۔ اقبال مہدی کے ضمن میں فرق صرف یہ ہے کہ وہ پوری طرح کامیاب ہیں، اور کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ عام مقبولیت کے لیے اس نے اپنے فن سے کوئی سمجھوتا کیا ہے۔

آرٹس کونسل میں اقبال مہدی کی ان سیاہ و سفید تصویروں کی نمائش ہوئی جو اس نے "سب رنگ" کے لیے بنائی تھیں۔ اس کا ایک اچھوتا پہلو یہ تھا کہ عوام تو ان سے پہلے ہی سے خوب واقف تھے۔ کچھ خواص کے لیے یہ بالکل نئی تصویریں تھیں اور یہ جان کر انھیں یقیناً حیرت ہوئی ہوگی کہ اتنی اچھی تصویریں ایک رسالے کی کہانیوں کے مناظر ہیں یعنی اقبال مہدی جو گفتگو عوام سے کرتے ہیں، اسے خواص نے بھی پسند کیا۔ یہ ساری تصویریں سیاہی کے اسکیچ ہیں اور ان میں اقبال مہدی نے جس فنی چابک دستی اور کاری گری کا مظاہرہ کیا ہے اس کی ہمارے ہاں کوئی اور مثال نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ اقبال مہدی مشابہتیں پیدا کرتے ہیں، میری نظر میں کوئی اعتراض نہیں اس لیے کہ جو کام وہ کرتے ہیں اس میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ دیکھنے کی بات

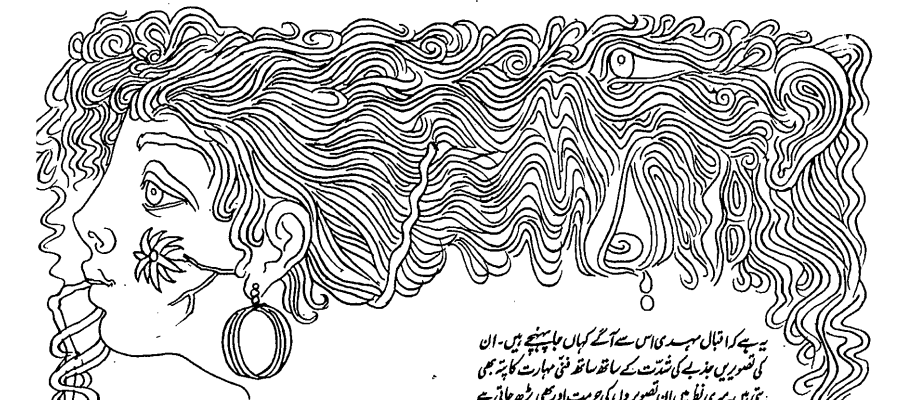

یہ ہے کہ اقبال مہدی اس سے آگے کہاں جا پہنچے ہیں۔ ان کی تصویریں جذبے کی شدّت کے ساتھ ساتھ فنّی مہارت کا پتہ بھی دیتی ہیں۔ میری نظر میں ان تصویروں کی حرمت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب میں یہ سوچتا ہوں کہ کتنے ہزاروں، لاکھوں لوگوں نے ان میں اپنے جذبات کا عکس دیکھا ہوگا۔ ان تک پہنچنے کے بعد اب اقبال مہدی مصوّری کے اُس بالاخانے میں بھی اپنا جھنڈا گاڑنا چاہتے ہیں تو یہ ان کی مرضی ــــ میں ان کے موجودہ رتبے ہی کی زیادہ قدر کرتا ہوں اس لیے کہ یہاں ان جیسا کوئی اور نہیں ہے۔

★ شکیل عادل زادہ

عجیب اتفاق ہے کہ جب میں آپ سے اقبال مہدی کے بارے میں گفتگو کرتا ہوں، وہ اپریل کا مہینہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اپریل سنہ ۸۲ء پھر اپریل سنہ ۸۳ء اور اب اپریل سنہ ۸۴ء کے شمارے میں اقبال مہدی سے متعلق آپ میری باتیں پڑھ رہے ہیں۔ حسبِ روایت اس سال بھی ۹، مارچ کو آرٹس کونسل گیلری میں اس کی تصویروں کا جشن برپا ہوا اور اس مرتبہ خاص بات یہ تھی کہ نمائش میں صرف قلم اور سیاہی سے تراشے ہوئے بے شمار چہرے اور بدن ' الیوری کارڈ ' پر بکھرے ہوئے تھے۔ آرٹس کونسل کی اس خوب صورت شام میں اقبال مہدی کے بہت سے پرستار اپنے محبوب کی نازک انگلیوں کی کرشمہ سازی دیکھنے اور اس کا حوصلہ جوان رکھنے کے لیے جمع ہوگئے تھے۔ ایک فن کار کے لیے سب سے شاداب بات، یہی نظریں ہیں، جن میں ستائش ہوتی ہے۔ جن میں محبت ہوتی ہے۔ یہ پُرتپاک نظریں ہی کسی فن کو اس کی قیمت ادا کرتی ہیں۔

سال بھر سب رنگ میں اقبال مہدی نے جو تصویریں بنائیں، وہی اسکیچ، جب اپنی اصل شکل میں گیلری کی دیواروں پر سجے تو ان کا حسن اور نکھر کر سامنے آیا اور ان کا فنی کمال اور اجاگر ہوا، یہ ایک طرح سب رنگ کی تصویروں کی نمائش تھی۔ جو سب رنگ پڑھتے ہیں، وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہوں گے کہ اس نوجوان مصوّر نے مختصر مدّت میں کتنے لوگوں کو متاثر کیا ہے اور کہاں کہاں لوگ اس کی تقلید کر رہے ہیں۔ وہ اس ملک میں مصوّری کی اس طرز کا انقلابی ہے۔ اس کا فن پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے ایک ہجوم چل رہا ہے

اقبال مہدی کی یہ کامیابی اس کے انہماکِ کامل، شوقِ جستجو، قوّتِ تخلیق اور فنّی مہارت کی وجہ سے ہی ممکن ہوئی ہے، کوئی فن کار انھی خوبیوں سے سر بلند ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، جو اقبال کی تقلید کرتے ہیں، وہ یہ جوہر اپنے اندر مجتمع کرلیں، ان کا اسی شان سے استقبال کیا جائے گا، پرسوں مشہور سائنس داں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی ہمیں یہ نکتہ تعلیم کر رہے تھے کہ فن اور تخلیق کے معاملات بڈّیوں کے گودے میں طے ہوتے ہیں۔ میں اقبال مہدی کے فنّی سفر کا عینی شاہد ہوں، میں نے اسے سلگتے اور چٹختے دیکھا ہے۔

مجھے تو وہ دن یاد آتے ہیں، سب رنگ کے شروع شروع کے دن تھے۔ بڑی بے سروسامانی کا عالم تھا، کچھ کر دکھانے، کچھ کر گزرنے کے عزائم تھے۔ دِل بہت جلتا تھا اور کسی طور قرار نہیں آتا تھا، اُس وقت آج سے چار سال پہلے کے اقبال مہدی نے میری محبّت میں اپنا قلم اٹھایا اور لکیروں سے شرارتیں شروع کر دیں۔ پھر جو ہنگامہ گرم ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس رنگ ترنگ میں اقبال مہدی کی مستی کا کیا عالم ہے؟ آپ سے زیادہ کون آشنا ہوگا، میں نے پچھلے سال ان سطور کے خاتمے پر کہا تھا کہ اقبال مہدی، ایک مصوّر، ایک فن کار کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے یہ صفحات بہت کم ہیں لیکن ان میں دِل کی باتیں شامل ہیں۔ ابھی تو زندگی میں بہت سے اپریل آئیں گے، بہت سی بزم آرائیاں ہوں گی، ابھی قرار کہاں آیا ہے بلکہ دیوانگی اور بڑھ گئی ہے۔ اقبال مہدی کی وحشت تو اور سوا ہوگئی ہے۔ وہ بہت جنگلی ہوگیا ہے۔

Pakistanipoint.Com

اقابلا

آکسفورڈ کا تعلیم یافتہ مغرب زدہ نوجوان جابر بن یوسف الباقر ایک وجیہہ، جذباتی، ضدی اور شگفتہ مزاج شخص تھا۔ اُسے اپنی زندگی میں ایسے حیرت انگیز واقعات سے سابقہ پڑا جنھیں عقل تسلیم کرنے سے گریزاں رہتی ہے۔ وہ اپنی انگریز محبوبہ فلورا کے ساتھ بحری سفر کر رہا تھا کہ جہاز اچانک گہرے پانیوں میں غرق ہو گیا۔ اُس کے اور فلورا کے سوا محض چند مسافر زندہ بچے اور ایک حفاظتی کشتی پر سوار ہو کر بدنصیبی کی رہنمائی میں جزیرۂ توری جا پہنچے۔ توری تاریک برِاعظم کی رفیع الشان ملکہ اقابلا کی وسیع و عریض سلطنت کا ایک حصّہ تھا جہاں دو قبیلے آباد تھے۔ ایک قبیلے کا سردار کالاری تھا اور دوسرے قبیلے کا سردار شوالا۔ شوالا نے بدقسمت حبشیوں کو قید کر دیا اور سفید فام فلورا کو اپنے لیے منتخب کر کے دو مقامی لڑکیوں نوشا اور بٹری کو اُس کی نگرانی پر مامور کر دیا۔ ذہین جابر نے اپنے ہندی ساتھی سرنگا کے اشارے پر نوشا اور بٹری کو شیشے میں اُتارا اور اُن سے جزیرے کے متعلق حیرت انگیز معلومات حاصل کیں۔ یہ معلومات اُس کے بہت کام آئیں لیکن نوشا اور بٹری کو اس کی کڑی سزا بھگتنا پڑی۔ شوالا نے ایک کو سرِعام زندہ جلا دیا اور دوسری کو آدم خور چیونٹیوں سے ڈسوا کر ہلاک کر دیا۔ اس دہشت گردی پر جابر کے عرب ساتھی ڈاکٹر جواد کا دماغ اُلٹ گیا۔ حبشیوں نے اُس کا باقاعدہ علاج کیا لیکن علاج کا طریقہ انتہائی بھیانک تھا۔ یہ اذیت ناک حالات جابر کے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔ وہ قید میں پڑے پڑے بے بسی کی موت مرنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ ایک رات وہ پہرے داروں کو اُنھی کے نیزوں سے قتل کر کے فرار ہوا اور میلوں بھاگنے کے بعد توری کے ایک معزز طبیب کے غار میں جا گھسا۔ طبیب کے گلے میں مقدس جادوگر کاکا کی کھوپڑی پڑی ہوتی تھی۔ توری میں جس شخص کے پاس جادوگر کاکا کی کھوپڑی ہوتی تھی وہ اعزاز کا مستحق ٹھہرتا تھا اور نحوستیں اُس سے دور رہتی تھیں لہٰذا جابر نے طبیب کو سوتے میں ہلاک کر کے جادوگر کاکا کی کھوپڑی حاصل کر لی۔ یہ جزیرۂ توری میں اُس کی پہلی فتح تھی، دوسرا نمایاں کارنامہ یہ کہ غار سے نکلا اور بے تحاشا دوڑتا ہوا ایک دور اُفتادہ سرنگ میں جا کر روپوش ہو گیا جہاں زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اندھیری سرنگ یکایک بقعۂ نور بن گئی اور اُس کی حیرت زدہ آنکھوں نے ایک حسین و جمیل دوشیزہ اپنے روبرو دیکھی۔ یہ اقابلا کی ایک ادنیٰ کنیز ثرلین تھی۔ ثرلین نے تاریک برِاعظم کے فولادی قوانین پر روشنی ڈالتے ہوئے جابر سے تین آدمیوں کے قتل کا جواب طلب کیا۔ جابر نے جواب کے طور پر اپنی دردناک داستان، دلیری اور اپنی جادو بیانی سے ثرلین کا دل موہ لیا۔ وہ بے اختیار اُس کے سینے سے آ لگی مگر اس سے پہلے کہ معاملہ آگے بڑھتا آگ کے ایک پُراسرار گولے نے اچانک نمودار ہو کر ثرلین کا لالہ زار بدن راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔ جابر پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور جب دوبارہ اُس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنی جھونپڑی میں تھا اور بوڑھا سرنگا اپنی کنواری لڑکی سرتیا کے ساتھ حیرت و استعجاب سے اُس کے گلے میں پڑی ہوئی کھوپڑی دیکھ رہا تھا۔ جابر نے انھیں اپنی رُوداد سُنا کر اور زیادہ حیران کر دیا۔ اُسی رات ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ نازک سرتیا کسی پُراسرار کیفیت کے زیرِ اثر جابر کے روکنے کے باوجود چھلاوے کی طرح جھونپڑی سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اُسے دراصل توری کے سردار کالاری نے ساحرانہ طریقے سے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ جابر نے جستجو کے لیے سرنگا کو بتایا۔ سرنگا ایک صاحبِ اسرار شخص تھا۔ اُس کی جیب میں ہر وقت ایک مورتی موجود رہتی تھی۔ اُس نے مورتی نکال کر کوئی عمل پڑھا اور جابر یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ مورتی نے ایک جیتی جاگتی دیوی کی شکل اختیار کر لی۔ سرنگا نے ہاتھ جوڑ کر کسی نامعلوم زبان میں دیوی سے کچھ گفتگو کی اور مورتی کو دوبارہ اصل حالت میں واپس لا کے جابر سے اصرار کیا کہ مجھے ابھی ثرلین کے غار میں لے چلو۔ چنانچہ وہ دونوں ڈرامائی انداز میں پہرے داروں کو جھانسا دے کر سرنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ بدقسمتی سے جابر گھنے جنگلوں میں پہنچ کے راستہ بھٹک گیا اور انھیں آسمانوں سے خوف ناک گھن گرج سُنائی دینے لگی۔ ساتھ ہی سرنگا کا نحیف و نزار جسم پتھر کے بُت میں تبدیل ہو گیا۔ اس بھیانک اُفتاد نے زود حِس جابر کے لیے مہمیز کا کام کیا اور وہ صحرائی اونٹ کی طرح بے تکان دوڑتا ہوا ایک غار میں داخل ہو گیا۔ یہ غار جزیرۂ توری کے کاہنِ اعظم سمورال کا اقامت کدہ تھا۔ معمّر سمورال اجنبی جابر کے ساتھ کمال شفقت سے پیش آیا اور اُس کی نوخیز لڑکی ترام اور کمسن بیٹے کبرال نے مہمان کی مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ جابر نے وہاں بڑے سکون سے دن گزارے۔ سمورال کے ہاں مختلف طلسمات کے علاوہ ایک کڑھاؤ بھی تھا جس کے کھولتے ہوئے تیل میں حسبِ منشا بیرونی مناظر کسی فلم کی طرح دیکھا کرتا تھا۔ جابر کی فرمائش پر اُس نے سرنگا اور سرتیا کے حالات دیکھے اور اُسے بتایا کہ سرنگا دوبارہ متحرک ہو کے جنگلوں جنگلوں بھٹکتا پھر رہا ہے اور سرتیا بوالہوس کالاری کی بھینٹ چڑھنے کے لیے تیاری کے مرحلوں سے گزر رہی ہے۔ جابر کو یہ امر کسی قیمت پر منظور نہیں تھا کہ فلورا کے بعد سرتیا بھی سیاہ فاموں کی ہوس کا نشانہ بن جائے چنانچہ ایک روز موقع پا کر وہ غار سے نکلا اور روانہ ہو کر کالاری کے سر پر جا پہنچا۔ کالاری نے سرتیا کو برہنہ کر دیا تھا اور اُس پر مجرمانہ حملے کے لیے پر تول رہا تھا۔ جابر اس شرم ناک منظر کی تاب نہ لا سکا اور کالاری پر بھوکے شیر کی طرح جھپٹ پڑا۔ کالاری اُس سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا۔ وہ اُسے چٹکیوں میں مسل دیتا مگر سرنگا کی دیوی نے بروقت نمودار ہو کر جابر کی مدد کی اور جابر نے چشم زدن میں کالاری کو جہنم رسید کر دیا اور کسی تاخیر کے بغیر عریاں سرتیا کو پشت پر لاد کے بے تحاشا بھاگ نکلا۔ کالاری کا پورا قبیلہ اُس کے تعاقب میں دوڑ پڑا مگر جابر برق رفتاری سے اُنھیں پیچھے چھوڑتا ہوا ہانپتا کانپتا سمورال کے غار میں داخل ہو گیا۔ سمورال نے اُس سے کوئی باز پرس نہیں کی بلکہ یہ انکشاف کر کے اُسے حیرت زدہ کر دیا کہ چونکہ اُس نے کالاری پر فتح پائی ہے اس لیے رواج کے مطابق کالاری کا منصب اب اُسے سونپ دیا جائے گا۔ جابر نے فرطِ مسرت سے کاہن کے ہاتھ چوم لیے اور موقع کی مناسبت سے بے باکانہ لجاجت کے ساتھ اُس کی بیٹی ترام اُس سے مانگ لی۔ سمورال نے کچھ پس و پیش کے بعد یہ پیغام قبول کر لیا اور دوشیزہ ترام ہمیشہ کے لیے جابر کی ہو گئی۔ سرتیا سہمی ہوئی نظروں سے یہ تماشا دیکھتی رہی۔ جابر نے کاہنِ اعظم سے خشوع و خضوع کے ساتھ سرداری کے آداب سیکھے اور ترام کو لے کر ایک پُرشکوہ جلوس کی شکل میں اپنے قبیلے پہنچا۔ اُس کی مسند نشینی کا جشن دھوم دھام سے منایا گیا۔ اُسے بربر کے جانوروں کے خون میں غسل دیا گیا اور کالاری کی بیویوں سمیت قبیلے بھر کی عورتیں اُس کی خدمت بجا لائیں۔ جابر نے تن دہی سے اپنے علاقے میں اصلاحات نافذ کیں اور شوالا سے سفارتی تعلقات بحال کرنے کی کوشش کی اور ایک سردار کی حیثیت سے اُس سے اپنی محبوبہ فلورا کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ شوالا نے یہ مطالبہ حقارت سے ٹھکرا دیا۔ مجبوراً جابر کو اُس سے زور آزمائی کا فیصلہ کرنا پڑا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی عملی قدم اُٹھاتا ایک روز اچانک اُسے اقابلا کی بارگاہ میں طلب کر لیا گیا۔ اقابلا کا قصر شان و شوکت میں قدیم شاہی محلات سے کسی طور کم نہیں تھا اور حُسن و جمال کے نادر نمونوں سے بھرا پڑا تھا۔ جابر کو باعزّت بہشتوں، ایوانوں اور مختلف عجائب کی کہکشاں سے گزار کر اقابلا کی خصوصی نشست گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں رنگ برنگے بادلوں کے شامیانے سے تنے ہوئے تھے، دلکش نغمہ ریز آوازوں سے شہنائیاں اُبل رہی تھیں اور فضا میں نفیس ترین خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں۔ اقابلا کا زرنگار تخت برق و رعد کی کڑک اور آسمانی گھن گرج کے درمیان بلندی سے نازل ہو کر جابر سے چند قدم کے فاصلے پر معلق ہو گیا۔ سبز پتّوں اور پھولوں کے پیرہن میں دنیا کا سب سے بے مثال پیکر جابر کی حیران نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ یہ ذی حشم اقابلا تھی۔ اقابلا نے جابر سے اپنی پری صورت نائب اشمار کی زبانی گفتگو کی۔ اشمار نے اُسے رموزِ سلطنت سے آگاہ کرتے ہوئے اُس پر شوالا کے سلسلے میں اپنی حدود سے تجاوز کرنے کا الزام لگایا۔ جابر نے جواباً فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے۔ اُس نے اپنی دردناک رُوداد کا ایک ایک لمحہ تفصیل سے سُنایا اور فلورا پر اپنے حق کا مدلّل جواز پیش کرتے ہوئے اُس کی بازیابی کی درخواست کی۔ اقابلا نے شعلہ بیان جابر کی ایک لذیذ مشروب سے تواضع کی اور اُسے فلورا کے حصول کے لیے شوالا سے دو بدو مقابلے کا حکم دے کر ڈرامائی انداز میں رخصت کر دیا۔ قصرِ اقابلا سے واپسی پر جابر کی کیفیت ہی کچھ اور ہو گئی۔ حسین اقابلا کے تصوّر کے سوا اُسے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ اُس نے اپنے تصرّف کی تمام عورتوں سے کنارہ کشی کر لی اور شوالا سے مقابلے کے روز کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا کیونکہ اسی موقع پر اُسے دوسری بار اقابلا کا دیدار نصیب ہونے والا تھا۔

مقابلے کے دن دونوں قبیلے ایک بڑے میدان میں جمع تھے اور ایک ممتاز مقام پر اقابلا کا مرصّع تخت ایستادہ تھا۔ یہ جزیرۂ توری کا ایک یادگار دن تھا۔ کاہنِ اعظم کے اشارے پر جب مقابلہ شروع ہوا تو جابر نے جان لڑا دی۔ شوالا بھی پوری تیاری سے آیا تھا اور جابر سے کئی گنا طاقت ور تھا اس لیے اُسے نیچا دکھانے میں جابر کو سخت دقت پیش آ رہی تھی یہاں تک کہ ایک نازک موڑ ایسا آیا جہاں جابر کی شکست یقینی ہو گئی مگر عین موقع پر سرنگا کی دیوی نے دوسری بار اُس کی مدد کی اور اس نے دیکھنے والوں کی توقع کے بالکل خلاف قوی الجثّہ شوالا کو چاروں خانے چت کر دیا۔ دیوی کی مداخلت معمولی بات نہیں تھی اس لیے سرنگا پر اقابلا کا عتاب نازل ہوا۔ اُس کے جسم پر بڑے بڑے آبلے پڑ گئے اور اُس کی دیوی شیشے کے ایک قدِ آدم جار میں مقید کر لی گئی مگر چند دنوں میں جار توڑ کر فرار ہو گئی۔ جابر فتح مند قرار دیا جا چکا تھا اور اب اُسے شوالا کے تصرّف کی کوئی بھی چیز طلب کرنے کا حق حاصل تھا مگر وہ اقابلا کی موجودگی میں اپنی زبان سے فلورا کو مانگنے کی غلطی کیسے کر سکتا تھا؟ اُس نے فیصلہ فلورا پر چھوڑ دیا۔ فلورا نے حیرت انگیز طور پر شوالا کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ یہ ایک ناقابلِ یقین حادثہ تھا۔ جابر کا دل چُور ہو گیا اور وہ فتح مند ہونے کے باوجود خود کو شکست خوردہ محسوس کرنے لگا چنانچہ اقابلا کے تصوّر میں اور زیادہ شدّت پیدا ہو گئی اور اُس کی جولانی تجرّد اور رہبانیت میں بسر ہونے لگی۔ اس اثنا میں کسی موقع پر اقابلا نے اپنی پری پیکر نائب اشمار اُس کی خلوت میں بھیج دی۔ توبہ شکن اشمار اقابلا کا تحفہ تھی اس لیے جابر نے اُسے عکسِ محبوب سمجھ کر آنکھوں سے لگا لیا اور اُس کے ساتھ انتہائی سرمست و سرشار لمحے گزارے۔ انھی دنوں ایک دہشت ناک سانحہ رونما ہوا۔ جابر کو پتا چلا کہ اُس کے نائب ابالیش اور بندر کاہو کی وفاداریاں مشکوک ہیں۔ اُس نے تحقیق کی تو اس امر کی تصدیق ہو گئی۔ جابر نے پہلی فرصت میں ابالیش کو موت کے گھاٹ اُتار دیا مگر کاہو نہ صرف بچ نکلا بلکہ اس نے موقع پا کے جابر کی شریکِ حیات ترام کی زندگی کا چراغ گُل کر دیا اور فرار ہو گیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ کاہنِ اعظم نے اُس سے ہمدردی کرنے کے بجائے یکلخت تمام تعلقات منقطع کر لیے اور اُسے ترام کی تجہیز و تدفین میں بھی شریک نہیں کیا۔ دل شکستہ جابر دنیا بھر سے منہ موڑ کے اقابلا کے خیالوں میں گُم ہو گیا اور آخر ایک روز اُسے اقابلا کی طرف سے آزمائش اور تربیت کے لیے جزیرۂ باگمان روانہ ہونے کا حکم مل گیا۔ باگمان تاریک برِاعظم کی ایک عجیب بستی تھی۔ وہاں سورج کی روشنی کا گزر ممکن نہیں تھا۔ ہر وقت اندھیرا مسلّط رہتا تھا۔ جزیرے کا سردار لوکاسا ایک حسین و جمیل دوشیزہ لوریا کی ماتحتی میں کام کرتا تھا۔ لوریا اقابلا کی نمائندہ تھی مگر دلچسپ امر یہ تھا کہ ماتحت سردار کو لوریا کے مرمریں بدن پر تصرّف حاصل رہتا تھا۔ باگمان میں توری کے ایک معزز سردار جابر بن یوسف الباقر کا استقبال اس طرح کیا گیا کہ ایک سانولی دوشیزہ قریسا نے اُسے اپنے اور سانپ کے خون کا آمیزہ دیوتاؤں کا مشروب کہہ کر پلایا۔ یہ پہلی آزمائش تھی۔ مہذب جابر اس میں پورا اُترا۔ وہ مشروب کا آخری قطرہ حلق میں انڈیل لینا چاہتا تھا کہ اُس کی بیوی ترام کا مفرور قاتل بندر کاہو اچانک نمودار ہوا اور اُس نے مشروب چاٹنے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ جابر نے مصلحت اور دُور اندیشی کے تحت غصّہ ضبط کر کے اُسے اجازت دے دی۔ کاہو نے پیتے ہی مشروب کا جام... جابر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اب اُس کے سامنے بندر کے بجائے ایک معمّر حبشی کھڑا ہے۔ کاہو دراصل کسی زمانے میں توری کا ایک سرکردہ شخص تھا جس کی کسی لغزش پر برہم ہو کر اقابلا نے اُس کی رُوح بندر کے جسم میں قید کر دی تھی اور آج جابر کے طفیل دیوتاؤں کا مشروب پی کر وہ دوبارہ اپنی اصل ہیئت میں آ گیا تھا۔ وہ امتنان و تشکّر کے جذبات کے ساتھ جابر سے رخصت ہوا۔ اُس کے بعد جابر کو مجرموں کی طرح باگمان کے سردار لوکاسا کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ لوکاسا ایک اُجڈ اور سفاک شخص تھا۔ اُس نے جابر سے پہلی ہی ملاقات میں سخت بدسلوکی کرتے ہوئے لیمو سے اُس کی تواضع کی۔ لیمو انسانی گوشت کے متعفن لوتھڑوں کا نام تھا مگر جابر نے انھیں بڑی خندہ

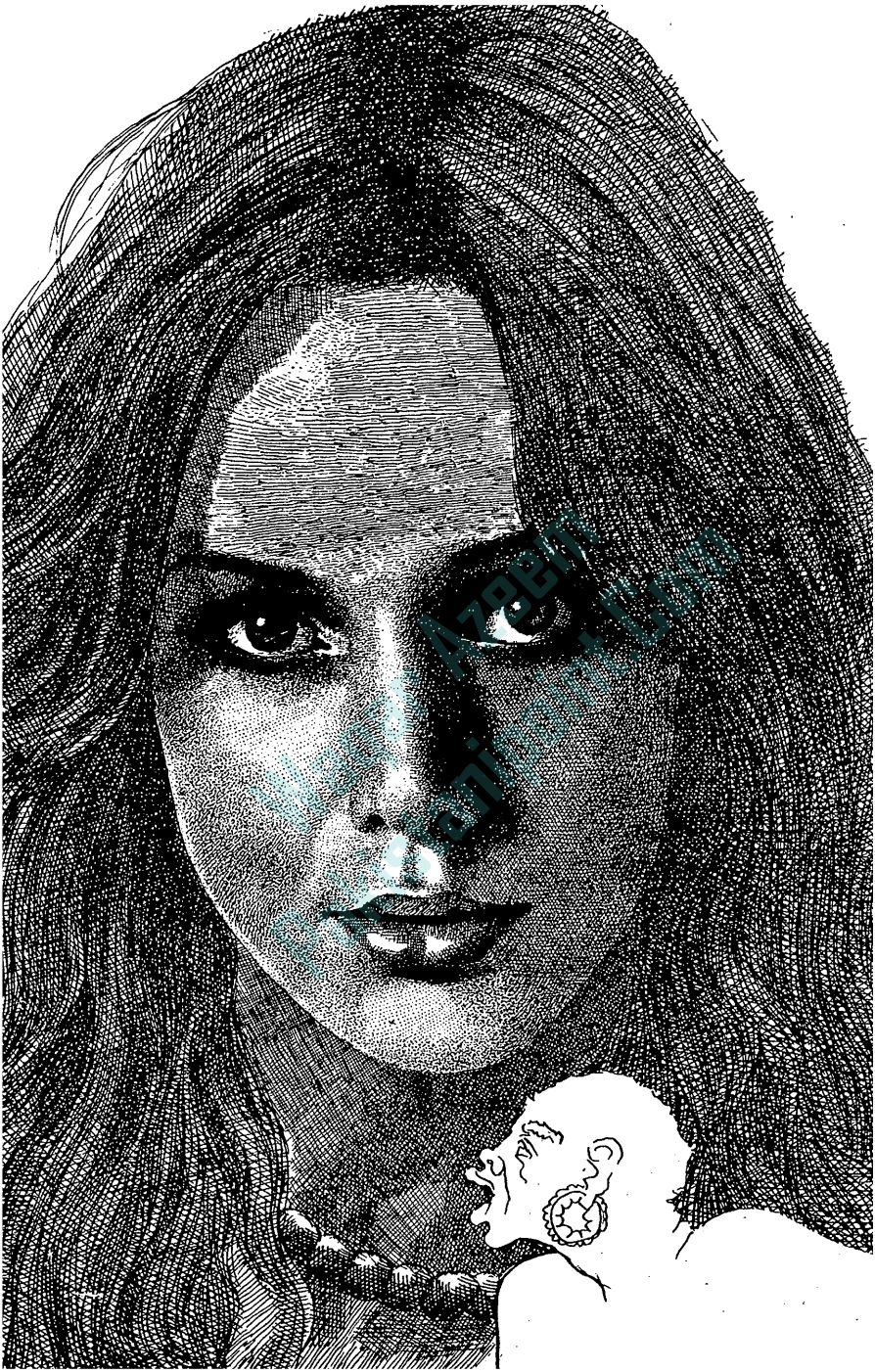

پیشانی سے زہر پار کر لیا۔ انھی دنوں باگمان میں جشنِ لوریا کا انعقاد ہوا۔ یہ ایک سالانہ تقریب تھی جس میں جسمانی کرتب، طلسمی تماشوں اور مختلف ہلاکت خیز کھیلوں کا مظاہرہ کیا جاتا تھا اور باگمان بھر کے باہنر لوگ اور طاقت ور نوجوان اس میں حصہ لیتے تھے۔ جشن کا انعقاد جابر کے لیے ایک زرّیں موقع تھا چنانچہ وہ جسمانی مقابلوں کی آگ میں دڑانہ کود پڑا۔ باگمان کے پلے ہوئے قوت وروں سے بازی لے جانا آسان نہیں تھا مگر جابر نے اپنی خود اعتمادی اور کاہو کی روح کے تعاون سے آخر مقابلہ جیت لیا۔ حسین و دلکش لوریا نے اُسے ترغیبی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی دو ماہ تیں انعام میں دے دیں۔ یہ صورتِ حال لوکاسا کے لیے خطرے کی گھنٹی سے کم نہیں تھی اس لیے اس نے جابر کو اُسی وقت کڑی تربیت کے لیے زارشی کے لق و دق صحرا میں بھیج دیا۔ جابر کچھ برس تک زارشی کی خاک چھانتا رہا۔ وہاں اُس نے ماریکہ بڑاعظم کے معمر ترین بزرگوں کے ساتھ دہکتی ہوئی آگ کے گرد ایک طویل ریاضت کی جس کا صلہ اُسے شپالی کی صورت میں ملا۔ یہ ایک انگارا تھا جس نے جابر کی ہتھیلی میں آتے ہی آب دار موتی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ پھر جابر نے امتحاناً ایک معصوم بچے کا خون کیا اور ایک عظیم و جسیم جانور ڈگبی کو ہلاک کر کے اُس کے سینگ محفوظ کر لیے۔ یہ غیر معمولی کارنامے تھے۔ زارشی میں جابر کی ملاقات نیک دل استشالا سے بھی ہوئی۔ استشالا باگمان کا معزول سردار تھا اور لوکاسا کی درپردہ ریشہ دوانیوں کا شکار ہو کر دوبارہ دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے زارشی میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ جابر اُس سے رخصت ہو کر باگمان لوٹا تو اُس نے اپنے حیرت انگیز تجسّس کی بدولت لوریا تک براہِ راست رسائی حاصل کی اور زارشی کی ناقابلِ فراموش فتوح گنوا کر لوکاسا سے نبرد آزمائی کی درخواست پیش کر دی جو فوراً قبول کر لی گئی۔ جابر اور لوکاسا کی جنگ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جسمانی، نفسیاتی اور طلسمی کون سے حربے تھے جو اس لڑائی میں استعمال نہیں کیے گئے۔ لوکاسا نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا لیکن قسمت جابر کے ساتھ تھی اس لیے لوکاسا کو انتہائی عبرت ناک موت سے دوچار ہونا پڑا۔ نتیجتاً لوریا کا شباب اور باگمان کا اقتدار دونوں نعمتیں جابر کی مٹھی میں آ گئیں لیکن جابر نہ اقتدار کا بھوکا تھا نہ لوریا کے بدن کا پیاسا۔ اُس کا مطمحِ نظر کچھ اور تھا اور اُس کا مطلوب کوئی اور تھا۔ اُس نے باگمان کی فلاح کے لیے چند انقلابی اقدامات کیے۔ پھر استشالا کو زارشی سے بلا کر اُسے اپنی نیابت سونپی اور بے قرار لوریا کا دل توڑ کر آنسوؤں، دعاؤں اور تحفوں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

بیچ سمندر میں اُس کی کشتی تباہ کن طوفان کی نذر ہو گئی اور اُسے انگرو نامی ایک جزیرے پر پھینک دیا گیا۔ انگرو ماریکہ بڑاعظم کے چند ساحروں کا علاقہ تھا جو آقابلا کے خلاف بغاوت کی ہمہ گیر تحریک چلا رہے تھے۔ انھوں نے جابر کو بھی اپنی جدوجہد میں شمولیت کی دعوت دی مگر جابر آقابلا کا مخالف کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ مہینوں اس فتنے سے گریزاں رہا لیکن گلو خلاصی کی کوئی صورت نہ پا کر آخر وہ اپنی صلاحیتوں میں اضافے کے خیال سے اُن لوگوں میں شامل ہو گیا۔ اُسے ایک سحر عالم گورے کے سپرد کر دیا گیا۔ گورے نے اُس پر زبردست محنت کی۔ جابر بھی اُس کا بہترین شاگرد ثابت ہوا۔ اُس نے گورے سے مختلف جادوئی علوم کی تربیت لینے کے علاوہ مجسمے زندہ کرنے کا فن سیکھا اور روحوں کے غاروں میں جانے کا دہشت ناک تجربہ کیا۔ اُس نے گورے کو ہمریکا کا شکار کھیلنے میں بھرپور مدد دی۔ ہمریکا ایک عجیب الخلقت جانور تھا جس کی طاقتیں بے پناہ تھیں۔ گورے نے دو ہمریکا شکار کر کے ان کی آنکھیں نکال لیں اور اُن میں سے دو سمندر میں پھینک کر بقیہ دو محفوظ کر لیں۔ یہ آنکھیں سمندر میں ہونے والی نقل و حرکت سے آگاہ ہونے کا حیرت ناک ذریعہ تھیں پھر جابر کی دل بستگی کے لیے ایک نوکر لڑکی کیشا جو برسوں سے مجسمے کی صورت میں جامد تھی متحرک کی گئی۔ اس کے علاوہ ایک لازوال عورت نیشا سے بھی اُسے نوازا گیا جو گلشنِ آقابلا سے توڑا ہوا ایک پھول تھی اور شربِ حیات نوش کر کے ابدی زندگی حاصل کر چکی تھی۔ جابر نے اُس سے لطف اندوز ہونے میں کسی مصلحت اور تحمل سے کام نہیں لیا۔ انھی ہنگاموں میں ڈھائی سال بیت گئے۔ آخر ایک روز ہندی سرنگا کی کرشمہ کار دیوی جابر کی نجات دہندہ بن کر اچانک انگرو پہنچ گئی اور اُس نے انگرو کے کہن رسیدہ ساحروں سے ایک ناقابلِ فراموش اور ہولناک معرکہ آرائی کے بعد جابر کو وہاں سے نکال لیا۔ جابر نے چلتے وقت گورے کا طلسم کدہ جلا ڈالا اور آٹھ آنکھوں والا پتھر اپنے قبضے میں کر لیا پھر ایک طویل سمندری مسافت طے کر کے جب وہ اپنے وطن توری پہنچا تو اُس کا کشادہ سینہ تحائف و نوادر سے لبریز تھا۔ قبیلے کے لوگ اُس کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔ اُس کی واپسی کا شاندار جشن منایا گیا اور قبیلے کی تمام نوبالغ کنواریاں اُس کی خدمت میں پیش کر دی گئیں جنھیں اُس نے یکسر مسترد کر دیا کیونکہ اتنی طویل ریاضت اُس نے ان لڑکیوں کے لیے نہیں کی تھی۔ جابر تمام امتحان گاہوں سے سرخ رُو لوٹا تھا اور اس اُمید میں حق بجانب تھا کہ آقابلا اور کاہنِ اعظم کی طرف سے حوصلہ افزائی ہو گی مگر وہاں سے کئی روز تک کوئی اشارہ نہ ملا۔ یہ صورتِ حال جابر کے لیے تعجب خیز بھی تھی اور ناقابلِ برداشت بھی چنانچہ اُس نے اُس بے نیاز کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ایک خطرناک کھیل کھیلا۔ اُس کے معاصر شوالا کا قبیلہ اپنے سردار کے ظلم و تشدد سے سخت نالاں تھا۔ جابر نے اس کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے شوالا کے قبیلے پر اپنے علاقے کے دروازے کھول دیے اور وہاں کے ہر شخص کو سیاسی پناہ دینے کا اعلان کروا دیا۔ شوالا کے لوگ بڑی تیزی سے ہجرت کر کے جابر کی حدود میں آنے لگے۔ اُن کا عالم دوامل نائب زاسے بھی جابر سے آملا۔ جابر نے آخری کامیابی کے لیے شوالا کو مبارزت کی دعوت دے دی۔ شوالا کے پاس ڈاکٹر جوادو، فلورا اور نزنگا کے سوا کوئی نہیں تھا۔ نزنگا جزیرۂ سبزنار کے سردار میگا کا بھائی تھا اور جابر کی غیر موجودگی میں اُس کی مسند حاصل کرنے کے خواب دیکھ کر توری آیا تھا۔ شوالا نے زخمی سانپ کی طرح پلٹ کر جابر کی دعوت قبول کر لی اور مقابلے پر آنے سے پہلے اُس نے فلورا کو نزنگا کے ساتھ سبزنار بھیج دیا۔ جابر کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مقابلے کے روز وہ بھر کر شوالا پر ٹوٹ پڑا اور گھمسان کی جنگ ہوئی مگر فتح جابر کا مقدر تھی کیونکہ اب اُس کے پاس ناقابلِ تسخیر طاقتوں کے علاوہ زارشی اور باگمان کے زاد و رہ بھی تھے۔ جابر نے مغلوب شوالا کا نصف دھڑ بے جان مجسمے میں تبدیل کر دیا۔ اس کامیابی پر اُسے بہشتِ آقابلا کی ایک حور دساز عطا کی گئی مگر اب جابر محض کنیزوں سے بہلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اشتعال و اضطراب میں کاہنِ اعظم کے پاس پہنچا۔ کاہن نے اُس کی ڈھارس بندھائی اور اُسے مزید معرکے سر کرنے کی ترغیب دی چنانچہ جابر نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ کاہنِ اعظم سے کچھ اور حیرت انگیز علوم اکتساب کیے۔ انھی دنوں اتفاق سے مہذب دنیا کا ایک قافلہ توری کے ساحل پر اُترا۔ جابر سریتا کے ساتھ بے اختیار وہاں پہنچا مگر اس سے پہلے کہ وہ جی بھر کے اُنھیں دیکھتا، اُسے آقابلا کی بارگاہ میں طلب کر لیا گیا۔ جابر متحمل پیچ و تاب کے ساتھ بے شمار اُمنگیں لیے محبوب کے روبرو پہنچا اور اذن ملتے ہی اُس نے اپنا دستِ وحشت اُس کی ساقِ سیمیں تک دراز کر دیا اور اُس کے بدن پر کھلے پھولوں میں سے ایک پھول نوچ لیا۔ اس باریابی نے جابر کی تشنگی انتہا پر پہنچا دی تھی اس لیے اس وحشت میں اُس نے سریتا کی دخل اندازی کے باوجود مہذب اجنبیوں کو دیوتاؤں پر قربان کرنے کا ہولناک فیصلہ کر لیا۔

فیروز، مِینا، مارشا اور جوزیا جابر کے لیے وقف کر دی گئیں اور مرد بھیانک طریقے سے مجمعِ عام میں قتل کر دیے گئے۔ صرف ایک نوجوان شہزاد زندہ بچا جسے اُس کی جرأت مندی اور بے باکی کے باعث جاراکا کی روح نے پناہ عطا کی تھی۔ اُس نے جابر پر یہ ناقابلِ توقع انکشاف کیا کہ اُسے سیاہ ذرّات کے جھونڑ میں ایک بے مثال نسوانی چہرے کی جھلک دکھائی دی تھی۔ اس انکشاف نے جابر کے دل میں ہیجان برپا کر دیا۔ اُس نے دیوانگی کے عالم میں شہزاد سے شدید ترین مشقتیں لیں اور اُس کی جواں سالی نچوڑ کر پھول سا بدن روند کر پھر اُس کی نکالنی چاہی مگر اُسے سکون نہ ملا۔ آخر وہ توری کے ایک برگزیدہ شخص کے غار میں پہنچ کر اعمال و عبادت میں غرق ہو گیا۔ یہ غار اُس نے ایک معرکہ آرا جدوجہد کے بعد بوڑھے بزرگ کو مار کر حاصل کیا تھا۔ وہ غار کے مشاغل میں ایک طویل مدت تک منہمک رہا اور نہ جانے کب تک منہمک رہتا کہ ایک روز سرنگا کی دیوی نے اچانک وارد ہو کر اُسے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ خطرے کی گونج محسوس کر رہی تھی۔ جابر قبیلے میں پہنچا تو اُس دہشت اثر خبر نے اُس کا استقبال کیا کہ نوجوان شہزاد پُراسرار طور پر کہیں غائب ہو گیا ہے۔ جابر کے ذہن میں فوراً ایک شبہ اُبھرا اور وہ دیوانہ وار کاہنِ اعظم کے پاس پہنچا۔ کاہن کی گفتگو سے اُس کے شبہے کی تصدیق ہو گئی۔ شہزاد اس وقت قصرِ آقابلا میں تھا۔ جابر نے کاہن سے آقابلا کی خدمت میں حاضری کی درخواست کی۔ کاہن نے اُسے مطلع کیا کہ مقدس آقابلا ایک سو ایک دن کے لیے جاراکا کی عبادت میں مصروف ہونے والی ہے اس لیے سردست وہ اُس سے نہیں مل سکے گی۔ جابر کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ اُس نے واپس آ کر جنون کے عالم میں شہزاد کی منگیتر سبینا کو قتل کروانا چاہا لیکن رحم دل سریتا نے غیر معمولی سبب کی آڑ سے اُسے بچا لیا۔ پھر جب شہزاد کی واپسی ہوئی تو ہر چند کہ اُس کی نیاز مندی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا جابر اُسے موت کے گھاٹ اُتارنے پر تُل گیا۔ قریب تھا کہ وہ شہزاد کو مار ڈالتا مگر اُسی وقت آقابلا کے حفاظتی دستے کے فولادی قوت رکھنے والے نابینا آقابلوؤں نے اُسے زنجیروں میں کس کر نظربند کر دیا۔ آقابلا کے حفاظتی دستے کا ہر سپاہی آقابلو کہلاتا تھا۔ جابر کی نظربندی معمولی واقعہ نہیں تھا تاہم اُسے کوئی اور تکلیف نہیں دی گئی۔ نظربندی کے دوران میں اُس نے فرزیں اور ساشا کو بھی اپنی دل بستگی کے لیے طلب کیا لیکن وحشت و اضطراب میں افاقہ نہ ہوا۔ ایک رات وہ اپنے نوادر میں محو تھا کہ ہمریکا کی آنکھوں میں اُس نے یہ عجیب تماشا دیکھا کہ انگرو کے برگزیدہ باغی ایک مہیب طوفان کی طرح توری کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جابر نے گھبرا کر حتی المقدور اوراد و وظائف اور اعمال و علوم کا سلسلہ شروع کر دیا مگر سرنگا کی دیوی نے بروقت نمودار ہو کر اُسے کسی انتہائی اقدام سے روک دیا۔ سمندر میں دیر تک بلائی قوتوں کی طرف سے غضب ناک مزاحمت اور کشمکش جاری رہی تا آنکہ باغی گروہ سطحِ سمندر سے اوجھل ہو گیا۔ جابر توری میں ایک قیدی کی حیثیت سے رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اُسے جزیرۂ سبزنار اور جزیرۂ اسمار جانے کی اجازت مل جائے۔ سبزنار میں اُس کی مفرور محبوبہ فلورا کے علاوہ ساحروں کا سالار جالوش بھی اقامت پذیر تھا جس سے جابر بہت کچھ حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔ فلورا کو وقت اور حالات نے اتنا بدل دیا تھا کہ وہ ایک بار ڈاکٹر جوادو کے ذریعے جابر کی جان لینے کی سعی ناکام کر چکی تھی۔ بعد میں جوادو نے معافی مانگ کر جابر کی پناہ حاصل کر لی تھی۔ ان امور کے باوجود فلورا ایک پھانس کی طرح اُس کے دل میں چبھی ہوئی تھی اور وہ اُسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا اور اسی کام کے لیے سبزنار کا سفر ضروری تھا۔ جزیرۂ اسمار تاریک بڑاعظم کا ایک منفرد علاقہ تھا کیونکہ وہاں مردوں کے بجائے طاقت ور اور خوبصورت ترین کم عمر عورتوں کی حکمرانی تھی جنھیں آج تک کوئی مرد مغلوب نہیں کر سکا تھا۔ جابر یہ جوئے شیر لانے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ وہ ابھی پُرعزم خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ ایک روز کاہنِ اعظم نے اچانک وارد ہو کر اُسے یہ مژدہ سنایا کہ آقابلا کی عبادت مکمل ہو گئی ہے اور جابر کی نظربندی کے احکام واپس لے کر اُسے جزیرۂ اسمار جانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

جابر اُداسی اور مسرت کی امتزاجی کیفیت میں اسمار جانے کی تیاری کرنے لگا۔ روانگی سے قبل اُس نے شہزاد کی تالیفِ قلب کے لیے مشترکہ عبادت کا ایک ہولناک تماشا منعقد کیا۔ اس وقت توری کی ساری آبادی اُس کے سامنے تھی۔ اُس نے بھرے مجمع میں صدا دی کہ میں مقدس جاراکا کی روح کو خون کا نذرانہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی ہے جو اس عظیم الشان ایثار پر آمادہ ہو؟ مجمع خوف زدہ ہو کے بھن بھنانے لگا۔ یکایک نوجوان شہزاد بھیڑ چیرتا ہوا آیا اور سردار کے روبرو تن کے کھڑا ہو گیا۔ اُسے مارنے کا نتیجہ جابر کو معلوم تھا اس لیے اُس نے فوراً اپنے اعلان میں ترمیم کر دی اور شہزاد سے کہا کہ میں تمھاری عزیز ترین شخصیت کی قربانی چاہتا ہوں۔ شہزاد ٹھٹک کے رہ گیا مگر اُس نے بڑی حوصلہ مندی اور ذہانت سے جوابات دیے تاکہ جابر کی توجہ سبینا کی طرف سے ہٹ جائے لیکن جابر نے بھی اپنے موقف سے سرِمُو انحراف نہیں کیا۔ نتیجتاً بے بس شہزاد کو اپنی محبوبہ کا تارِ حیات اپنے ہاتھوں سے منقطع کرنا پڑا۔ یہ انتہائی دردناک اور رقت انگیز منظر تھا۔ نازک مزاج سریتا منہ پھیر کے پاؤں پٹختی ہوئی کسی طرف نکل گئی۔ اس دہشت ناک ہنگامے کے بعد جابر سرنگا اور سمورال سے ملا۔ اُن دونوں نے اُسے بڑی دل سوزی سے الوداع کہا اور اپنے اپنے طور پر کچھ زرّیں نکات تعلیم کیے۔ جابر سے بچھڑتے وقت خصوصاً سریتا اور ایرانی دوشیزہ فرزیں کی حسرت ناک قابلِ دید تھی۔ انھوں نے روتے ہوئے اُسے رخصت کیا اور جابر دیدارِ آقابلا سے محرومی کا بوجھ دل پر لیے ایک طویل سمندری سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ ہزار مسافتوں کی ایک مسافت طے کر کے گوناگوں احساسات کی معیت میں جزیرۂ اسمار پر اُترا لیکن وہاں آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ میلوں پیدل چلا اور بلند ترین پہاڑی چوٹیاں اُس کے زیرِ قدم آئیں پھر بھی کسی ذی روح کا سامنا نہیں ہو سکا یہاں تک کہ اُسے عاجز آ کر کاہو کی روح کو طلب کرنا پڑا۔ کاہو لرزتا کانپتا نمودار ہوا اور منزل کی ایک مبہم نشان دہی کر کے بہ عجلت رخصت ہو گیا۔ بہت دور جابر اپنے نوادر سنبھالتا ہوا دوبارہ چل پڑا۔ خاصی دربدری کے بعد اُسے ایک حسین و جمیل دوشیزہ فنا سرلی اور دلیر جابر کی ناقابلِ تسخیر وجاہت سے متاثر ہو کے اُسے اسمار کی ایک ناظمہ تلمراش کی خدمت میں لے گئی۔ اسمار تاریک بڑاعظم کا ایک عجیب و غریب شہر تھا جس کا کوچہ کوچہ منتخب ترین حسیناؤں اور خوش نما عمارتوں سے لبریز تھا۔ یہاں کی عورتیں خوبصورتی، نزاکت اور دلکشی کے باوصف بلا کے ضبطِ نفس اور دبدبے کی حامل تھیں۔ مردوں کی حیثیت ثانوی تھی اور وہ مکمل طور پر عورتوں کے دست نگر تھے۔ تلمراش نے ناپسندیدگی کے باوجود تین علاقوں کے مسافر سردار جابر بن یوسف الباتر کا استقبال انتہائی رعونت سے کیا اور اُسے حکم دیا کہ وہ اپنے نوادر اُتار دے۔ جابر یہ حکم کیسے مان لیتا؟ اُس نے آناکانی کی جس کے نتیجے میں اُسے سیاہ فام نیزہ بردار عورتوں کی حراست میں زنداں جانا پڑا۔ دوسرے دن اسمار کی ساری ناظمات کے سامنے اُس کی پیشی ہوئی جہاں سے ایشام نامی ایک ناظمہ نے اُسے اپنی تحویل میں لے لیا اور روایت کے مطابق پری رخوں کے اژدہام میں لے جا کے یہ اعلان کیا گیا کہ کوئی ہے جو اس خوب رُو کو بزورِ قوت ناظمہ ایشام سے حاصل کرے؟ یکایک جابر کو مجمع میں ایک شناسا چہرہ نظر آیا اور اُس نے آنکھیں مل کر تصدیق کی کہ وہ اشمار ہی ہے۔

جابر فرطِ مسرت سے چیخ پڑا۔ اشمار یکایک انبوہ سے نکل کے ایشام کے مقابلے پر آ گئی۔ شاید یہ تاریخِ اسمار کا پہلا واقعہ تھا کہ ایک عام عورت نے کسی ناظمہ سے ٹکر لینے کی جرأت کی تھی۔ مجمع میں خوف، اشتیاق اور تعجب کی لہر دوڑ گئی۔ بڑی خونریز اور معرکہ آرا جنگ ہوئی۔ نسوانیت کا یہ جابرانہ رُخ دیکھ کر شجیع اور خوش مند جابر بھی ششدر رہ گیا۔ لڑائی مختلف سنگین اور دلچسپ مراحل سے گزرتی ہوئی اختتام کو پہنچی۔ فریقین نے وجیہہ جابر کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی لیکن اشمار کی طلب صادق نکلی۔ وہ فتح یاب ہو گئی اور جابر کو والہانہ انداز میں پری رُخوں کے ہجوم سے گزارتی ہوئی اپنی قیام گاہ لے آئی۔ اُس نے ایک مردِ حاکم کی طرح خوب رُو جابر کو خود سے ہم کنار کیا اور فخریہ انداز میں اسمار بھر کی سیر کرائی۔ جابر نے اُس کی فیاضانہ اجازت سے گلشنِ اسمار کی دوسری ثمر بار شاخوں کا رس بھی

بیا لیکن اپنے آپ کو مدہوش نہیں ہونے دیا اور گمبھیر تخلیوں میں اُس نے اشمار سے بڑی مفید اور امید افزا معلومات حاصل کیں۔ اسمار کی ملکہ شوطار تاریک بحرِ اعظم میں ایک بے حد بلند مقام پر فائز تھی۔ بیزنار کا ساحرِ اعظم جالوش اُس کا پشت پناہ تھا۔ شوطار کے ایوانِ خاص میں بے شمار نوادر کے علاوہ ایک طلسمی عکس نما بھی تھا جس میں وہ حسبِ خواہش اسمار بھر کی سرگرمیاں دیکھ لیتی تھی۔ صرف اسمار کی عبادت گاہ ایک ایسا مقام تھا جس پر شوطار کی دسترس نہیں تھی اور جس کی سرگرمیاں عکس نما کی بصیرت سے اوجھل رہتی تھیں۔ جابر اشمار کی رضامندی سے عبادت گاہ پہنچ کے ریاضت میں ڈوب گیا کہ اُسے اپنے تن من کا ہوش نہ رہا۔ یہاں تک کہ عبادت گاہ کے کاہنِ اعظم قرسام کی توجہ اور تربیت اُسے حاصل ہو گئی۔ اس طرح اپنی طلسمی اور باطنی صلاحیتوں میں بے پناہ اضافہ کر کے جب وہ وہاں سے نکلا تو سیدھا الیشام کے پاس جا پہنچا۔ الیشام نے جتابانہ اُس کا استقبال کیا اور جی بھر کے اُس سے متمتع ہوئی۔ جابر نے اُسے سرشار کر دیا اور دوسرے روز دل ربایانہ اصرار کر کے اُس کے ساتھ ناظمات کے ایوان میں پہنچا۔ یہاں سے شوطار تک رسائی کے لیے اُسے اس ایوان میں اپنے نوادر کی مدد سے بڑے حیران کن اور جرأت مندانہ اقدامات کرنے پڑے۔ ناظمات کی محفل میں جابر کی یہ سرکشی رنگ لائی اور ایک ناقابلِ بیان ہنگامہ برپا ہو گیا اور جابر کو ایک خطرناک مجرم کی حیثیت سے زنداں میں ڈال دیا گیا اور کسی قسم کی رعایت روا نہ رکھی گئی۔ اب وہ اسمار کی ناظمات کے بس میں نہیں رہا تھا چنانچہ آخر ملکۂ عالیہ شوطار کو اُس کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور اُسے کیفرِ کردار کو پہنچانے کے لیے قصرِ شوطار میں طلب کر لیا گیا۔

آخر رنگ و نور کا دروازہ کھل گیا۔ اسمار کی ملکہ شوطار کی دید کا دروازہ، میری قسمت کا دروازہ۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے میں نے اس جزیرے میں مشکل ترین دن گزارے تھے۔ میں اس ابتدائی امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا کہ کسی طور ملکہ شوطار کے قصر تک رسائی حاصل کر سکوں، میری دانش مجھے یہاں تک لے آئی تھی۔ یوں سمجھیے کہ میں تاریک بحرِ اعظم میں ریاضت، شجاعت اور فراست کی منزلیں سر کرنے کے بعد ایک اور منزل سے ہم کنار تھا۔ یہ منزلیں کہاں ختم ہوں گی؟ پُراسرار ہندی بوڑھے سرنگا کا خیال تھا، جب ہم مہذب دنیا میں واپس چلے جائیں گے۔ میں اسے خواب سمجھتا تھا۔ میری منزل کچھ اور تھی۔ میں نے اپنی شعلہ نفسی ایک ہی شخص سے وابستہ کر دی تھی، اس کا جمال انتہائے جمال ہے اس کا وصال انتہائے وصال ہے۔ جب تک میں یہ کمال حاصل نہیں کر لیتا منزلوں، معرکوں اور دھموں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ہر قدم پر ایک امتحان۔ ہر لمحے ایک خطرہ۔ ایک دروازے کے بعد دوسرا دروازہ۔ ایک زمین کے بعد دوسری زمین۔

شوطار کے ایوانِ خاص کا دروازہ کھلا تو میں ایک عزم کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ نقرئی گھنٹیوں کی مسحور کن آوازوں، عطر بیز ہواؤں اور رنگ برنگے بادلوں کے جھرمٹ نے میرے ذہن پر ایک مستی سی طاری کر دی۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی صدر دروازہ بند ہو چکا تھا میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میری آمد میری ایما کے سبب تھی۔ سو خوف اور جھجک کا کیا سوال تھا؟ میں ان نظر نواز نظاروں سے لطف اُٹھاتا آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا، بادلوں کی دیواریں میرے جسم سے چھٹتی جا رہی تھیں، میں ایک سیلِ رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، کمرے کے وسط میں پہنچ کے میں رُک گیا کیونکہ میرے سامنے تا حدِ نظر سرخ بادلوں کے تودے لہرا رہے تھے۔ ملکہ شوطار کا جلوہ بھی آفابلا کے جلوے سے مشابہ تھا، وہی تمکنت، وہی رنگ و آہنگ۔ فی الحال میرے ذہن میں ملکہ شوطار سے ملاقات کے بعد کوئی منصوبہ واضح نہیں تھا۔ اس قصر تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد اسی وجہ سے تھی کہ میں آئندہ سمجھ کے اپنے اقدام مرتب کرنا چاہتا تھا، میں شوطار کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا، اسمار میں اس کے حسن کے بڑے چرچے تھے، اس کی دانائی مستند سمجھی جاتی تھی، اس کی فضیلت سب پر منکشف تھی۔ سبھی اس کا احترام کرتے تھے اور مشہور تھا کہ اسے جزیرۂ بیزنار میں مقیم ساحرِ اعظم جالوش کی خصوصی اعانت حاصل ہے۔ میں نے اسمار میں ایسی حسین عورتیں دیکھی تھیں کہ شوطار کا تصور کر کے ہی جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگتی تھیں۔

اب جو یہ ایوان، یہ طلسمی مناظر، یہ کیف و مستی، دیواروں پر کندہ یہ نقاشی یہ جاہ و جلال دیکھا تو اس کی عظمت کا احساس میرے ذہن پر کچھ اور مرتسم ہو گیا۔ مجھے لورینا یاد آگئی جو جزیرۂ باگمان کی مختار تھی اور جس کے بدن پر مجھے تصرف کا حق حاصل تھا اور میں نے یہ حق اشالا کو تفویض کر دیا تھا۔

میں محوِ تماشا تھا۔ موسیقی کے زیر و بم میں کچھ تغیر سا ہوا اور سرخ رنگ کے بادل چھٹنے لگے۔ میں نے ایک تخت اوپر سے اُترتے دیکھا، میری نگاہ اس پر مرکوز تھی، تخت چند ثانیوں میں فرش پر اُتر گیا۔ کوئی پیکرِ جمیل اس پر نیم دراز تھا، اس کے خدوخال واضح نہیں تھے کیونکہ اُڑتے ہوئے روئی کے گالے اس کے بدن سے شرارتیں کر رہے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ حاسد گالے کسی اور کو اس کا جلوہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ وہ ہالے کے مانند اس کے گرد چکرا رہے تھے۔ میں نے اپنا اشتیاق سمیٹا اور آگے بڑھنا چاہا۔ اُسی وقت مجھے ایک ترنم ریز آواز سنائی دی۔ "رسیدی جابر! یہ مقدس ملکہ شوطار کا ایوانِ خاص ہے۔"

میں نے آواز کی جانب نظر اٹھائی تو ایک نوخیز حشر ساماں دوشیزہ کچھ فاصلے پر میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ ایک نوشگفتہ کلی کے مانند تھی، اتنی ہلکی اور سبک کہ اسے ہاتھوں پر اُٹھا کے نچانے کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔

وہ شباب کی ابتدا تھی۔ اس کا بدن آفابلا کی پری چہرہ نازنینوں کی طرح بے نقاب تھا۔ میری نظریں چکا چوند ہو گئیں۔ میں نے اپنے آپ پر جبر کیا اور اس کے لفظوں کی شیرینی سے اپنا خشک گلا تر کرنے کے بعد ادب سے کہا۔ "اے شوطار کی جانشین آواز! مقدس ملکہ سے کہو کہ تمام احترام اس کے لیے واجب ہیں کیونکہ تین جزیروں کے سردار جابر

بن یوسف نے اسار میں بڑے ستم جھیلے ہیں میری طرف سے اسے میری محبتوں اور اطاعتوں کا یقین دلاؤ۔ کہو کہ وہ ان بادلوں کو آسمان میں جانے کا حکم دے جو میرے اور اس کے درمیان دیوار بنے ہوئے ہیں۔" میری آواز ایوانِ خاص کے در و بام میں گونجنے لگی اور میں نے اس کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے شوطار کی ترجمان کو دیکھا۔ اس کا گلابی چہرہ کھِل گیا تھا۔

"سیدی جابر! مقدس شوطار تمھاری عقل و دانش کے قصوں سے آگاہ ہے۔ اسے عظیم دیوتاؤں کی اعانت حاصل ہے اور ساحرِ اعظم جابلوش سے ایک خصوصی نسبت ہے تاریک بحرِ اعظم میں اسار کا مرتبہ سب سے بلند ہے اور اسار کی ملکہ شوطار ہے۔" ترجمان دوشیزہ نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"ہاں! اسار کی ملکہ مقدس شوطار ہے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں اس وقت اس جزیرے کی سب سے بزرگ اور مقتدر عورت سے ہمکلام ہوں۔ میں نے یہاں وارد ہوتے ہی اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن میرے راستے میں درمیان کے لوگ حائل ہو گئے۔ انھوں نے مجھے بہت ستایا۔ انھوں نے جابر بن یوسف کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا۔" میں نے کسی قدر تیز آواز میں کہا۔

"توہین"۔ وہ نقرئی ہنسی ہنسنے لگی۔ "تین قبیلوں کے سردار کی توہین"

اس نے ایک ہلکا قہقہہ لگایا پھر سنجیدہ ہو کے بولی۔ "جابر بن یوسف! کیا ملکہ شوطار نے تمھیں اسار میں مدعو کرنے کے لیے اپنے کاہن ارسال کیے تھے؟"

میرے ذہن میں اسار میں پیش آنے والے تمام واقعات محفوظ تھے اور مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ شوطار کی ترجمان کے لہجے کے عقب میں کون سے جذبات پوشیدہ ہیں۔ میں نے کبیدگی کا اظہار کیے بغیر کہا۔ "یقیناً مقدس ملکہ شوطار کی طرف سے توری میں کوئی سفارت نہیں بھیجی گئی تھی لیکن دیوتاؤں نے مجھے اسار کی زمین میں بھیج دیا اور تاریک بحرِ اعظم کی عظیم و جلیل ملکہ اقابلا (میں نے اقابلا کا نام بطورِ خاص زور دے کے ادا کیا) نے اسار جانے کا حکم دیا۔ شاید اس نے میری خدمات اور کارناموں سے خوش ہو کے مجھے اسار کی نازنینوں کے شباب کی سیاحت کا موقع عطا فرمایا۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے ساتھ ایک معزز مہمان کا سلوک کیا جائے گا لیکن یہاں مجھے عام مردوں کی طرح ستون پر رکھا گیا اور میرے لیے جنگ و جدل کا ایک معرکہ برپا ہوا۔ میں نے متعدد بار ناظموں سے درخواست کی کہ مجھے ملکہ شوطار کی خدمت میں پیش کر دیا جائے لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی نتیجتہً مجھے اپنے آپ کو اسار کی عبادت گاہ میں چھپانا پڑا۔ میں نے وہاں کاہنوں کی خوشنودی حاصل کی اور انھیں اپنی ریاضت سے متاثر کیا جب میں وہاں سے چلا تو کاہنِ اعظم قرسام نے میرے گلے میں میری فضیلت کی سند کے طور پر یہ مالا ڈال دی۔ میرے تحائف میں ایک اور نادر چیز کا اضافہ ہو گیا۔ میں مقدس ملکہ شوطار کی دید کے لیے تڑپ رہا تھا اگر میرے حواس توانا نہ ہوتے تو میں توری میں ایک اجنبی ہونے کے باوجود سرفرازی حاصل نہ کرتا۔ میں زارشی کی ابدی آگ کی نذر ہو جاتا اور میری روح مہذب سرزمین میں اپنے آبا و اجداد کے قبرستان میں بھٹک رہی ہوتی۔ میں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر ایسی راہیں ہموار کر لیں کہ میں مقدس شوطار کی خدمت میں حاضر ہو سکوں اور آج یہ دروازہ وا ہو گیا۔ میں اس کے شبستان میں دادِ حسن کے لیے حاضر ہوں۔"

میرا طویل بیان نہایت غور اور دلچسپی سے سُنا گیا۔ میں نے خود ہی تمام روداد اس کے گوش گزار کر دی تھی مجھے معلوم تھا کہ سوالات کی نوعیت کیا ہو گی اور مجھے کس طرح اپنا مقدمہ شوطار کی عدالت میں پیش کرنا ہو گا۔ میں نے اپنی تقریر کا دل پذیر اثر دیکھنے کے لیے گردن نہیں اٹھائی۔

"جابر بن یوسف!" اس شوخ نازنین کی آواز کا طلسم جاگا۔ "تم نے دلکش پیرائے میں خود ہی اپنی ہنگامہ آرائیوں کی تاویل پیش کر دی۔ شوطار بھی جری اور ذہین مردوں سے دلچسپی رکھتی ہے لیکن تم نے اسار کے قوانین کے خلاف سرکشی کی ہے۔ تمھیں ہر لمحے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ تم اسار کی سرحدوں میں ہو۔ جہاں مردوں کی حیثیت مختلف ہے، اور جہاں ملکہ شوطار کا اقبال فروزاں ہے۔ یہاں تم تین جزیروں کے سردار نہیں ہو، ایک عام مرد ہو۔ ہاں جزیرے کے قوانین کی رُو سے یہاں برتری کے تمام مواقع میسر ہیں۔"

میں نے سنبھل کر کہا۔ "جابر بن یوسف اسار میں اپنی حیثیت سے آگاہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی برتری یہ ہے کہ وہ مقدس شوطار کے قریب ہے۔ ناظموں کی محفل میں انتشار پھیلانے کی غرض و غایت ہی یہ تھی کہ میں وقت کی رفتار تیز کرنا چاہتا تھا۔"

"ملکہ شوطار نے تمھاری صاف گوئی کا اثر لیا۔ وہ خوبصورت مردوں کی غلطی نظر انداز کر دیتی ہے لیکن اُسے گستاخیاں سخت ناپسند ہیں۔ ناظمِ اعلا قسریم نے تمھیں وہ زنداں اسی لیے دکھایا تھا کہ جزیرۂ اسار اور قصرِ شوطار میں جو مرد اپنی حد سے تجاوز کر جاتے ہیں، ان کا انجام کیا ہوتا ہے؟ جو ملکہ شوطار کا رتبہ بھول جاتے ہیں وہ خود اپنی نفی کرتے ہیں۔"

"یہ بات میرے ذہن پر نقش ہے مجھے یقین ہے کہ مقدس شوطار

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے ...

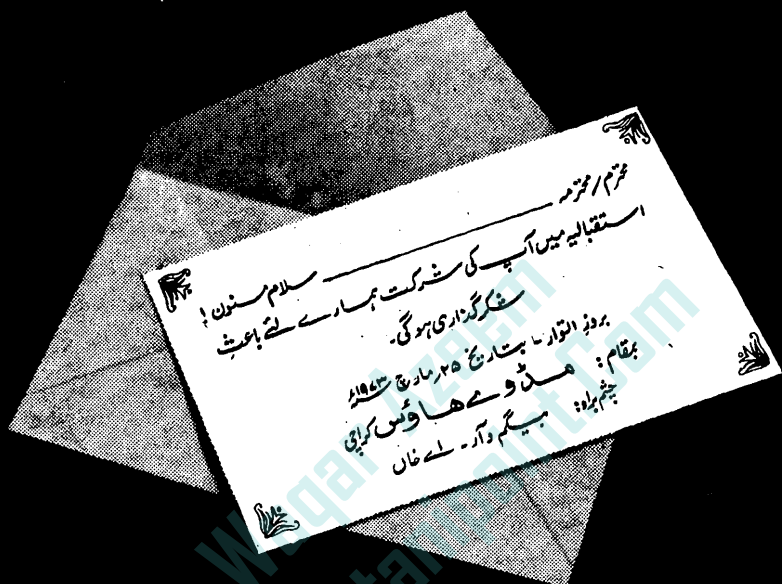

موقع کچھ بھی ہو۔ شادی بیاہ کا۔ یا صرف دوستانہ ملاقات کا
آپ کی خوشیوں کو دوچند کرنے کے لئے۔ ہم حاضر ہیں !
ہر قسم کے بہترین کھانے کا انتظام ... طرح طرح کے
مشروبات .... اچھی سروس ... حسین سجاوٹ ...
دلکش ماحول ... اور الگ تھلگ جگہ ... آپ کی تقریب ! ... آپکی اپنی دنیا !

مِڈوے ہاؤس - ہر خوشگوار تقریب کے لئے

PIA -
hotel midway-house
KLM

IAL-MH-1-73

Waqar Azeem
PakistanPoint.com

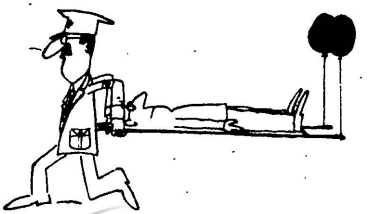

نے فیاضی کا ثبوت دیتے ہوئے میری کوتاہیاں درگزر کر دی ہوں گی۔ میں مقدس شوطار کی دید کا طالب ہوں۔ کیا وہ براہِ راست مجھے ہم کلامی کے شرف سے نہیں نوازے گی؟ اسمار آنے کے بعد میں اس کے نظارہ افروز نظارے سے محروم رہوں گا تو ہمیشہ کے لیے کرب میں مبتلا رہوں گا۔ میں اس کے جمال کی داد دینا چاہتا ہوں۔ بتاؤ اے پری پیکر ترجمان! کیا تم مجھے اس سعادت سے محروم ہی رکھو گی۔ کیا میری اطاعت اور صاف بیانی میں تمھیں کوئی شبہ ہے؟"

"جابر بن یوسف! ملکہ شوطار خزاں اور بہار کے موسموں کا عرفان رکھتی ہے۔ اس کی نظریں پانیوں کے اندر گوہرِ آب دار تلاش کر لیتی ہیں اور اسے خوبصورت پھولوں کے ساتھ وابستہ کانٹوں کا علم بھی رہتا ہے۔ ملکہ شوطار اسمار میں تمھارے قیام کی طوالت کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہے تاکہ تمھیں اقابلا کے فرستادے کی حیثیت سے عزت و احترام کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔" ترجمان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

میں ان لفظوں کے معانی جانتا تھا۔ شوطار کی بارگاہ میں کوئی مرد اتنی جرأت کے ساتھ اپنا مدعا بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اب تک اس کا قصہ نمٹ جاتا۔ میرے ساتھ جو رعایت کی گئی تھی اس کا سبب کچھ اور تھا۔ میری حیثیت جزیرۂ اسمار کے قوانین کی رو سے ایک عام مرد کی ضرور تھی لیکن میں کوئی آسان مرد نہیں تھا اور میرا کام صرف یہ نہیں تھا کہ میں اپنی لغزشوں کی طہارت کے لیے قصرِ شوطار آنے کے لیے بے چین تھا، یا شوطار کے حسن کا ذکر سن کے میری راتیں بے خواب ہو گئی تھیں۔ قصرِ شوطار میں داخلے اور چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میری وہاں سے واپسی میری ناکامی تھی۔ مجھے ایک عرصے کے لیے وہیں رہنا تھا اور شوطار کا اعتماد حاصل کرنا تھا۔ توری میں حبشی میری رعایا تھے۔ باگمان میں غیر مہذب وحشی میرے اشاروں کے غلام تھے لیکن اسمار، اسمار تو تاریک برِاعظم کی جنت تھی۔ عالی شان قصر دیکھ کے میرے اندر ان گنت جذبے اُبلنے لگے تھے اس لیے مجھے شوطار کی تلخ نوائی کا زہر پینا تھا اور برداشت کرنا تھا۔ وہ مبہم لفظوں میں میری واپسی کے احکام صادر کر رہی تھی، ان لفظوں میں ایک نفرت موج زن تھی، جابر بن یوسف جیسے ذکی الحس شخص کے لیے یہ بات بڑی گراں تھی تاہم مجھے اسے اپنے سر سے گزارنا تھا۔ میں نے چند لمحے خاموشی اختیار کی، میں ایک تاثر انگیز جواب کے لفظ مجتمع کر رہا تھا، مجھے اپنے حلقوم کی صفائی کا یقین ہو گیا تو میں نے درد انگیز لہجے میں کہا۔ "آہ مجھے علم تھا کہ مقدس شوطار کتنی رحم دل اور فیاض ہے مجھے یقین تھا کہ جب میں اس کے روبرو حاضر ہوں گا تو وہ میری شدتوں کا اعتراف کرے گی۔ مجھے اسمار سے عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا جائے گا۔ اس کلمے نے مجھے مقدس شوطار کی عظمت و جلالت کا کچھ اور معترف کر دیا ہے۔ میں اسمار سے جاؤں گا تو نازنینانِ اسمار کی گرم آغوش اور گداز سینوں کا ذکر کروں گا، کاش میں ہمیشہ مقدس شوطار کے پہلو میں رہتا اور اس کا مثالی مرد ثابت ہوتا۔ میں تین جزیروں کی حکمرانی ٹھکرا دیتا اور مقدس شوطار کے قرب کی سعادتوں سے بہرہ ور ہوتا۔ کاش میں اسمار میں پیدا ہوا ہوتا۔ میری درخواست ہے کہ مقدس شوطار مجھے کچھ عرصے اپنے قصر میں قیام کرنے کی اجازت دے تاکہ میں عملی طور پر یہ ثابت کر سکوں کہ میں اس کا مطلوب شخص ہوں اور کتنا مطیع اور سعید غلام ہوں۔" پھر میں نے اسے انگرولا کے باغیوں میں اقابلا سے وفاداری کا قصہ، زاشی کی شقیقوں اور توری اور باگمان میں اپنی بلند اقبالی کے واقعات سنائے۔ میں نے دانستہ اقابلا کا ذکر کم سے کم کیا لیکن احتراماً حوالے کے طور پر اس کا نام لیتا رہا۔

خوبصورت کنیز سنگِ مرمر کے تراشیدہ بُت کی طرح اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑی پلکوں کو جنبش دیے بغیر میری بات سن رہی تھی۔ میری فصاحت نے معجز نمائی کی۔ اچانک نقرئی گھنٹیاں تیز ہونے لگیں۔ کنیز یوں چونکی جیسے کسی خواب سے خوف زدہ ہو کے بیدار ہوئی ہو، اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ پٹانے لگیں۔ اس نے تیزی سے تخت کی جانب نظر کی جس کے گرد رنگ برنگے بادلوں کا ہالہ بدستور قائم تھا، شوطار نے اسے اپنی کیفیات منتقل کی ہوں گی۔ وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی آنکھوں کا خوف نشیلے سحر میں بدل چکا تھا، اس کے یاقوتی لبوں پر تبسم اُبھرا۔ اس کا بدن متحرک ہوا تو ایسا لگا جیسے شباب اُمڈ اُمڈ کر آ رہا ہو۔ میں نے اپنا گلا تر کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایک ہیجان انگیز نظارہ تھا۔ وہ بہت قریب آ گئی اور اس کے بدن سے پھوٹتی ہوئی خوشبوئیں مجھ پر غنودگی طاری کرنے لگیں۔ شوطار کی کنیزِ خاص کے لیے اس کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا۔ کیا وہ اتنے قریب ہو کر میرے نفس کا امتحان لے رہی تھی؟

اس کے قرب کی گرمی سے میں تپنے لگا تھا۔ اس کے تراشیدہ لبوں کی پنکھڑیاں کھلیں اور اس کی جذبات میں ڈوبی ہوئی مترنم آواز میرے کانوں میں شہد اُنڈیلنے لگی، "سیدی جابر! مقدس شوطار نے تمہارے کلام سے متاثر ہو کے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس کے سامنے تمہیں متبرک وصال سے شاد کام کروں۔ شوطار کا حکم دیوتاؤں کا حکم ہے۔ وہ عظیم ہے۔ آؤ ارمان کی باہوں میں آجاؤ اور شوطار کے سامنے اپنے وصال کی سرکشی کا مظاہرہ کرو۔"

شوطار کے سامنے میں اس کی کنیز سے مشرف ہوں! شوطار نے اپنی برتری کا بہت ستم ناک اظہار چاہا تھا، میں شش و پنج میں پڑ گیا اور لمحوں کے لیے میری ذہانت منتشر ہو گئی۔ میں اس اچانک وار کے لیے تیار نہیں تھا۔ "حسین ارمان!" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "مقدس شوطار سے کہو، کیا وہ اپنے اس حکم پر نظرِ ثانی نہیں کر سکتی ہے؟"

"کیا یہ سمجھا جائے کہ تمہیں مقدس شوطار کی موجودگی میں اس متبرک فعل سے انکار ہے؟" ارمان نے تیکھے انداز میں کہا۔

"نہیں۔ تم ایک ماہ جمال دوشیزہ ہو اور شوطار کا حکم میرے لیے ذریعۂ نجات ہے لیکن میرا مطلوب تم نہیں ہو، وہ کوئی اور ہے۔ مقدس شوطار کے سامنے اس کی کنیز کے ساتھ ملوث ہونا اس کی توہین ہے۔ دیوتا جانتے ہیں کہ میرے انکار کی وجہ عظیم شوطار کی تکریم ہے اور یوں بھی میں اسسار میں نووارد ہوں اور اتنی جلدی اپنے سابق آداب کے منافی کوئی عمل کرنے سے ہچکچاتا ہوں۔ مجھے معاف کیا جائے اور میرے لیے کوئی سزا تجویز کر دی جائے۔ ہاں، میں اس کے لیے تیار ہوں۔" میں نے نیازمندی سے کہا۔

"یہ ملکہ شوطار کا حکم ہے اور اسسار میں تم اس کے پابند ہو جیسا کہ تم نے ابھی اس کا عہد کیا ہے۔ انکار کی صورت میں تم شوطار کے عتاب سے بھی واقف ہو۔" ارمان کی نشیلی آنکھوں میں جذبات کے ڈورے تیر رہے تھے۔ وہ اچانک غضب ناک ہو کے بولی۔ "ملکہ شوطار تمہارے جواب کی منتظر ہے۔"

"میں جواب دے چکا ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "آہ مجھے ایک موقع دیا جائے کہ میں مقدس شوطار کے سلسلے میں اپنے جذبات کا اظہار کر سکوں اور میں نے اس کے ردِ عمل کا انتظار کیے بغیر شوطار کی شان و شوکت اور اس کی فضیلت کے دریا بہا دیے، اسسار کی اس اجنبی سرزمین اور وہاں کی ملکہ کے ایوانِ خاص میں میرے پاس اثر اندازی کا یہی ہتھیار تھا۔ میں ہر ممکن طور پر ارمان کے وصال سے بچنا چاہتا تھا تاکہ شوطار کے دل میں میری رغبت کا نقش گہرا ہو جاتے چنانچہ میں نے اپنے بیان کا واحد سہارا لیا۔ میں یہاں شپالی سے مدد نہیں لے سکتا تھا اور ذوگی کے سینگوں سے ارمان کا قیامت خیز سینہ زخمی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنا سفیر میں خود تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے لفظوں کا کتنا ذخیرہ خرچ کر دیا۔ میرے اظہار کا سیلاب روکے نہ رکتا تھا۔ پھر دفعتہً مجھے سُرخ بادلوں کے جھرمٹ بھاگتے نظر آئے اور موسیقی نے ایک طرب انگیز ماحول پیدا کر لیا۔ میں زمیں بوس ہو گیا۔ جب میں اُٹھا تو لطیف عطر آمیز ہواؤں کے جھونکوں نے خراماں خراماں بہنا شروع کر دیا تھا۔ میرے سامنے اب تخت رہ گیا تھا۔ ارمان گم ہو گئی تھی۔ مگر ایوانِ خاص میں ستارے چمکے اور وہ تخت عریاں ہو گیا جس پر ایک گل بدن بیٹھی ہوئی تھی۔ اُف وہ اس کا شراب شراب بدن، میں کچھ کہوں گا تو بات ہیچ ہو گی، مجھے معلوم ہے کہ میں کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ وہ آقابلا کا عکس تھی۔ میں یہاں اُن دونوں کا مقابلہ نہیں کروں گا۔ میں اُس کی نگاہ کا زخمی تھا اور اس کی ذات سے مجھے یک گونہ التفات ہو گیا تھا۔ آقابلا تو ان سب سے مادرا تھی، آقابلا ان سب کی سرخیل تھی، وہ اس کاروانِ حُسن کی قائد تھی۔ میں نے آقابلا کے بعد تاریک برِ اعظم میں شوطار سے زیادہ حسین سراپا نہیں دیکھا تھا۔ نوجوان، سرشار، شاداب، نشیلی۔ اُس کے بدن سے موسیقی پھوٹتی تھی۔ اسے ساحرِ اعظم جالموش کی اعانت بے وجہ حاصل نہیں تھی۔ میں دنگ رہ گیا، میں گنگ ہو گیا۔ وہ تمام ہوش و حواس جن کا مجھے دعوا تھا، اس کے حُسن کی تابانی سے میرے اختیار میں نہ رہے، میں بس اُسے دیکھا کیا۔ وہ سانچے میں ڈھلا ہوا بدن، شبنمیں رخسار، اس کے بال سنہرے سُرخ تھے، وہ سر بسر ایک نشہ تھی۔ وہ شباب کا مثالیہ تھی۔ بے داغ، شگفتہ، اُجلا رنگ اس کی جلد مخمل سے بنی ہوئی تھی اگر وہ پتے ہٹا لیتی تو ممکن تھا، میں وہیں شکست

مولانا رومی

مولانا رومی نے انسان کے ظاہر اور باطن کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "آدمی کی مثال پیالے جیسی ہے۔"

کسی نے ہنس کر پوچھا۔ "حضرت! یہ کیا مثال ہوئی؟ کہاں آدمی اور کہاں پیالہ؟ ان دونوں میں آخر قدرِ مشترک کیا ہے؟"

مولانا نے جواب دیا۔ "پیالے کو کام میں لانے سے پہلے دھونا ضروری ہے باہر سے بھی اور اندر سے بھی بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ پیالے کا باہر سے دھونا اگر لازم ہے تو اندر سے دھونا لازم تر ہے۔ یہی حال آدمی کا ہے اُسے بھی غسل دینا لازم ہے، لیکن اُس کی اندر سے تطہیر لازم تر ہے۔"

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تسلیم کر لیتا۔ وہ ایک ملکہ تھی۔ اسے عرفان ہوگا کہ جابر بن یوسف حسن کا کیسا والہ و شیدا ہے۔ اُس نے میری آنکھوں میں جھانک لیا ہوگا۔ میں ششدر کھڑا اُس حریم ناز کا آتش فشاں سراپا اپنی آنکھوں میں جذب کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ رات کو اندھیرے سے آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو جاتی ہیں اور صبح کی روشنی کی متحمل نہیں ہو پاتیں، خود میرا عالم بھی یہی تھا، میرا خیال تھا، وہ مجھ سے ناراض ہو گی اور اس کا غضب اب نازل ہی ہوا چاہتا ہے لیکن وہ بہ غور میرا جائزہ لے رہی تھی، مجھے اپنے جسم کے ہر حصّے میں اس کی آنکھیں اُترتی محسوس ہوئیں۔ ایوانِ خاص میں میرے اور اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اُس نے تخت پر انگڑائی کے انداز میں ایک کروٹ لی اور مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ مجھ سے ہم کلام ہے۔ ”جابر بن یوسف!“ اُس نے طمطراق سے کہا۔ ”تمھارا انکار تمھاری طلبِ صادق کی دلالت کرتا ہے۔“

میں نے اس کی مدح میں اپنی ساری توانائی صرف کر دی۔

”تم نے خود کو جزیرۂ اسار کے دوسرے مَردوں سے برتر ثابت کیا ہے اور یہی بات شوطار کو پسند آئی ہے چنانچہ اُس نے تمھیں ہم کلامی کے شرف سے نوازا ہے۔“ شوطار کی آواز کوئی غنائیہ تھی۔

میں نے اطاعت اور جاں نثاری کے عہد کا اعادہ کیا۔

”اگر تم نے اسار میں وہی سب کچھ ثابت کیا جس کا تم عہد کر رہے ہو تو تم یہاں بڑا مرتبہ پاؤ گے۔ ممکن ہے کہ تمھیں مستقل طور پر یہاں رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ شوطار تمھیں معاف کرتی ہے۔“ اس نے ایک شان سے کہا۔ میں نے اپنی جسارتوں کے لیے دوبارہ اس سے معافی چاہی۔

وہ احکام صادر کرتی رہی۔ میں وضاحتیں کرتا رہا۔ میں اس کے قلب میں داخل ہو جانے کے لیے مضطرب تھا۔ وہ میری سرکشی اپنی فیاضی اور احسانات سے دبانے کی خواہاں تھی۔ ہم دونوں منفی جذبات چھپانے کے لیے ایک دوسرے کے قریب آنے اور مدغم ہو جانے کی شعوری کوشش کر رہے تھے اور دونوں ایک دوسرے کا تجزیہ بھی کرنا چاہتے تھے، یہ ایک دلچسپ اور پُر لطف وقت تھا۔ مجھے اس کی مہربانیوں کے جواز سے آگاہی تھی۔ اور میں اس کے جواب میں اپنے متعلق تمام شکوک رفع کرنا چاہتا تھا۔ سو ایک دوسرے سے وضاحتیں کرتے ہوئے ہم عہد اور تجدیدِ عہد کرتے رہے کبھی وہ لطف پر مائل ہو جاتی، کبھی مجھے دھمکیاں دیتی۔ میرا بیان تو ایک ہی تھا کہ اس لطف و عنایت کے لیے اس کی غلامی کا اقرار کرتا ہوں آخر وہ بھی تھک گئی۔ میں بھی تھک گیا اور جب زبان تھک گئی تو جذبوں کی زبان کا وقت آیا۔ میں اسی وقت کا منتظر تھا۔ وہ بھی کامیاب ہو گئی کہ اس نے بزعم خود مجھے اپنا مطیع بنا لیا اور میں بھی کہ میں نے اس سنگ دل کے سینے میں گداز پیدا کر دیا۔ اس نے اپنی انگشت کو جنبش دی۔ ارباں کسی سمت سے نازل ہو گئی اور اس نے مسکرا کے مجھے دیوتاؤں کا مشروبِ خاص پیش کیا۔ میں نے وہ قدح جسم میں اتار لیا اور چند ہی گھونٹوں میں تلاطم برپا ہو گیا۔ مجھے سب خواب لگ رہا تھا۔ اسار کی جلیل القدر ملکہ اتنی جلد قریب ہو جائے گی۔ میرا اعتماد واپس آ گیا چنانچہ میں نے ارباں سے مانگ کے ایک اور قدح چڑھایا، ہر شے رقص کرتی ہوئی نظر آنے لگی۔ ارباں مشروبِ خاص انڈیلتی رہی اور میں بے تکان پیتا رہا۔ پھر ارباں پہلے کی طرح کہیں کھو گئی، شوطار کے اشارے سے میں بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ اس نے مجھے اپنے تخت کے ایک کونے میں بٹھا لیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ میں اس کے بدن کی پتیاں اور پھول نوچنے کے لیے مضطرب تھا۔ اس نے خود پہل کی اور میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ”تم میرے قصر کے وجیہہ مَردوں میں ایک اضافہ ہو۔“

”یہ لمحے میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔“ میں نے جھومتے ہوئے کہا۔

”اسار کا یہ دروازہ تمھارے لیے کھُلا ہے۔“

”کیا یہ سب سچ ہے؟ میں ہوش میں نہیں ہوں۔“

”اپنے یہ نوادرات اتار دو۔“ اس نے دل رُبائی سے کہا۔

”میں انھیں پشت پر کیسے لیتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”نہیں انھیں اُتار دو۔“

میں چند لمحے جھجکا پھر میں نے کچھ سوچ کے انھیں اتار دیا اور تخت کی کھونٹی سے انھیں لٹکا دیا۔ ”مجھے اجازت دو کہ میں یہ پھول، یہ پتیاں تمھارے جسم سے نوچ لوں۔“ میں نے جذبات میں بہکتے ہوئے کہا

”دیوتا وصال سے خوش ہوتے ہیں۔ یہ رُوح کے اتصال کی علامت ہے، جابر بن یوسف! دیوتا شوطار سے خوش ہیں اور انھوں نے اسی لیے تمھیں میرے پاس بھیجا ہے۔“ اس کی آواز میں بھی لرزش آ گئی تھی۔

میں اس وقت تاریک برِّ اعظم میں جھیلے ہوئے تمام مصائب بھُول گیا۔ مجھے مہذّب دُنیا کی رنگینیاں بھی بے کیف نظر آئیں۔ تاریک برِّ اعظم کا گوہرِ نایاب میرے قریب تھا اور لطف و کرم پر آمادہ تھا۔ دنیا میں اس سے زیادہ حسین لمحے کم خوش نصیبوں کو نصیب ہوتے

کپڑوں کی عمدہ ترین دھلائی کے لئے

سُپر

واشنگ پاؤڈر

کم خرچ، آسان اور
عُمدہ ترین دھلائی
کے لئے
سُپر واشنگ پاؤڈر
سے بہتر کوئی اور
پاؤڈر نہیں۔

تیار کردہ:

شاہنواز کیمیکلز۔ سمن آباد۔ لاہور

ORIENT

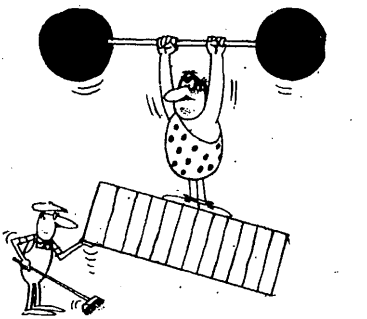

ہیں۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں اور ہاتھ لرز رہے تھے۔ جتنی دیر ہوتی جاتی تھی ضبط کا دامن چھوٹا جاتا تھا۔ آہ ایسے لمحوں میں بھی مجھے شوطار کی منزلت کا خیال تھا، یہی ایک بات اذیت کی تھی۔ میں نے جھجکتے جھجکتے ایک پھول نوچ لیا۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر چند پتے بھی اس کے بدن سے جدا کر دیے۔ وہ میری گردن میں جھولتی رہی۔ میں نے اس کی گردن پر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ رکھ دیے۔ وہ موم کی طرح نرم، ریشم کی طرح ملائم گندھے ہوئے میدے کی طرح گداز تھی۔ اس کی سرخی اور بڑھ گئی تھی۔ "اے مقدس شوطار! اب ضبط نہیں ہوتا۔ اجازت دے کہ تجھ سے اپنی وارفتگی کا اظہار کر سکوں۔"

"تمھیں اجازت ہے۔" اس نے سرشاری سے کہا۔

میں نے وحشیانہ انداز میں اس کے پھول پتے نوچنے شروع کر دیے۔ تخت پر پھولوں اور پتوں کا انبار لگ گیا اور جب اس کے بدن پر کچھ نہ رہا تو میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اسے ہزاروں سے ضرب دے لیجیے۔ شوطار مجسم رعنائی تھی۔ میں اس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیوست کرنے میں ہچکچایا۔ اس کے جسم سے خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ میں اپنی کثافتوں کے شدید احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس کے بدن کی سیاحت کا آغاز کہاں سے کروں؟ وقت تو گزر رہا ہے، نہ جانے کس وقت وہ برہم ہو جائے اور اسے میری کون سی وحشت ناگوار گزر جائے؟ ہاں وقت گزر نہ جائے اور میں یوں ہی تشنہ نہ رہ جاؤں۔ کہیں میں کسی گستاخی کا ارتکاب نہ کر بیٹھوں؟ میں حسن برتنے کے آداب یکسر بھول گیا تھا کیونکہ اس سے پہلے ایسے نازک اندام سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ میں پاگل ہو گیا۔ پھر میں نے نڈھال ہو کر خود کو اس کی آغوش میں گرا دیا۔ اس نے میرا سر اٹھایا، مجھے غور سے دیکھا۔ اس کے ہونٹ پھڑپھڑائے، میرا دل دہل گیا۔ میں اس سنسنی میں کیوں زندہ رہا؟ شاید اس لیے کہ اس نے رسیلے ہونٹوں کی شراب مجھے پلانی شروع کر دی تھی۔

جب میں اس خوابِ نشاط سے جاگا تو میں نے اپنا جسم تخت پر ڈھلکا ہوا پایا۔ مجھے اپنے جسم پر خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے گھبرا کر اپنا سینہ دیکھا، یہ سینہ خالی تھا لیکن میری جان میں جان آئی۔ نوادر کھونٹی پر لٹکے ہوئے تھے اور مسلے ہوئے کچلے ہوئے پھول پژمردہ شکستہ اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے، وصل کا ہر لمحہ مجھے یاد آنے لگا۔ کیا یہ ایک خواب تھا؟ میں قصرِ شوطار میں پڑا ہوا تھا۔ شوطار وہاں موجود نہیں تھی، صرف چند علامتیں رہ گئی تھیں اور وہ وقت گزر گیا جسے میں پکڑنا چاہتا تھا۔ میں بکھرے ہوئے پھول اپنے جسم پر نچھاور کرنے لگا۔ وہ راحت افزا احساس، وہ جاں گداز سعادت، شوطار نے مجھے دنیا کے کیسے عجیب ذائقوں سے روشناس کیا تھا؟ میری نوکِ زبان ابھی تک سنسنا رہی تھی اور لعابِ دہن ایک لطفِ بے کراں سے آلودہ تھا۔

اب کیا ہوگا؟ یہاں تو کوئی میرا پرسانِ حال نہیں۔ میں کدھر جاؤں؟ ارے میرے قدم ڈگمگا رہے ہیں، ارے یہ دیواریں گھوم رہی ہیں۔ کوئی دروازہ کھلا ہوا نہیں ہے، میں اٹھا، اٹھ کر چلا اور میں نے جذبات کے طوفان میں کہا "اے مقدس شوطار! تو نے مجھے منزلِ مراد تک پہنچا دیا۔ مجھے اپنے قریب رہنے دے، بس یہی کائنات بہت ہے۔ اس سے زیادہ کی تمنا کی استطاعت مجھ میں نہیں ہے۔ یہ دروازہ بند ہی رکھ، مجھے اس پنجرے میں قید کر لے اور میرا خون پی جا۔ مجھے نڈھال کر دے۔"

سامنے کا دروازہ کھلا تو مجھے ہوش آیا۔ میں نے اپنا ہذیان بند کیا۔ اربان مہ جمالوں کے ایک پرے کے ساتھ اندر آ رہی تھی۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹیں رقص کر رہی تھیں۔ انھوں نے خوان فرش پر رکھ دیے اور میرے بازو پکڑ لیے۔ مجھے ایوانِ خاص سے باہر لے جا کے عطریات سے غسل دیا گیا۔ میں انھیں چھیڑتا رہا۔ پھر مجھے دوبارہ ایوانِ خاص میں لایا گیا اور عمدہ مشروبات اور غذاؤں سے میری تواضع کی گئی۔ میرے قریب عورتوں کا ایک بڑا جمگھٹ رہا، ان میں اربان بھی تھی۔ میں ان تمام حسین عورتوں کے حسن و جمال کی جزئیات بتانے سے معذور ہوں۔

دنیا کے اس گم نام خطے ہی کو کیوں قدرت نے اس حسین مخلوق سے نوازا تھا۔ ان کی پذیرائی اور اہتمام دیکھ کے مجھے خوش فہمیوں نے گھیر لیا۔ میں شوطار پر غالب آ چکا تھا یا شوطار نے مجھ پر غلبہ پا لیا تھا۔ باہر کے کسی خیال سے میرا ذہن گریز کر رہا تھا۔ وہ میرے پہلو سے لگی بیٹھی تھیں۔

جام پر جام لنڈھائے جا رہے تھے۔ یہاں فکر اور رنج کا داخلہ ممنوع تھا۔ اسمار میں ایک مرد کے ساتھ ایسا سلوک کیا جا رہا تھا۔ وہ مجھے بہشت نما میں لے گئیں جہاں اونچے درختوں، ابلتے چشموں اور رنگ رنگ پھولوں نے بہاروں کو شرمایا ہوا تھا۔ اس طویل قصر میں زنانِ اسمار کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ مجھے حوضوں کے کنارے بٹھایا گیا اور سریلی آواز والی نغمے الاپے، ایک پرا علیحدہ ہو جاتا تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا۔ ایک ایوان سے دوسرا ایوان۔ سنگِ سرخ اور سنگِ سفید سے تعمیر کردہ یہ وسیع و عریض محل تا حدِ نظر پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔ ہر طرف رقص تھا، ہر طرف عشرت گاہیں بنی ہوئی تھیں، سیاہ فام مرد بھی یہاں نظر آئے جو شرماتے لجاتے اپنی حوروں کے ساتھ چل رہے تھے۔ ان کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ جا را کاکا اور دوسرے دیوتاؤں کے مجسمے جا بجا ایستادہ تھے اور وصال پر کسی جگہ بندش نہیں تھی۔ پورا محل ایک وصل گاہ تھا۔

میرے ساتھ اتنی جلد یہ سلوک کیوں کیا گیا کہ قصرِ شوطار کی سیر کا اہتمام کیا گیا؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ شوطار اپنے قصر کی شوکت و سطوت دکھا کے مجھے متاثر کرنا چاہتی ہو؟ یا یہ بھی قربت کا کوئی انداز ہو؟ جس بات کا میں خواہاں تھا، اس کی تکمیل ہو رہی تھی۔ میں مختلف ٹولیوں کے سپرد کیا جاتا رہا۔ آخر ایک ٹولی کے سپرد ہوتے وقت میری نگاہ ٹھٹک گئی، وہ زماز تھی۔ زماز، قصرِ اقابلا کی کنیزِ خاص۔ اشمار کے بعد دوسرا شناسا چہرہ تھا۔ اسے دیکھ کر دل پر ایک ناقابلِ بیان کیفیت طاری ہوئی۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا: "زماز! تم بھی یہاں ہو؟"

"ہاں سیدی جابر!" اس نے اجنبیت سے کہا۔ "مقدس اقابلا نے مجھے مقدس شوطار کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔"

"مجھے تمہیں دوبارہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ میں بھی یہاں آیا ہوا ہوں اور قصرِ شوطار میں مقیم ہوں۔" میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "اشمار کی طرح زماز کو بھی اقابلا نے میرے پاس بھیجا تھا اور وہ بھی ایک دن کچھ بتائے بغیر غائب ہو گئی تھی۔ گویا اسمار میں اقابلا کی دو خاص کنیزیں موجود تھیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کنیزیں ہوں گی۔ زماز سے مل کر میرے خفتہ عزائم کو تقویت ملی۔ میں نے اسے کریدنا چاہا اور قدیم تعلق کی باتیں چھیڑ دیں لیکن اس نے مجھے ٹال دیا۔ وہ مجھے گھماتی ہوئی دوسرے ایوان میں لے گئی اور دوسری ٹولی کے سپرد کر کے گویا بری الذمہ ہو گئی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ اس نے مجھ سے رسمی طور پر ہی بات چیت کی اور بار بار شوطار کی عظمت اور تقدس کا ذکر کرتی رہی۔ میں نے بھی رسماً اس کی تائید کی۔ اس سیاحت کے بعد مجھے ایک کمرے میں چھوڑ دیا گیا جہاں انواع و اقسام کی غذائیں تھیں اور مشروبات رکھے ہوئے تھے۔ میں بہت تھک گیا تھا، سو گیا۔ جب اٹھا تو میری بالیں پر شوطار موجود تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ دراز کر دیئے، اس نے مجھے تخت سے اٹھا لیا اور اپنے سینے میں چھپا لیا۔ اس کے بال میرے کاندھوں پر سرسرانے لگے۔

دلکش شخصیت کے مالک ایک شخص میں یہ برائیاں بھی موجود تھیں کہ وہ ایک کی دل آزاری کر کے دس کو ہنساتا تھا، کسی فلسفی نے اسے دیکھ کر کہا: "عمارت تو بڑی خوبصورت ہے لیکن اس کا مکین نہایت ہی بدصورت!"

مجھے اس قصر میں آئے ہوئے کئی دن گزر گئے۔ شوطار کی توجہ میری جانب کم نہیں ہوئی بلکہ اور بڑھ گئی۔ وہ مجھے ہر بار پہلے سے زیادہ شاداب اور حسین نظر آتی تھی۔ میرا دن یوں ہی گزر جاتا اور جب شوطار مجھ سے جدا ہوتی تو قصر کی حسین و جمیل دوشیزائیں مجھے گھیر لیتیں۔ وہ مجھے رقص و سرود کی محفلوں میں لے جاتیں اور حوض کے کنارے بٹھا کے خود اس کے پانی میں تیرتی رہتیں۔ جنت کا ایسا ہی تصور میرے ذہن میں موجود تھا، اس نظامِ طلسم کے متعلق میں نے کچھ سوچنا ہی ترک کر دیا تھا۔ کون جانے کب سے انسانوں کی یہ بستیاں آباد ہیں؟ یہاں کوئی بوڑھی عورت، بوڑھا مرد اور بچہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ خانوادۂ اقابلا کی عورتیں کبھی مرجھاتی نہیں تھیں؛ سدابہار شباب سے بڑی دولت اور کیا ہو گی؟ میں نے چند ہی دن میں قصرِ شوطار میں اپنا چہرہ نمایاں کرا لیا تھا مگر جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ یہ بیش از بیش فیاضیاں تو مجھے کہیں کا نہ رکھیں گی۔ کیا میں وہ مقصد بھول گیا تھا؟ نہیں ایسی بات نہیں تھی۔ مجھے ہر لحظہ خیال تھا کہ قصرِ شوطار میں میرے داخلے کا مقصد کیا ہے؟ وہ چند جذباتی لمحے بیت جاتے تو میں چھتیں تکا کرتا، دیواریں گھورا کرتا، میں روزن تلاش کیا کرتا، میں ان دراڑوں کی کھوج میں لگا رہتا جہاں سے میرے ارادوں کو کوئی روشنی اور ہوا مل سکے۔ پھر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ قصرِ شوطار میں بے شمار ایوان ہیں اور ہر کمرہ آئینے کی طرح شوطار کے سامنے کھلا ہوا ہے۔ شوطار اپنے طلسمی عکس نما میں سب کچھ دیکھ لیتی ہے۔ میں نے زماز سے ملنے کی کوشش کی۔ وہ مل تو گئی لیکن اتنی سراسیمہ تھی کہ اس نے کسی اور قسم کی گفتگو ہی سے گریز کیا۔ میں آزادی کے ساتھ ہر جگہ آ جا سکتا تھا۔

اس آزادی میں شروع شروع میں تو لذتِ بے کنار کا احساس رہا، بعد میں اندازہ ہوا کہ خوشبوئیں، گداز، رنگ ہی سب کچھ نہیں ہے، یہ آزادی صرف عیش و نشاط تک محدود ہے۔ ان رنگین نظاروں میں اپنے مطلب کا کوئی سراغ ملنا مشکل ہے۔ ہر طرف سمیع و بصیر دیواریں ہیں، کسی سے کسی مسئلے پر بات کرنا بھی حرام ہے۔ ہر شخص شوطار کے قہر سے خوف زدہ ہے۔ سب اس طلسمی عکس نما سے ڈرتے ہیں جو ساحرِ اعظم جاملوش نے شوطار کو عطا کیا تھا۔ میں تنہا گھومنا چاہتا تو میرے ساتھ نازنینوں کا ایک گروہ لگ جاتا۔ تنہائی نصیب نہ ہوتی۔ اسی کشمکش میں میرے شب و روز پر یاسیت غالب آتی گئی۔

میں نے شوطار کی نوخیز کنیزِ خاص ارباں سے تعلق بڑھانے کی کوشش کی۔ اس نے پُرتپاک نظروں سے مجھے خوش آمدید کہا۔ میں نے شوخیوں میں اس سے پوچھا۔ "کیا قصر کا کوئی گوشہ ایسا رہ گیا ہے جو میں نے نہیں دیکھا؟"

اس نے خوش ادائی سے جواب دیا۔ "ہاں۔ تم نے شوطار کے مخصوص ایوانوں میں سے چند ہی دیکھے ہیں۔ تم نے دیوتاؤں کا ایوان نہیں دیکھا جہاں شوطار عبادت کرتی ہے۔ تم نے وہ خاص ایوان بھی نہیں دیکھا جہاں طلسمی تحائف موجود ہیں جو ساحرِ اعظم جاملوش نے مقدس شوطار کو عطا کیے ہیں، تم نے عکس کا متبرک کمرہ بھی نہیں دیکھا۔ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے؟"

"اچھا؟" میں نے حیرت سے دیکھا۔ "تو کیا میں ان کی دید سے محروم ہی رہوں گا؟"

"یہ مقدس شوطار سے تمھاری رفاقت پر منحصر ہے۔"

"کیا اس رفاقت میں اب کوئی کمی ہے؟"

"سیّدی جابر! وہ ایک عظیم اور ذہین ملکہ ہے اس لیے ایک زمانے سے اسمار پر حکمراں ہے۔ کسی نے اس کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت اس لیے نہیں کی کوئی بھی اس کی فضیلت کے درجے تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کے پاس تحائف کا انبار ہے اور اس نے دیوتاؤں کو ہمیشہ آسودہ رکھا ہے۔" ارباں نے مجھے مشروب پیش کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی شبہ نہیں۔ کوئی شبہ نہیں۔" میں نے محتاط انداز میں کہا۔ "اس کی فطانت میں کسے کلام ہوگا، جب سے میں یہاں آیا ہوں، اس کے تدبّر کے عجیب مظاہرے دیکھے ہیں۔ اس کا حسن ملکوتی ہے۔ یقیناً اس کے سر پہ آسمان کا سایہ ہے۔ ارباں، میری جان، یہ بتا کے میری اعانت کرو کہ میں مقدس شوطار کے دل کے اور قریب، اور قریب کس طرح ہو سکتا ہوں؟"

"بس اسی طرح کہ تم اس کے دل پر اپنی شجاعت اور فطانت کا نقش کندہ کردو۔" ارباں نے کہا۔

"یہاں تو مجھے نازنینوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ میں اس قصر میں اپنی خوبیاں کس طرح ظاہر کرسکتا ہوں، جب کہ میں نے یہاں کی بزم آرائیاں ہی دیکھی ہیں۔ مجھے دیوتاؤں کے مخصوص ایوان میں جانے کی اجازت بھی نہیں ہے اور میں عکس نما بھی نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے شکایتاً کہا۔

"یہی تو تمھاری آزمائش ہے، تم اِن دلکش مناظر میں اپنا سر کیسے ابھار سکتے ہو؟"

"تم سچ کہتی ہو ارباں ـــــ تمھارے مشورے کا شکریہ۔ شوطار کے بعد تم ہی مجھے یہاں سب سے زیادہ مرغوب ہو۔ اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہو تو مجھے ٹوک دینا۔ یہ اقدام تم مقدّس شوطار سے اپنی محبت اور عقیدت کے طور پر کرنا۔"

مجھے ارباں سے اس سے زیادہ گفتگو کا موقع نہیں ملا۔ مجھے نازنینانِ قصرِ شوطار نے اپنے حلقے میں لے لیا اور میں نے خود کو ان کے سپرد کردیا۔

یہ تحفے، یہ نوادر جو میرے گلے کی زینت بنے ہوئے تھے، قصرِ شوطار میں ان کی حیثیت آرائش کے سوا کچھ نہیں تھی، ارباں سے گفتگو کے بعد میری بے تاب نظریں دیواروں کے پار نہیں جاسکیں۔ اس رات میں نے شوطار سے اپنی کشمکش کا ذکر دبے لفظوں میں کردیا۔ وہ مسکرانے لگی اور اس نے اپنی آغوش کا حوالہ دے کے مجھ سے کہا۔ "کیا تمھارے لیے یہ اعزاز باعثِ سکون نہیں ہے کہ تمھیں میری رفاقت نصیب ہے؟" میں نے اس کی آغوش میں کسی مہ وش کی طرح مچل کے کہا۔ "اس اعزاز کے ساتھ میں مقدس شوطار کے لیے عبادت و ریاضت کے مشاغلِ روحانی بھی جاری رکھنا چاہتا ہوں۔"

"اسمار میں وصل بھی ایک متبرک عمل ہے۔" شوطار نے طنطنے سے کہا۔

"مجھے اس کے سوا بھی کوئی بھی خدمت سونپو، اے مقدّس شوطار!" میں نے اس کی زلفیں چومتے ہوئے کہا۔

"تم اور کیا چاہتے ہو؟" اس نے برہمی سے پوچھا۔

"میں تمھیں اور قریب اور قریب کرنا چاہتا ہوں۔"

Waqar Azeem pakistanipoint.com

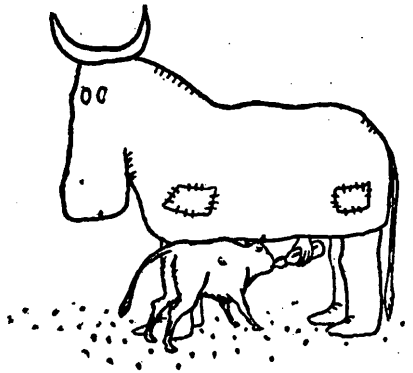

"میں نے تمھارے لیے ہر دروازہ کھول دیا ہے۔"

"لیکن ابھی کچھ دروازے بند ہیں۔"

"جابر بن یوسف!" اس نے تلخ نوائی سے کہا۔ "اے معصوم شخص، قصرِ شوطار میں تمھیں جو عزت دی گئی ہے، اس پر قناعت کرو۔"

میں شوطار کی رہبی کا خطرہ کسی طور مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے سعادت مندانہ سرکشی سے کہا۔ "مجھ سے اور نزدیک رہا کرو۔ تم جب چلی جاتی ہو تو قصرِ شوطار کے کسی گوشے میں میرا دل نہیں لگتا۔ تم میرے ساتھ ہی رہا کرو۔ میں تمھارا ہی جلوہ کرتا رہتا ہوں۔"

"اوہ جابر بن یوسف!" وہ اشتیاق سے بولی۔ "میں جب تمھارے سامنے نہیں ہوتی تو مجھے اور بہت سے امور دیکھنے ہوتے ہیں، اسار کی سلطنت کا بار میرے شانوں پر ہے، تم تو یہ منزلیں سر کر چکے ہو۔"

"میں جانتا ہوں، تم مجھے بھی ان میں شریک کیا کرو۔ دیکھو کہ میں اس ضمن میں تمھارے لیے کیسا عمدہ رفیق ثابت ہوتا ہوں۔"

"جابر بن یوسف! اسار کی نازنینوں کو دیوتاؤں نے غیر معمولی دماغی اور جسمانی قوتیں عطا کی ہیں، تم ایک مرد کہاں امورِ سلطنت میں مشورے دے سکتے ہو۔" وہ سادگی سے بولی۔

"خوب!" میرے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "خوب، مگر تم یہ بھول رہی ہو کہ میں اسار کا مرد نہیں ہوں۔ میری خصوصیات یہاں کے مردوں سے مختلف ہیں۔ مجھے حکم دو کہ میں اپنی صلاحیتوں کی نمائش کر سکوں۔ تاریکِ اعظم میں میرے سپرد کوئی کام نہیں؟ بتاؤ کون سا جزیرہ فتح کرنا ہے؟ کہاں تک تمھاری حکمرانی وسیع کرنی ہے؟ تمھارے سامنے کون شخص بیٹھا ہے؟ جابر بن یوسف الباقر۔" میں نے جوش میں کہا۔ "جابر بن یوسف الباقر۔"

میرے جوش اور ولولے سے اس کی نگاہوں میں چنگاریاں سی لپکیں

آج تک کسی مرد نے اس سے اتنی بے باکی سے گفتگو نہیں کی ہوگی۔ میری جرأت کارِ عمل ہوا۔ اس نے مجھے شدت سے بھینچ لیا اور پوچھنے لگی "تم انگروما کے باغیوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

یہ سوال قطعی غیر متوقع تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے گنگ رہ گیا پھر میرے ذہن میں خیالوں کا ایک ریلا آیا اور میں نے انگروما کے حسن اور شادابی کے متعلق ایک پُر اثر بیان اس کے گوش گزار کیا لیکن اس نے میرے اس بیان میں کوئی دل چسپی نہیں لی۔ اس نے بہت آہستگی سے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ "سنا ہے وہاں وہ تمام کاہن اور بزرگ عالم جمع ہو چکے ہیں جو مقدس آقابلا کی سلطنت کی نفی کرنا چاہتے ہیں۔ تم وہاں سے کیسے واپس آگئے؟"

میرے خلاق ذہن نے سونگھ لیا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے اور

مجھے کیا جواب دینا چاہیے لیکن میں نے انگروما کے عالموں اور دانش مندوں کی عظمت کا تذکرہ بہت محتاط انداز میں کیا۔ اس کی دل چسپی اور اشتیاق دیکھ کے میں نے آقابلا کے خلاف انگروما میں نفرت اور غضب کی شدت کا ماجرا بتدریج تاثر کے ساتھ سنایا، پھر میں نے گوسمے اور گردوما کا ذکر کیا اور غاروں میں چھپے ہوتے ان کاہنوں اور برگزیدہ لوگوں کے بارے میں بتایا جو یہ امید رکھتے ہیں کہ کسی دن تاریک برِ اعظم میں ملکہ آقابلا سے عنانِ اقتدار چھین لیں گے کیونکہ بے رحمی اس کی سرشت میں ہے۔"

"تمھارا کیا خیال ہے؟ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے؟" شوطار نے غیر جانبداری کا اظہار کرتے ہوتے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ان کا جوش اور ولولہ، ان کی عبادت اور استغراق، ان کا نظم اور اشتراک دیکھ کے میں خود خوف زدہ ہو گیا تھا۔ انھیں اپنے عزم پر یقین ہے۔ میں نے وہاں آقابلا کے خلاف ایسی ایسی باتیں سنی ہیں کہ میں یہاں دہرانے کی جرأت نہیں رکھتا۔" میں نے رازدارانہ کہا۔

"تم وہاں سے آ کیسے گئے؟" اس نے بظاہر بے دلی سے پوچھا۔

"آہ یہ نہ پوچھو کہ میں کیسے آ گیا۔ وہ ایسے تمام انسانوں کو پتھر میں تبدیل کر دیتے ہیں جنھوں نے مشروبِ حیات نہیں پیا ہے۔ وہ مجھے بھی پتھر میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ گوسمے نے میری تربیت کی۔ مجھے سربیکا کا مغز کھلایا۔ وہ لوگ میری بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں بھی آقابلا کے خلاف جنگ میں ان کا ایک مؤثر ہتھیار ثابت ہوں گا۔ انھوں نے ایک تہہ خانے میں روحیں اکٹھا کی ہیں۔ انھوں نے بڑی تیاریاں کی ہیں۔ میرا وہاں سے نکلنا مشکل تھا لیکن میرے روحانی کشف کا انھیں بھرپور علم نہیں تھا۔" یہاں میں نے دانستہ اپنی برتری کا ذکر کرنا مناسب سمجھا۔ میں نے اپنی طاقتوں کے بارے میں مبالغے

سے کام لیا اور اس سے کہا۔ "مجھے ایک موقع مل گیا اور میں ان کے علاقوں سے لڑتا بھڑتا سمندر میں کود گیا۔ چلتے وقت میں ہربیکالی مقدس آنکھیں بھی ساتھ لے آیا جو سمندر کے مدوجزر پر نظر رکھتی ہیں۔"

وہ تعجب سے میری باتیں سنتی رہی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میرے رفیق سرنگاکی دیوی میری طاقت بن گئی تھی۔ اس نے کئی موقعوں پر نمودار ہو کے میری مدد کی تھی۔ میں اسے بھی اپنی طاقت کا ایک حصہ سمجھتا تھا۔ یہی چند اعتبارات ہم مہذب لوگوں کو اس تاریک سرزمین پر زندہ رکھے ہوئے تھے۔ "اور جب میں وہاں سے واپس آیا تو کچھ عرصے بعد میں نے انگرمسا کے فاضلوں کا ایک گروہ سمندر میں جنگ آزما دیکھا۔ میں نے قالبوتوں کے سامنے شور مچایا کہ وہ مقدس آقابلا کو اس یلغار کی خبر کر دیں۔ وہ اس وقت تین ماہ کے لیے عبادت میں مصروف ہو گئی تھی۔ انگرمسا کے باغی پھر فرار ہو گئے۔ لیکن وہ کسی وقت بھی آ سکتے ہیں۔ وہ تو آگ ہیں، وہ طوفان ہیں، وہ کڑکتی ہوئی بجلیاں ہیں۔"

میری باتیں سن کے شوطار کسی خیال میں کھو گئی۔

"پھر اس کے بعد مجھے کیا ملا ہے؟" میں نے ناراضی سے کہا۔ "آہ مقدس شوطار! میں اس کی شکایت بھی تو نہیں کر سکتا۔ مجھے غالباً اس کی شکایتیں تم سے نہیں کرنی چاہئیں، وہ ہماری ملکہ ہے اور ہم سب سے افضل ہے۔"

"وہ دوسرے جزیروں کے حاکموں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟" شوطار نے میری بات پر توجہ نہیں دی اور انگرمساہی کے ذکر میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"وہ صرف مقدس آقابلا سے نفرت کرتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر مقدس شوطار! تم کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ تلخی سے بولی۔ "کچھ نہیں۔"

"تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "تمہاری نرمی نے میرے سینے کو جو راحت پہنچائی ہے وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا ورنہ میں بہت دل شکستہ ہو گیا تھا۔ اور سنو۔ سنو کہ جب میں نے مقدس آقابلا کا جلوہ دیکھا تھا تو میری راتیں، میرے دن اس کی یاد میں وقف ہو کے رہ گئے تھے پھر بھی اس نے کبھی اپنے اس غلام کو اتنا قریب نہیں کیا جتنا تم نے کیا ہے اور تم خود ایک انجمن ہو، تم نے میری کسک، میری اشتہا، میری جلن محسوس کی۔" وہ مجھے بغور دیکھنے لگی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، اس کے لب وا ہوتے تھے، بند ہو جاتے تھے۔ یہ کیفیت محسوس کر کے میں نے خاموشی پر قناعت کی اور والہانہ انداز میں اس کے مرمریں ہاتھوں کو بوسہ دیا اور رخصت کرتے ہوئے بولا۔ "اے عظیم شوطار! میرے لوصاف

کی قدر کر اور مجھے اسسار کے عام ہونقوں کی طرح مت برت۔ میرے اندر جھانک۔ مجھے اپنے آپ میں شامل سمجھ۔"

"تم میرے اندر شامل ہو۔" اور اس نے حسبِ دستور مجھے اپنے آپ میں کمال جذب کے ساتھ شامل کر لیا۔ میری گفتار خود اپنے انجام تک پہنچ گئی۔ اس نے میرے لبوں پر اپنے لبوں کا قفل لگا دیا۔ جب میری آنکھیں اس سرمستی سے جاگیں تو وہ موجود نہیں تھی۔

اس رات شوطار کے شبستان میں رقص کی محفل نہیں سجی۔ یہ ایک خلافِ معمول بات تھی۔ میں نے اربان سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کبھی کبھی شوطار قصر سے باہر چلی جاتی ہے مگر وہ یہ عمل کسی شدید کیفیت سے مغلوب ہو کے ہی کرتی ہے۔ یقیناً وہ دیوتاؤں سے ہم کلام ہو گی۔ یوں وہ ہر ماہ ایک رات کے لیے قصر سے باہر رہتی ہے۔ اس خبر نے مجھے فرحت پہنچائی آج شوطار قصر میں نہیں ہے۔ کتنے تعجب کی بات تھی کہ آج ہی میں نے انگرمسا کے فاضلوں کے متعلق تفصیلات بتائی تھیں۔ آج ہی وہ چلی گئی۔ وہ اچانک کہاں چلی گئی ہے؟ میں نے اس سوال پر سوچنے کے بجائے اس غنیمت لمحے کا ہر ممکن استعمال کرنے کی ٹھان لی۔ میں کتنے دنوں سے اس لمحے کا منتظر تھا جب وہ یہاں موجود نہ ہو اور طلسمی عکس نما کا ایوان اس کی بصارت سے باہر ہو۔ خوش قسمتی سے میرے ساتھ اسسار کی عورتوں کا غول بھی نہ تھا۔ معلوم ہوا، جب شوطار عبادت میں مصروف ہوتی ہے تو محفلِ رنگ و نور کی بساط بھی الٹ جاتی ہے۔ تمام لوگ احتراماً سکوت اختیار کر لیتے ہیں۔ میں اسی سکوت کو ترس گیا تھا۔ قصرِ شوطار پر ہر طرف گہری خاموشی مسلط تھی۔ میں نے یہاں کی سراغ رسی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ شوطار سے آزادانہ گفتگو اور یہاں قیام کے سوا مجھے کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اربان میرے ہم رکاب تھی۔ میں چاہتا تو آج اس نازک بدن کی رفاقت کی استراحت میں شب بسر کرتا لیکن میں نے اسے ایوان سے باہر نکالنے کے لیے ایک مہذب طریقہ اختیار کیا۔ میں نے دانستہ زارشی کے صحرا کی ابدی آگ روشن کی۔ میرا چوبی اژدہا مستانہ وار اس کے گرد رقص کرنے لگا اور میں زارشی کا مخصوص وظیفہ پڑھنے لگا۔ اربان میرا انہماک دیکھ کے فوراً چلی گئی۔ میں کسی طور یہ موقع ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھرتی سے اٹھا، احتیاط کے ساتھ ایوان سے باہر نکلا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ ایک مشکل اور خطرناک اقدام ہے تاہم اب تابِ انتظار نہیں تھی۔ راستے میں ان گنت حسینائیں میرے آڑے آئیں لیکن میں ان میں روحانی مسرتیں تقسیم کرتا ہوا آگے ہی بڑھتا رہا۔ اور ہر قدم پر ان کی محبت

آمیز نگاہوں سے فخاع کرتا ہوا نرماز کے ایوان تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے ساتھ اس کی ٹولی کی عورتیں تھیں۔ میں نے چپکے سے اس کا بازو پکڑ لیا اور اشاروں اشاروں میں تخلیے میں ملنے کی درخواست کی۔ وہ میری جسارت پر گھبرا کے علیحدہ کھڑی ہوگئی۔ پھر میں نے اس اژدہام میں بہت مشکل سے دوبارہ اس کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی جدوجہد کی۔ میں رفتہ رفتہ اس کے بہت نزدیک پہنچ گیا اور نہایت آہستگی سے کہا۔ "نرماز! شوطار محل میں نہیں ہے۔ وہ عبادت کے لیے اپنے حجرۂ خاص میں قصر سے باہر گئی ہوئی ہے۔ مجھے تم سے چند اہم باتیں کرنا ہیں۔ آؤ یہ موقع پھر نہیں آئے گا۔"

"مجھے چھوڑ دو۔ دُور ہٹ جاؤ۔" نرماز نے بے بسی سے کہا۔

اس کی ہلکی سی کراہ پر کسی نے سمجھا کہ میں نے اس کے بدن میں چٹکی لی ہے۔ میں اپنی ندامت مٹانے کے لیے ہنسنے لگا اور وہ زعفران زار مجمع چھوڑ کے مجھے مجبوراً وہاں سے فوراً آنا پڑا۔ ایک امکان نرماز سے رہبری حاصل ہونے کا تھا، وہ بھی ضائع ہو گیا۔ مجھے یہاں بہت سی چیزوں کی تلاش تھی اور ان کا پتہ چلانا میرے لیے دنیا کا دشوار گزار کام بن گیا تھا۔ پھر میں نے پرانی تنہا دیواریں سونگھنا شروع کر دیں۔ مجھے کہیں کوئی راستہ نہ ملا۔ میرا چوبی اژدہا ایک مستعد غلام کی طرح ہر دیوار کو ڈس کے خاموش بیٹھ جاتا تھا۔ اب میرے حواس پر وحشت نے مکمل تسلط جما لیا تھا۔ رات جیسے جیسے گزر رہی تھی، میرے کرب کا مرض بڑھتا جا رہا تھا۔ میں کیا کروں؟ آہ وہ علس نما، سب اس سے خوف زدہ ہیں۔ کاش مجھے اس ایوان کا پتہ چل جاتے جہاں وہ نصب ہے تو میں اسے اٹھا کر چکنا چور کر دوں۔ شوطار کی خاموشی اس کی ذہانت پر دلالت کرتی ہے۔ یقیناً وہ اپنی شہرت اور مرتبت سے زیادہ ذہین ثابت ہو رہی تھی۔ وہ اپنی برتر حیثیت سے پورا فائدہ اٹھا رہی تھی۔ یہ زرّیں قصر ایک زنداں ہے۔ اس طلسمی کارخانے میں میرے تمام ارادے صرف شوطار کی بے پروائی اور اعتبار ہی سے تکمیل پا سکتے ہیں مگر وہ مجھ سے کیوں بے پروا ہو جائے گی اور کیوں مجھ پر کلّی اعتماد کا اظہار کرے گی؟ کاش میں یہاں اپنے باطنی علوم سے مدد لے سکتا، کوئی ایسا عمل کرتا جو دریچے روشن کر دیتا۔ میں ثیابالی سے ان نازنینوں کے چہرے داغ دار کر دیتا، میں شراب کے مٹکوں میں زہر ملا دیتا مگر میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس گھٹن، حبس اور تکدّر میں مجھے ایک لامحدود وقت تک انتظار کرنا تھا۔ اگر میں نے عجلت اور جلد بازی میں کوئی ناکام قدم اٹھا لیا ہوتا تو امسار سے میری واپسی ناممکن

مُولوی صاحب

ایک شریر اور ذہین بچے کو پڑھا رہے تھے۔ انھوں نے لڑکے کو سمجھاتے ہوئے کہا "خدا کے سامنے توبہ کرنا بہت ضروری ہے!" اس کے بعد وہ توبہ کے طریقے بتاتے رہے اور یہ بھی بتایا کہ توبہ کب اور کیوں کرنی چاہیے۔

آخر مولوی صاحب نے اپنے شاگرد کا امتحان لینے کی خاطر سوال کیا۔ "اچھا بیٹے! تم یہ بتاؤ کہ توبہ کرنے کا کیا طریقہ ہے اور پہلے کیا کرنا ہوگا؟"

لڑکے نے برجستہ جواب دیا "پہلے گناہ بعد میں توبہ۔"

ہو جاتی۔ مجھے بہت احتیاط سے پھونک پھونک کر ہاتھ پاؤں اٹھانے تھے۔ صبح تک میں نے اپنی دانست میں قصر کی ہر دیوار ٹھونک لی اور تھک کر اپنے ایوان میں پڑ گیا۔ مجھے گلے میں اپنا ہر عطیہ ہر اعزاز چبھنے لگا۔ یہاں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ میں ان عظیم دیواروں اور ایوانوں میں بہت اوچھا آدمی تھا۔

*

علی الصباح قصر کی چہل پہل بحال ہو گئی، گویا شوطار کی آمد کا غلغلہ ہوا اور میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے کا وقت آیا۔ مجھے خدشہ تھا کہیں وہ میری رات کی مصروفیت کے بارے میں مشکوک نہ ہو گئی ہو لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جب میرے جسم پر روغن مل کر مجھے شوطار کی خدمت میں پیش کیا گیا تو میں نے اس کی آنکھوں میں ایک خوابیدگی سی دیکھی۔ وہ کچھ کھوئی ہوئی سی تھی، گم سی ہو جاتی تھی۔ میرے آنے پر اس کے اشارے سے تمام کنیزیں ہٹ گئیں۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ میں امسار کی ملکہ سے اس کی رات کی غیر حاضری کا سبب پوچھ سکتا تھا۔ میرے ذہن میں کوئی چور چھپا بیٹھا تھا۔ اس نے میرے بال اپنے ہاتھوں میں زور سے جکڑ لیے۔ میں نے اس کی پذیرائی کا یہ جوش دیکھ کے ناز کے انداز میں پوچھا۔ "کل رات قصر پر موت کا سکوت طاری تھا۔ میں تمھیں تلاش کرتا رہا۔ تم کہیں نہیں ملیں۔ رات بڑی گراں گزری۔"

"ہاں میں یہاں نہیں تھی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں؟" میرے منھ سے نکل گیا۔

وہ مجھے تکنے لگی۔ مجھے پہلی بار اس کی پیشانی پر فکر کی لکیریں نظر آئیں۔ اس نے اچانک حکم دیا۔

"تم امسار سے کب واپس جانا چاہتے ہو؟"

"کب؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا میں واقعی چلا جاؤں؟"

”کیا تم جانا چاہتے ہو؟“ اس نے میرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے تین قبیلے تمہاری حکمرانی کے منتظر ہوں گے اور مقدس آقا بلا بھی تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔“

”میرا انتظار؟“ میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ ”کاش وہ میرا انتظار کر سکتی اور جہاں تک قبیلوں کی حکمرانی کا معاملہ ہے، مجھے حکمرانی سے کوئی علاقہ نہیں، کیا مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے؟ میں تو کچھ اور سوچ رہا تھا۔“

”تم کیا سوچ رہے تھے؟“ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ یہیں تمہاری آغوش میں، جب تک میرے اعصاب میں توانائی ہے اور میرے دماغ میں ہیجان ہے، میں تمہاری آغوش میں وقت بسر کروں گا لیکن شاید میں تمہیں اپنی صلاحیتوں سے متاثر نہیں کر سکا۔ شاید میرے نوشتۂ تقدیر میں ابھی اور گردشیں لکھی ہیں۔“

وہ چپ ہو گئی۔ اس کی خاموشی مجھے ہلکان کیے دے رہی تھی۔

”میں سوچتا ہوں کہ انگرو ماہی بن رہتا تو اچھا تھا۔“ میں نے کنکھیوں سے اس کی جانب دیکھ کے کہا۔

”کیوں؟“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”اس لیے کہ تاریک برِاعظم میں شاہیت، جبر اور حبس سے تو نجات ملتی، وہ ایک عمدہ اشتراک ہے، وہاں سب برابر ہیں، بزرگوں کا رویہ چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا ہے۔ وہاں کے ناظم عارضی ناظم ہیں۔ سارا جزیرہ یکساں خیال اور یکساں مقاصد کے لوگوں کا ہے، وہ مشترکہ عبادت کرتے ہیں اور علوم منتقل کرنے میں بخل نہیں کرتے۔“

”کیا وہاں یہ سب کچھ ہے؟“ شوطار نے دلچسپی سے پوچھا۔

”وہاں کیا نہیں ہے؟“ میں نے جواب دیا۔

”اس کے بعد تمہارا ان سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہوا؟“

”میں نے اس کی کوشش نہیں کی لیکن اگر میں ان سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تو شاید کر سکتا تھا۔“

”وہ کیسے؟“

”میں کسی جزیرے کے سفر کے دوران میں سمندر میں پہنچ کے ان کی طرف جانے کا ارادہ کرتا تو میرے لیے مشکل نہ ہوتی، ان خاصلوں کے پاس میری واپسی کی خبر پہنچ جاتی۔“

”ہونہہ۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتے ہو، میں اگر قصر میں موجود نہ ہوں تو تم قصرِ اسمار کی کسی بھی عورت سے رابطہ قائم کر سکتے ہو۔ تم خود ہی اپنے آپ کو اس قصر میں رہنے کا اہل ثابت کرو۔“

”میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے یہ آزادی بخش دی۔ قصرِ اسمار میں تم سے زیادہ دلکش کوئی اور نہیں ہے۔ میں کھلے آسمان میں اور ننگی زمین پر رہنے کا عادی ہوں، شاید میری توانائیاں تمہارے کسی کام آ سکیں، شاید میں تمہارے لیے کوئی موثر طاقت ثابت ہو سکوں۔“ میں نے مسرت اور عزم سے کہا۔ ”آؤ میرے پہلو میں دراز ہو جاؤ اور مجھے موقع دو کہ میں تمہارے اس چمن زار کی خوشہ چینی کروں۔ مجھے تو ری کا کوئی سراغ مجھ۔“ اس نے خود کو میرے سپرد کر دیا اور اس دن مجھے محسوس ہوا جیسے میں ایک زندہ شخص ہوں اور میرے جسم میں حرارتیں موجود ہیں اور میری رگوں میں خون تیزی سے گردش کرتا ہے اور میں ایک مرد ہوں، اسمار کا مرد نہیں اور شوطار ایک عورت ہے، اسمار کی عورت نہیں۔ یہ چند نکتے ہی روشنیٔ طبع کے لیے بڑے اہم تھے۔ مجھے محسوس ہوا، اس اندھیرے میں میرے عزائم کے لیے ایک سمت متعین ہو گئی ہے۔ شوطار کی یہ نوازش میری مشقت آزما برداشت کا ثمر تھی، وہ گرانی جو دل و دماغ پر طاری تھی، کسی قدر کم ہونے لگی۔ جسم کی رسیاں ڈھیلی ہو گئی تھیں۔ قصر میں فوراً کوئی ہنگامہ برپا کرنا خلافِ عقل تھا۔ میں نے اس آزادیٔ خفی، لطفِ جلی اور نکتہ آفریں صورتِ حال پر اپنی سرگرمیوں میں کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں کی۔ یہ بطحیت شوطار کی نظروں میں میرا درجہ گرا دیتی۔ میں اربان اور دوسری کنیزوں کے گلزار بدن پر کسی وحشی کی طرح ٹوٹ نہیں پڑا۔ ان سب سے میرے رسمی روابط جاری رہے۔ ابھی نقوش اور پختہ کرنے تھے۔ ابھی ایک کڑی آزمائش درپیش تھی۔ دو تین دن بعد نہایت نامحسوس طریقے پر میں نے شوطار کی عطا کردہ رعایت سے لطف لینے کا آغاز کیا۔ اپنی گزشتہ وارداتوں کے مطابق میں قصر میں کودتا، پھاندتا، اچھلتا، نازنینانِ اسمار کے درمیان شگوفے چھوڑتا پھرا۔ میں نے تکلف اور جھجک کا پردہ رفتہ رفتہ چاک کرنا شروع کیا۔ ساتھ ہی میں زرناز بھی سرِراہ مل گئی۔ میں نے اس مرتبہ زرناز سے کچھ نہیں پوچھا۔ میں اجنبیوں کی طرح اس سے ملا اور اس کے دہکتے رخساروں پر مہرِ محبت ثبت کرتا ہوا کسی دوسری سمت چل پڑا۔ میری یہ محتاط روی شوطار کا آہنیں قلب پگھلانے لگی۔ مجھ پر اس کی عنایتوں کی بارش اب زور و شور سے ہونے لگی۔

ایک رات سکوت نے قصرِ شوطار پھر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں محل کے نشیبی علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ زرناز میری طرف بھاگی چلی آ رہی ہے۔ وہ میرے قریب آ کے رک گئی۔ میں نے اس کی متوحش آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور جلد ہی ان عورتوں سے چھٹکارا

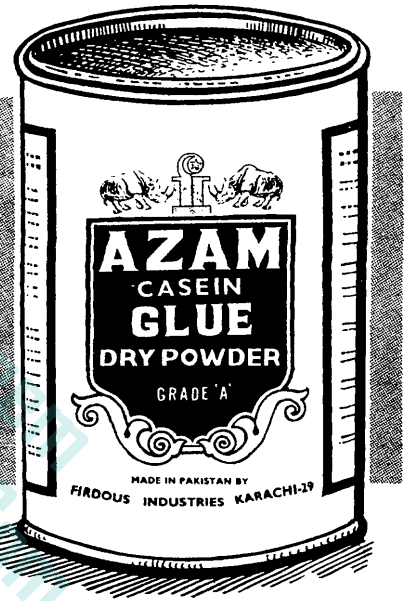

فرنیچر انڈسٹری میں مقبول اور اعلیٰ کوالٹی کا حامل
اعظم گلیو
AZAM
CASEIN
GLUE
DRY POWDER
GRADE 'A'
MADE IN PAKISTAN BY
FIRDOUS INDUSTRIES KARACHI-29
زیادہ جگہ گھیرتا ہے فارمیکا اور لکڑی کے جوڑنے میں لاجواب ہے
پینٹ و ہارڈ ویئر کی ہر دوکان سے دستیاب ہے
فردوس انڈسٹریز۔ کراچی، ۲۹

حاصل کیا جن کی نگاہیں میرے سراپا کا طواف کر رہی تھیں۔ میں نے مبہم سا اشارہ کیا۔ زرماز میرے عقب میں چلنے لگی اور میں باغ کے ایک ویران گوشے میں چلا آیا۔ قصرِ شوطار کی خاموشی باغ تک پھیلی ہوئی تھی۔ عام دنوں میں یہاں ایک جشن سا منعقد ہوتا تھا۔ میں نے اپنا چوبی اژدہا متحرک کر دیا۔ زرماز بھی وہیں آگئی اور آتے ہی بے تابانہ میرے سینے سے چمٹ گئی۔ "سیدی جابر! مجھے معاف کر دو، میں نے تمھیں دکھ پہنچایا ہے۔ تم میری مجبوریاں سمجھتے ہو گے۔

"ٹھیرو۔" میں نے اسے اشارہ کیا۔ "ابھی خاموش رہو۔" یہ کہہ کے میں نے اژدہا زمین پر چھوڑ دیا اور احتیاطاً شپالی کی ڈوری کا سرا پکڑ کر چرخی کی طرح گھماتا رہا۔ "ہاں جانِ عزیز! اب بات کرو۔"

"سیدی جابر!" زرماز نے سسکتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے ملنے کے لیے مضطرب تھی لیکن کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ شوطار حسبِ معمول ایک رات کے لیے قصر سے باہر جائے گی۔ میں اس رات کی منتظر تھی۔"

"زرماز! دیوتاؤں کے لیے یہ گفتگو چھوڑ دو۔ یہ وقت بڑا قیمتی ہے۔ ہم بہت مشکوک حالت میں یہاں مل رہے ہیں۔ وہ پُراسرار طاقتیں ہماری باتیں سن رہی ہوں گی جو شوطار کے ساتھ ہیں حالانکہ میں نے اپنی شپالی اور اژدہے کی مدد سے کوشش کی ہے کہ ہماری گفتگو ہم ہی تک محدود رہے۔ میں تم سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"سیدی جابر! تم یہاں کس مقصد سے آئے ہو؟"

"مجھے مقدس اقابلا نے حکم دیا تھا۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ "از راہِ کرم زرماز! خود کوئی سوال مت کرو۔ یہ بتاؤ کہ تم اس قصر کے بارے میں کس قدر معلومات رکھتی ہو؟"

"میں بہت سی باتیں جانتی ہوں۔"

مسرت سے میری چیخ نکل گئی۔ "اوہ گویا تم طلسمی عکس نما کے ایوان اور دیوتاؤں کے مخصوص کمرے کے بارے میں جانتی ہو؟"

"ہاں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیا تم وہاں تک میری رہنمائی کر سکتی ہو؟"

"مقدس اقابلا کے نام پر۔ میں یہ کام ضرور کر سکتی ہوں۔ تم بھی اس کے غلام ہو، یہ بات میں جانتی ہوں۔"

"تو آؤ۔ دیر مت کرو۔ میرے ساتھ چلو۔" میرے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ میں نے شپالی گلے میں ڈال لی اور چوبی اژدہا بھی گلے میں لٹکا لیا۔ ہم دونوں نے بات چیت بند کر دی اور ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر چلنے لگے، باغ سے نکل کر ہم عمارتوں کے سلسلے میں داخل ہوئے۔ زرماز مجھ سے فاصلے پر ہو گئی۔ میں اسے نظروں میں رکھے ہوئے دُور دُور چلنے لگا۔ راستے میں عورتوں نے اُسے بھی دیکھا ہو گا اور مجھے بھی لیکن وہ اس سے میرے لحاق کا اندازہ لگانے سے قاصر رہی ہوں گی۔ میں اتنی مقبول شخصیت بن چکا تھا کہ مجھے جگہ جگہ رکنا اور زرماز کو ٹھیر کر میرا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جو میں نے ابھی تک نہیں دیکھی تھی۔

اور میں قصرِ شوطار کی ان بھول بھلیوں میں یہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس حصے میں میرے اور زرماز کے سوا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ مجھے ایک تاریک گلی سے گزار کے ایسی جگہ لے گئی جہاں ہر طرف سیاہی کی چادر تنی ہوئی تھی۔ سامنے اندھیرے کا ایک سیل رواں تھا۔ میں نے شپالی روشن کر دی۔ میرے سامنے سیاہ دیواروں کے ایوانوں کا ایک وسیع سلسلہ اُجاگر ہو گیا۔ ان در و بام سے ہیبت ٹپکتی تھی۔ زرماز کی حفاظت کے خیال سے میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے پہلو سے لگا لیا۔ اپنے طلسمی نوادر کی موجودگی میں خصوصاً امسار کی عبادت گاہ کے ہار کے سبب مجھے یہ اعتماد تھا کہ کوئی بیرونی طاقت مجھے نقصان پہنچانے سے گریز کرے گی۔ چوبی اژدہا میرے کاندھے پر لٹک رہا تھا۔

مجھے اعتراف ہے کہ اُس وقت میرے دل کی دھڑکنیں میرے قابو میں نہیں تھیں۔ زرماز بھی مبہوت ساتھ چل رہی تھی۔ امسار کی عظیم المرتبت ملکہ شوطار کی پُراسرار خلوت گاہوں میں اجازت کے بغیر داخل ہونے کا جرم اتنا سنگین تھا کہ اُس کی سزا کا تصور بھی محال تھا۔ میرے لبوں پر زارشی کے صحرا کا عمل تھا۔ خود زرماز بھی اقابلا کی ایک ممتاز کنیز ہونے کے شرف سے مفتخر تھی اس لیے وہ طلسمی علوم سے خوب آگاہی رکھتی تھی تاہم وہ تنہا ان ایوانوں میں داخل ہونے کی طاقت سے محروم تھی۔ اس وقت میرا ذہن کئی فکروں میں منقسم تھا۔ اندیشے، آیندہ کے عزائم، اقابلا کی رفاقت اور خوف، ہاں خوف بھی۔ میں نے سرتا، سرنگا، ڈاکٹر جواد اور مہذب دنیا کے قافلے کے شکست خوردہ چہرے دیکھے۔ ان میں شراڈ بھی نظر آیا۔ ان چہروں کی تازگی میری مہم کی کامیابی سے مشروط تھی ایسے نازک لمحے میں سرنگا کی پُراسرار دیوی شدت سے یاد آنے لگی۔ کاش وہ اس وقت امسار میں میری مدد کے لیے نمودار ہو جاتی۔ اس کے خیال سے مجھے سہارا ملا۔ میرا دوست سرنگا اور اس کی دیوی مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہو گی اور خود اقابلا ہے۔ مجھے اپنی ٹانگوں میں توانائی کی ایک لہر محسوس ہوئی اور میں نے جوش میں زرماز کے گرد حلقہ تنگ کر دیا۔ شپالی کی روشنی ہماری راہنمائی کر رہی تھی۔ زرماز ایک جگہ ٹھٹک کے رک گئی اور اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ

دُور ایک ایوان کی طرف اٹھایا۔ "وہ" اس نے دھیرے سے کہا۔

"طلسمی عکس نما کا ایوان ہے؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"ہاں وہی جہاں ساحرِ اعظم جالموش کا عطیہ عکس نما نصب ہے یہ ایوان شوطار کے شبستان سے بھی مل جاتا ہے۔ ہمیں اسی طویل راستے ہی سے آنا تھا کیونکہ شوطار کے شبستان میں داخل ہونا ناممکن تھا۔ وہاں اس کی وفادار کنیزوں کا ہجوم ہوگا۔"

"مختصر بات کرو۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "اور دیوتاؤں کا مخصوص کمرہ کہاں ہے؟"

وہ اس کے برابر ہے۔" اس نے اشارے سے کہا۔ "یہی سب سے اہم ایوان ہے۔ یہاں ایک مقدس پتھر بھی موجود ہے جو ہیرے کی جسامت کا ہے۔ وہ اسرار میں شوطار کی حکمرانی کی سند اور دیوتاؤں کی خوشنودی کی علامت ہے۔ شوطار نے اسے دیوتاؤں کے مخصوص کمرے میں حفاظت کے خیال سے رکھا ہے۔ وہاں جانا مشکل ہے کیونکہ درندے اور دیوتا اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر تم نے وہ پتھر حاصل کر لیا تو تم شوطار کو ایک بڑی فضیلت سے محروم کر دوگے اور شیالی کی طرح تمہارے پاس ایک نادر عطیے کا اضافہ بھی ہو جائے گا لیکن تم وہاں کیسے جا سکتے ہو؟ وہاں تو۔۔۔"

زماز کہتے کہتے رک گئی۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

یہ مختصر سی روداد سن کے میں نے چند لمحے مکمل طور پر اپنے ذہن کے ساتھ بسر کیے۔ میرے ذہن نے اس مختصر وقفے میں کئی فیصلے کیے اور رد کیے۔ میں نے سوچا کہ اب یہ جگہ میں نے دیکھ لی ہے۔ ایک ماہ بعد جب شوطار حسبِ معمول عبادت کے لیے قصر سے باہر جائے گی تو میں دوبارہ اس طرف آؤں گا اور اس عرصے میں ساحرِ اعظم جالموش سے رابطہ قائم رکھنے کی کوشش کروں گا۔ ممکن ہے شوطار خود ہی میرے اس قدر قریب آ جائے کہ مجھے یہاں لانے میں اسے کوئی عذر نہ رہے؟ مگر یہ دراصل ایک خوف تھا جو فرار پر آمادہ کر رہا تھا۔ میں نے اپنی فکر کی نفی کی۔ آئندہ ایک ماہ میں نہ جانے کیا ہو جائے؟ حالات بدل جائیں؟ ممکن ہے کل صبح شوطار کو میری سرگرمی کی خبر ہو جائے؟ اس لیے اس مبارک موقع سے مجھے مکمل فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں نے مقدس اقابلا، سرنگا کی دیوی اور سرنگا، تینوں کا تصور کیا، پھر میں نے اپنی تسلی کے لیے فضاؤں میں ساحرِ اعظم جالموش سے مخاطب ہونے کی جرأت کی۔ میری آواز صرف مجھی کو سنائی دے رہی تھی۔ میں ٹھیرے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔ "اے محترم جالموش! اے ساحروں کے ساحر! مجھے معاف کر دے اور یقین کر کہ ہوسِ ملک گیری میری سرشت نہیں ہے۔ مجھے اقتدار و اختیار سے سروکار نہیں ہے۔ میں اپنی عظیم ملکہ مقدس اقابلا پر اپنی جان قربان کرنا چاہتا ہوں۔ پس میری طرف التفات کی نظر سے دیکھ اور میرے جذبے کی صداقت کا اپنی دُور بیں آنکھوں سے مشاہدہ کر۔ ہاں مجھے اپنے بہترین شاگردوں میں شمار کر کہ میں تیرے پاس آنے ہی والا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ تو مجھے مایوس نہیں کرے گا کیونکہ میرے عزائم میں کوئی سقم نہیں ہے۔"

یہ کہہ کے میں نے زماز کا ایک بوسہ لیا اور اسے وہیں کھڑا رہنے دیا۔ مجھ سے علیحدہ ہوتے ہی زماز نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ وہ گریہ وزاری کر رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس وقت وہ تمام طلسمی علوم میرے حافظے میں ابھر رہے تھے جو تاریک آسمانی اعظم میں اب تک میں نے حاصل کیے تھے۔ میں ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح مستعد تھا۔ زماز سے جدا ہو کے عکس نما کے ایوان کے دروازے تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے میں احتیاطاً کئی بار رکا اور آخر دروازے تک پہنچ ہی گیا۔ یہ پتھروں سے تراشا ہوا ایک طویل دروازہ تھا۔ میں نے اس پر کاندھا لگایا تو مجھے اپنی بساط کا اندازہ ہوا۔ کوئی زنجیر بھی لگی ہوئی نہیں تھی مگر یہ ایک دروازہ تھا جس کے دو حصے علیحدہ نظر آتے تھے۔ میں نے دوبارہ اپنی پشت لگائی۔ کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ مجھے پسینہ آنے لگا اور میں

نے ڈگبی کے سینگوں سے اس پر ضرب لگانی شروع کی۔ یہ آواز خوف ناک انداز سے ایوان میں بازگشت کرنے لگی۔ پھر میں نے جارا کاکا کی کھوپڑی ایک مخصوص انداز میں رکھ کے اور ایک عمل پڑھ کے دروازے پر زور لگایا۔ دروازے میں ذرا سا ارتعاش بھی نہیں ہوا۔ میں مختلف عمل پڑھتا رہا اور ہر عمل ناکام ہوتا رہا۔ میں نے شپالی کی مدد سے آگ لگانے کا ارادہ کیا لیکن پتھروں پر یہ آگ کیا اثر کرتی؟ میں نے آگ لگا ہی دی۔ گرد و نواح کی دیواریں تپنے لگیں اور میں دروازے سے اپنا سر پھوڑتا رہا، اس بھڑکتی آگ میں اب ایک ہی عمل رہ گیا تھا کہ میں باری باری اپنے تمام نوادر سے مدد لوں، میں نے یہی کیا اور آخر میں جھنجلا کے شپالی بھی آگ میں جھونک دی۔ اچانک آگ کا دائرہ بڑھا اور آگ ایک سمت بڑھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور شعلے اندر کا رخ کر رہے تھے۔ میں نے وہ آگ بجھا دی اور چوبی اژدہا زمین پر چھوڑ کر اندر داخل ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں جارا کاکا کی کھوپڑی تھی۔ چوبی اژدہا شپالی کے پھرتی سے میری ٹانگوں کے راستے اوپر آ گیا۔ اندر ایوان جگمگا رہا تھا۔ اور میرے سامنے آئینے کی شکل کا ایک قدِ آدم سفید پتھر رکھا ہوا تھا۔ یہ یقیناً متبرک عکس نما تھا۔ اسے دیکھ کے میری کیا حالت ہوئی ہو گی؟ میں سمجھا کہ اس پتھر میں میری زندگی محفوظ ہے مجھے کوئی اور خیال نہیں تھا۔ میں نے جارا کاکا کی کھوپڑی نظام کے پتھر میں کچھ دیکھنے کی خواہش کی۔ مگر خواہشیں گڑبڑا گئیں۔ شاید میں بدحواس ہو گیا تھا۔ میں نے جالموش کا شکریہ ادا کیا اور دل ہی دل میں اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے اس کے استعمال کی اجازت دے۔ پھر میں نے اشمار کو دیکھنا چاہا۔ سفید پتھر پر رنگ پھیل گئے۔ رنگوں کے یہ ہیولے خطوط کی شکل میں ظاہر ہوتے اور مجھے اشمار کا چہرہ نظر آیا۔ وہ اپنے دو سیاہ فام مردوں کے ساتھ جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ منظر بہت دلکش تھا۔ لیکن میں نے اسے پلٹ دیا اور الشیام، تلراشس کی بزم آرائیاں دیکھیں، میں نے اسار کی گلیاں دیکھیں، پھر میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ شوطار کو دیکھوں؟ مجھے اس میں بھی ناکامی نہیں ہوئی۔ شوطار ایک بت کی طرح برہنہ کھڑی تھی! اس کے آس پاس مورتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ شوطار کے چہرے پر شدید کرب تھا۔

میں نے یہ منظر بھی بند کر دیا، شوطار کا کرب ناک چہرہ دیکھ کے مجھ پر عجلت سوار ہو گئی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں یہ پتھر باہر نہیں لے جا سکتا جالموش کا یہ نادرہ کار عطیہ ضائع کر دینے کو بھی دل آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ پھر میں کیا کرتا؟ کیا میں یہاں اس مقدس پتھر کا صرف دیدار کرنے کے لیے آیا تھا؟ "آہ جالموش!" میں نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ مجھے اسے ضائع کرنا پڑے گا۔ مجھے اسے توڑ دینا چاہیے تاکہ شوطار اسار میں ہونے والی نقل و حرکت دیکھنے سے محروم ہو جائے۔" مجھے یہ افسوس ناک کام کرنا ہی پڑے گا۔" میں نے بڑبڑا کر کہا۔ اس کے سوا کیا چارہ ہے؟ میں نے شپالی سے اسے داغ دار کر دیا۔ اب اس میں دھبے پڑ گئے تھے۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ یہ دھبے ٹوٹ سکتے ہیں۔ مجھے اسے توڑ ہی دینا چاہیے۔ وہ کوئی وزنی پتھر نہیں تھا۔ میں نے اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیں اور پتھر کی اس بڑی سلیٹ پر ڈگبی کے سینگوں سے ضربیں لگانا شروع کیں۔ جلد ہی وہ کسی شیشے کی طرح چکنا چور ہو کے رہ گیا۔ میں نے ایک بار پھر جالموش سے معذرت چاہی اور پتھر کے چند ٹکڑے ہاتھ میں رکھے بھاگتا ہوا دروازے سے باہر آ گیا۔

اب میرا رخ دوسرے دروازے کی طرف تھا۔ میں جزئیات سے گریز کروں گا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ عکس نما کے ایوان کا دروازہ کس طرح کھلا تھا؟ وہی عمل اس دروازے پر کارگر ہوا لیکن جیسے ہی دیوتاؤں کے اس مخصوص کمرے کا دروازہ کھلا، ہیبت ناک آوازوں کے شور نے مجھے حواس باختہ کر دیا اور بہت سے درندے جیسے میری جانب لپکے۔ میں اس اچانک افتاد سے قطعی پریشان ہو گیا۔ خوف ناک درندوں اور انواع و اقسام کے جانوروں نے میری سمت زقند بھری۔ میں گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔ پھر میرے حواس اسی وقت بحال ہوئے جب میں نے انھیں ٹھٹک کے اپنے قریب ٹھہرتے ہوئے دیکھا۔ وہ مجھ پر حملہ کرنے سے کترا رہے تھے۔ میں نے شپالی اور جارا کاکا کی کھوپڑی مضبوطی سے پکڑ لی اور سراسیمہ ہو کے اس بلائے ناگہاں سے نمٹنے کے لیے سوچنے لگا، وہ غرا رہے تھے، پھنکار رہے تھے اور چیخ رہے تھے۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا تو ان کی آوازوں میں اور زیادہ ہیبت پیدا ہو گئی لیکن وہ مجھ سے دور ہی رہے۔ میں نے سوچا، اب ایک ہی چارہ ہے کہ انھیں صحر لتے زارشی کی ابدی آگ سے خوف زدہ کیا جائے۔ آگ جلی تو وہ سمٹ کر مجھ سے دور بھاگے اور دیوار کے ساتھ چپک گئے۔ آہ میرے عزیز نوادر! انھوں نے کتنی بار میرا ساتھ دیا۔ تاریک برِاعظم میں میری کامیابی انھی کی مرہونِ منت تھی۔ میں نے کمرے میں چاروں طرف بھاگتے ہوئے ایک ایک چیز کا جائزہ لیا۔ ہر طرف نوادر بکھرے ہوئے تھے۔ کسے اٹھاؤں؟ کسے ساتھ رکھوں؟ ہر چیز پاس رکھنے کو جی چاہتا تھا۔ ان نوادر میں ایک جگہ سیاہ پتھر کے بڑے پیالے میں ایک چمکتا ہوا پتھر بھی تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور جیسے ہی میں نے اسے اپنے ہاتھ میں اٹھایا، میرے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کی، جو کچھ میرے ہاتھ میں آیا، میں نے اٹھا لیا، اب مزید ہوس کی گنجائش نہیں تھی سرمستی میں، اور ایک ایسی مستانہ کیفیت میں جس کا اظہار میرے بس میں نہیں ہے، میں اپنی پوری رفتار سے ہانپتا ہوا، لرزتا ہوا

ان طلسمی ایوانوں سے دُور بھاگنے لگا۔ مجھے اپنی سدھ بدھ ہی کہاں تھی؟ نرماز ابھی تک آسمان سے فریاد بہ لب تھی۔ آسمان کو میری تیرہ بختیوں کا خیال آ ہی گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے روشنیاں سی لپکنے لگیں۔ میں نرماز کے سینے سے جا لگا اور نرماز نے اپنے دونوں بازوؤں سے مجھے حصار میں لے لیا۔ کسی آغوش نے مجھے اتنا آسودہ نہیں کیا ہوگا جتنا اس وقت نرماز کی باہوں نے کیا تھا۔ میں ہانپ رہا تھا۔ "سیدی جابر! جارا کا تمھارا مرتبہ بلند کرے۔ تم نے ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ تم یقیناً پرستش کے لائق ہو۔"

"میں جانتی ہوں سیدی! تمھی انھیں حاصل کر سکتے تھے۔" نرماز نے جوشِ مسرت میں کہا۔

"اب میں یہاں سے رخصت ہوتا ہوں۔"

"کہاں؟ تم اب کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"صبح تک شوطار آجائے گی۔ مجھے فوراً خود کو عبادت گاہ میں روپوش کر لینا چاہیے۔"

"یہ ایک مناسب خیال ہے۔" نرماز نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"مگر ٹھیرو۔ ذرا مجھے ان نوادر کا نظارہ کر لینے دو۔"

"یہ دیکھو۔ یہ دیکھو۔ یہی ہیں نا وہ؟"

"ہاں یہی ہیں۔ دیوتاؤں کی قسم یہی۔" اس نے انھیں بے اختیار چوم لیا۔ "وہ ان سے محروم ہو گئی ہے۔"

"نرماز! مجھے جلد از جلد اس قصر سے باہر نکلنے کا اہتمام کر دو۔ دروازے تک کسی خوف کے بغیر میری رہنمائی کرو۔"

"تمھارے ہاتھ میں یہ مقدّس پتھر موجود ہے۔ اب تمھیں کون روک سکتا ہے؟" نرماز نے کہا۔

"لیکن میں باہر جانے کے راستے نہیں جانتا۔"

"میں تمھیں پہنچاؤں گی۔ کاش میں تمھارے ساتھ چلتی۔"

"تو میرے ساتھ ہی چلو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"نہیں، مجھے ابھی ٹھیرنا ہوگا۔ شاید تمھیں میری ضرورت پڑ جائے۔"

"نرماز! یہ سب کچھ تمھاری وجہ سے ممکن ہوا ہے۔"

"نہیں، یہ تمھاری ذہانت اور شجاعت کا کرشمہ ہے۔"

ہم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جھومتے ہوئے وہاں سے واپس ہوئے اور قصرِ شوطار کے اس حصے میں آ گئے جہاں نازنینانِ اسار سکوت کا روزہ رکھے ہوئے تھیں۔ یہاں نرماز مجھ سے آگے ہو گئی تھی۔ ایک موڑ پر اس نے اشارہ کیا اور یاس انگیز نگاہوں سے واپس جانے لگی۔ قصر کا دروازہ جو ابھی تک میری نگاہوں سے اوجھل تھا، اب سامنے موجود تھا اور بے شمار عورتیں وہاں پہرا دے رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے روکا لیکن میں نے اپنی ہتھیلی میں رکھا ہوا مقدّس پتھر ان کے سامنے کر دیا۔ ان کی آنکھیں پھٹ گئیں اور ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ میرے راستے سے ہٹ گئیں۔ قصر کا بڑا دروازہ دھیرے دھیرے کھلا اور میں ایک شانِ بے اعتنائی سے باہر آ گیا۔

اب میں تھا اور اسار کی گلیاں تھیں، سارے اسنوں پر اسار کی رات جاگ رہی تھی، میرا چہرہ جانا پہچانا تھا مجھے دوبارہ دیکھ کے ان کے لبوں پر مسکراہٹیں تیرنے لگیں۔ مجھے اتنی فرصت کہاں تھی کہ میں ان خوش رنگ لبوں سے اپنی تشنگی مٹاتا؟ نہ اس وقت مجھے تشنگی محسوس ہو رہی تھی۔ میں ایک شرابی کی طرح، تمام فکروں سے بے نیاز، اپنی دھن میں مست عبادت گاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ عبادت گاہ کا راستہ بتانے میں کتنی حور شمائل عورتوں نے میری مدد کی تھی۔

★

عبادت گاہ میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنے اتالیق کاہنِ اعظم قرسام کے حجرے میں حاضری دی۔ وہ میری صورت دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ "تم آ گئے؟" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں۔ میں آ گیا۔" میں نے اپنی مٹھیاں کھول دیں۔ پتھر میرے ہاتھ سے گر کے زمین پر منتشر ہو گئے۔

"تم انھیں لے آئے؟" اس کی زبان لڑکھڑانے لگی اور اس نے انھیں فوراً زمین سے اٹھا لیا۔

"اور اب میں تمھاری پناہ میں آ گیا ہوں۔" میں نے عقیدت سے کہا۔

"میرے عظیم فرزند!" قرسام مجھ سے لپٹ گیا۔

قارئین کے برّاعظم میں جابر بن یوسف کے ساتھ حیران کن اور ناقابلِ توجیہ واقعات پیش آئے، اس پُراسرار آپ بیتی کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

جنھیں اُن غم زدوں کے لیے
دنیا کا عالمی شہرت کے ادیب
کوئی غم ہنری سلاتر کی
نہیں ایک شوخ، زہریلی کہانی

★ شہزاد جمیل

راجر ماہر نفسیات ڈاکٹر ملر کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ اس کی بیوی مارتھا کچھ عرصے سے ڈاکٹر ملر کے زیرِ علاج تھی۔ مارتھا نے چند روز قبل ڈاکٹر کی بتائی ہوئی مقدار سے زیادہ خواب آور گولیاں کھالی تھیں اور اس کی حالت نازک ہوگئی تھی۔ اب ڈاکٹر ملر نے ٹیلی فون کرکے راجر کو اپنے دفتر بلایا تھا تاکہ وہ اس سے مریضہ کے متعلق گفتگو کرسکے۔ اس نے راجر سے کہا۔ "مجھے احساس ہے کہ کسی شوہر کے لیے اپنی بیوی کے متعلق اس قسم کی بات سننا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن یقین کیجیے مسٹر راجر! آپ کی بیوی نے زیادہ گولیاں غلطی سے نہیں کھائی تھیں، یعنی وہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا، فرائڈ نے کہا ہے کہ حادثوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔"

"ڈاکٹر ملر!" راجر نے کہا۔ "میری بیوی نے قسم کھاکے بتایا ہے کہ اس نے خواب آور گولیاں زیادہ تعداد میں محض غلطی سے کھالی تھیں، اور اب آپ مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس نے یہ حرکت دانستہ کی تھی۔ آخر کیوں؟ اس کے پاس اس قدر دولت ہے کہ وہ اپنی ہر خواہش ہر وقت پوری کرسکتی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں ایک مثالی شوہر ہوں لیکن اب اتنا بُرا بھی نہیں ہوں کہ وہ باقاعدہ خودکشی کی کوشش کرے۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ کی بیوی نے ایسا دانستہ کیا تھا۔" ڈاکٹر ملر نے کہا۔ "یہ عمل دراصل ان کی لاشعوری خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ مانا کہ آپ کی بیوی اپنی ہر خواہش ہر وقت پوری کرسکتی ہیں مگر یہ بات اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ وہ اپنی زندگی سے خوش بھی ہیں۔ آپ نے غور فرمایا، میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟"

"مجھے اس کا احساس ہے ڈاکٹر کہ مارتھا کوئی ہنس مکھ عورت نہیں ہے۔" راجر نے کہا۔ "مجھے پہلی ہی ملاقات میں اس کا اندازہ ہوگیا تھا۔ پہلی ملاقات کے دو مہینے بعد ہی ہماری شادی ہوگئی تھی۔ ان دو مہینوں میں مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اس پر کبھی کبھی افسردگی کے دورے بھی پڑتے ہیں لیکن میں نے کبھی سنجیدگی سے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ افسردگی کے دورے اتنے خطرناک بھی ہوسکتے ہیں۔"

اس کے دوستوں نے مارتھا سے شادی کرنے کے فیصلے پر اسے خوب طعنے دیے تھے کہ وہ مارتھا سے صرف اس کی دولت کے لیے شادی کر رہا ہے لیکن اس نے ان طعنوں کی پروا نہ کرتے ہوئے مارتھا سے شادی کرلی تھی۔

"ایک بار آپ کی بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تین تین چار چار روز کے لیے خواب گاہ مقفل کرکے اس میں بند ہوجاتی ہیں۔"

"درست ہے۔" راجر نے کہا۔ "وہ اب بھی ایسا کرتی ہے اور یہی اس کے دوروں کی علامت ہوتی ہے۔"

"لیکن وہ ایسا کیوں کرتی ہیں؟"

"پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے۔" راجر نے جواب دیا۔

"کس قسم کی پریشانیاں؟"

"کاروباری پریشانیاں۔ مارتھا کا مالی مشیر ہر وقت اس کے کان کھاتا رہتا ہے۔"

"میں آپ کو یہی بتانا چاہتا تھا کہ بے حساب دولت بھی کسی کے لیے خوشیاں نہیں خرید سکتی بلکہ دولت سے خوشی خریدی ہی نہیں جاسکتی۔ آپ کی بیوی کا سب سے بڑا مسئلہ ان کی دولت ہے، آپ سمجھ رہے ہیں نا؟" راجر نے کئی بار پلکیں جھپکاکر ماہر نفسیات کو دیکھا۔ "آپ نہیں سمجھے مسٹر راجر؟" ڈاکٹر ملر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کی بیوی نے جب ہوش سنبھالا تھا تو ان کے گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ ان کی ہر خواہش لمحوں میں پوری ہوجاتی تھی اس لیے انھیں عام بچوں کی طرح اپنی کوئی خواہش پوری ہونے پر خوشی نہیں ہوتی تھی۔ آپ یوں سمجھیے کہ

صہیب نہنگ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.Com

ہمیں جب پیاس لگتی ہے تو ہم پانی پی لیتے ہیں اور ہماری پیاس بجھ جاتی ہے اس سے ہمیں مسرت کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن ذرا اُس مسافر کا تصور کیجیے جو تپتے ہوئے صحرا میں سفر کر رہا ہو اور پیاس کی شدت سے اس کی زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہو۔ ایسے میں پانی کے چند گھونٹ اسے ایسی مسرت بخشتے ہیں جیسے اسے غیر متوقع طور پر کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ آپ کی بیوی کو چونکہ خوشی کا احساس نہیں ہوتا اس لیے وہ خوش نہیں رہتیں۔ وہ ان چیزوں سے بھی لطف اندوز نہیں ہوتی ہیں جن کے لیے پیسے خرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میں خوش ہونے کا احساس زندہ کیا جائے۔ اسی طرح وہ خوش رہیں گی۔"

"میں سمجھ گیا۔" راہر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "لیکن کیا آپ کا خیال ہے، وہ اپنی زندگی سے اتنی ناخوش ہے کہ خودکشی کر لے گی؟"

"ہاں بشرطیکہ اس ناخوشی کا سدِباب نہ کیا جائے۔" ڈاکٹر ملر نے کہا۔ "تین روز قبل جو حادثہ پیش آیا تھا وہ آئندہ بھی پیش آ سکتا

ہے اور مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔"

راجر ڈاکٹر ملر کے دفتر سے باہر نکلا تو اس کے ذہن میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا کہ مارتھا زندگی سے اتنی ناخوش ہے کہ زندگی ہی کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ یہ خیال اس کے لیے اتنا سرور انگیز تھا کہ اگر سڑک پر راہگیر نہ ہوتے تو شاید وہ خوشی سے اچھلنا شروع کر دیتا۔

★★

راجر پر نظر پڑتے ہی گلوریا کو احساس ہو گیا کہ آج کوئی خاص بات ہو گئی ہے لیکن اس نے راجر سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ خود ہی اس کے سامنے سب کچھ اگل دے گا۔ گلوریا قالین پر اُس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ راجر صوفے پر سیدھا بیٹھا ہوا اپنا چھوٹا سا بھورے رنگ کا سگار پی رہا تھا۔ اس نے رک رک کر گلوریا کو بتایا۔ "بدھ کی رات مارتھا نے ایک ساتھ پانچ خواب آور گولیاں کھائی تھیں حالانکہ اسے صرف دو گولیاں کھانی تھیں۔ وہ کہتی ہے کہ اس نے غلطی سے ایسا کیا تھا اور وہ خواب آور گولیوں کو اسپرین کی گولیاں سمجھی تھی۔"

"اسپرین کی بھی ایک ساتھ پانچ گولیاں کون کھاتا ہے؟" گلوریا نے چہرہ اوپر کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہی تو ڈاکٹر ملر بھی کہتا ہے۔" راجر نے بے اختیار کہا۔

"کون، ڈاکٹر ملر؟"

"مارتھا کا معالج۔" راجر نے کہا۔ "اس کا کہنا ہے کہ اگر صورتِ حال یہی رہی تو ایک روز مارتھا خودکشی کرے گی۔"

"مارتھا خودکشی کرے گی؟ واہ کتنا عمدہ مذاق ہے" ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔"

"گلوریا۔" راجر نے سنجیدگی سے کہا۔ "کیا میں ایسا مذاق کر سکتا ہوں؟ اور وہ بھی اس معاملے میں؟ ذرا سوچو کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہمیں مارتھا کو قتل کرنے کے لیے کسی منصوبے پر غور کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔"

"اوہ راجر!" گلوریا نے کراہتے ہوئے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ "تم سے کتنی بار کہا ہے کہ یہ خوفناک لفظ میں نہیں سن سکتی اور تم اسے میرے ہی گھر میں دہرا رہے ہو؟ تمہیں معلوم نہیں، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

"سنو، ہم پچھلے چھ ماہ سے مارتھا کو دنیا سے رخصت کرنے کے مختلف منصوبوں پر غور کر رہے ہیں۔ اب اس سلسلے میں ہمیں سر نہیں کھپانا پڑے گا۔ ڈاکٹر ملر کا کہنا ہے کہ وہ خودکشی کرے گی۔"

"بیچاری مارتھا!" گلوریا نے تاسف سے کہا۔

"ہاں بیچاری۔" راجر نے کہا۔ "حالات میری توقعات سے کہیں زیادہ خراب ہیں۔ مارتھا کے اندر بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں، وہ اپنی دولت سے نفرت کرنے لگی ہے۔ سنا تم نے؟ کتنا بڑا مذاق ہے! مارتھا اُس دولت سے نفرت کرنے لگی ہے جس سے میں اتنی محبت کرتا ہوں۔"

"کوئی دیوانہ ہی دولت سے نفرت کر سکتا ہے۔" گلوریا نے کہا۔ "ممکن ہے، مارتھا اُس ڈاکٹر سے اپنے پاگل پن کا علاج کروا رہی ہو؟"

"وہ پاگل نہیں ہے بلکہ اپنی زندگی سے ناخوش ہے۔" راجر نے سگار کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "وہ کبھی خوش نہیں رہی۔ دولت چونکہ اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی اس لیے وہ دولت سے کوئی خوشی نہیں خرید سکتی جبکہ میں اسی دولت سے دنیا کی ہر خوشی خرید سکتا ہوں۔"

"اور میں بھی۔" گلوریا نے برجستہ کہا۔

"اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب خودکشی کرے گی۔" راجر نے کہا۔ "ممکن ہے آئندہ ہفتے کر لے یا آئندہ سال کرے یا تین سال بعد یا . . . ."

"بس راجر! بس کرو۔ میں اتنا انتظار نہیں کر سکتی۔ آنے والا کوئی دن میری خوب صورتی میں اضافہ نہیں کرتا۔ تم دیکھنا صرف ایک سال بعد میرے معاوضے میں کمی ہونے لگے گی۔"

گلوریا شہر کی مشہور ماڈل ایجنسی میں ایک انتہائی مہنگی ماڈل تھی۔ اس کا ایک گھنٹے کا معاوضہ کئی سو ڈالر سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اس کی آمدنی راجر کے جیب خرچ سے کہیں زیادہ تھی (کیوں کہ مارتھا کا مالی مشیر اسے حسب خواہش جیب خرچ دینے کے خلاف تھا) ان حالات میں بسا اوقات راجر کو گلوریا کا قریب ترین دوست ہونے پر خود بھی تعجب ہوتا تھا۔ گلوریا سے اس کی ملاقات اسی ماڈلنگ ایجنسی میں ہوئی تھی۔ جب خود اس نے بھی وہاں ملازمت اختیار کی تھی۔ پھر جب اس نے اچانک مارتھا سے شادی کر لی تھی تو گلوریا گلا پھاڑ کر خوب چیخی چلائی تھی۔ یہاں تک کہ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ وہ اتنی غمزدہ تھی کہ دوسرے روز ایک ملبوسات کی کمپنی کی اشتہاری فلم میں بھی کام نہیں کر سکی تھی۔ راجر نے گلوریا کو ایک بے حد قیمتی کنگن کا تحفہ دے کر منایا تھا۔ کنگن کی قیمت اس کی بیوی کے مالی مشیر نے ادا کی تھی اور وہ آج تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ راجر نے وہ کنگن اپنی بیوی کے لیے خریدا تھا۔

"ڈاکٹر ملر وقت کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہہ سکتا۔"

پی آئی اے ڈی سی-۱۰

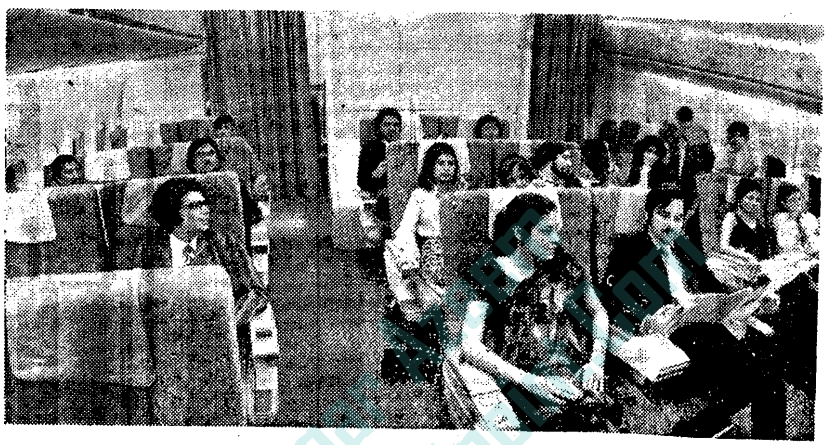

وسعت کا ایک نیا انداز!

فضائی سفر کا ایک نیا دور
پی آئی اے ڈی سی-۱۰ کی پروازوں کا سلسلہ عنقریب شروع کر رہی ہے۔
اس تاریخ ساز موقع پر پی آئی اے بجا طور پر فخر کر سکتی ہے

PIA

پاکستان انٹرنیشنل ائیرلائنز

RIO(K)PID

IAI-IPP-5-74

راجر نے کہا۔ "اس کا کہنا بس یہ ہے کہ اگر صورت حال میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہ ہوئی تو ممکن ہے مارتھا ایک روز خودکشی کر لے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ خودکشی کا انحصار اس کی ناخوشی پر ہے، تم اپنی بیوی کو بڑی آسانی سے مزید ناخوش کر سکتے ہو راجر۔"

"واہ واہ کتنا عمدہ مشورہ ہے۔ بھئی اس طرح تو مارتھا کی دولت ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ ہے۔ کیا وہ انتقاماً مجھے اپنی دولت سے محروم نہیں کر دے گی؟ کیا وہ مرنے سے پہلے اپنی وصیت تبدیل نہیں کر دے گی؟ گلوریا! میں اس وقت ایک بے حد نازک دھاگے پر چل رہا ہوں۔ یہ دھاگا ذرا سی غلطی سے ٹوٹ سکتا ہے۔ تم میری بیوی کے مالی مشیر کو نہیں جانتیں۔ وہ موقع کی تاک میں قینچی لیے ہر وقت میرے آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ میں اسے کوئی موقع دینا نہیں چاہتا۔ اس کے علاوہ میں بیچاری مارتھا کو بھی کوئی تکلیف نہیں دے سکتا۔ تمھیں نہیں معلوم کہ جب میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے اس پر کتنا ترس آتا ہے۔ وہ بیچاری کتنی دولت مند ہے پھر بھی ایک معمولی سی خوشی کے لیے ترستی ہے۔"

"راجر تمھاری انھی باتوں نے مجھے تمھارا دیوانہ بنا دیا ہے۔" گلوریا نے اپنے رخسار اس کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔ "تم بہت رحم دل ہو۔"

"ہمارے مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ میں کسی طرح مارتھا کو اتنی تعداد میں خواب آور گولیاں کھلا دوں کہ وہ اس فانی دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے۔ ڈاکٹر مل پولیس کو یہ حلفیہ بیان دے گا کہ مارتھا کی ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ اس کے خودکشی کرنے کے امکانات بہت روشن تھے۔ اس کا یہ بیان پولیس کو مطمئن کر دے گا۔"

راجر اپنی بیوی کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ "مارتھا!" راجر نے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔

"میں جاگ رہی ہوں۔" مارتھا نے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحوں تک وہ اپنے شوہر کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ "میں تمھاری واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ ڈاکٹر مل نے میرے بارے میں تم سے کیا باتیں کیں راجر؟"

"ڈاکٹر مل؟ میری تو اس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔"

"ٹیلیفون کے پاس پیغامات نوٹ کرنے کے لیے جو نوٹ بک رکھی ہے، اس میں تمھاری تحریر میں ڈاکٹر مل کے دفتر کا پتہ لکھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے، اس نے تمھیں ٹیلیفون کر کے اپنے دفتر آنے کی ہدایت کی ہوگی۔"

"تمھارے بارے میں تو اس نے کچھ نہیں کہا۔" راجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ مجھ پر بگڑ رہا تھا کہ میں آخر کیسا شوہر ہوں جو دوا کھاتے وقت اپنی بیوی کی نگرانی نہیں کرتا۔"

"اس کی یہ مجال؟ کیا اس نے تمھیں برا بھلا کہنے کی جرأت کی؟"

"لیکن مارتھا! اس نے غلط تو نہیں کہا۔" راجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں واقعی بہت نالائق شوہر ہوں۔ ذرا دیکھو تو، میرے گھر آنے کا کیا وقت ہے؟ اگر میں اس رات دس بجے سے پہلے گھر آ جاتا تو تم سے وہ غلطی سرزد نہ ہوتی۔"

"مجھے معلوم ہے، تم دفتر میں بہت دیر تک کام کرتے ہو۔ کام کی زیادتی تمھیں جلدی گھر آنے سے روکے رہتی ہے۔" مارتھا نے بڑی معصومیت سے کہا۔ اسے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس نے یہ فرض کر لیا تھا کہ اس کا شوہر رات گئے تک دفتر میں کام کرتا رہتا ہے، اس نے یہ اندازہ اپنے مرحوم باپ کی عادتوں کے پیش نظر لگایا تھا۔ اس کا باپ بے حد مجبوری کے عالم میں گھر آیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی موت سے قبل سات کروڑ ڈالر کی جائداد بنائی تھی جس کی وہ تنہا وارث تھی اور اب اس کا انتظام اس کے شوہر کے ہاتھ میں تھا۔ دفتر والے بھی راجر سے بہت خوش تھے۔ ایک بے پروا باس سبھی کے لیے رحمت ہوتا ہے۔

"مجھے بہلاؤ نہیں راجر! میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔" مارتھا نے کہا۔ "اس نے میرے بارے میں تمھیں کیا بتایا ہے؟"

"کچھ نہیں، وہ بس یہ کہہ رہا تھا کہ ایک اتنی عمدہ عورت کو کبھی اس امر کا موقع نہیں ملا کہ وہ خود کو پہچانے۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے۔"

"میرے اندر ضرور کوئی گڑبڑ ہے راجر! سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مجھے خوشی کا احساس کیوں نہیں ہوتا؟ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اندر سے بالکل کھوکھلی ہوں۔ راجر مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟"

"ڈارلنگ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔" راجر نے کہا۔ "بس اب آنکھیں بند کر لو اور جلدی سے سونے کی کوشش کرو۔ صبح تمھیں اپنے مالی مشیر سے بھی ملاقات کرنی ہے، اس کے لیے تمھیں زیادہ سے زیادہ توانائی کی ضرورت ہوگی۔"

"میری قوت، میری توانائی تو تم ہو راجر!" مارتھا نے ہاتھ بلند کر کے اس کا چہرہ ہتھیلیوں میں تھام لیا۔ راجر کا دل بھر آیا۔ وہ منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ آنسو پینے کے بعد جب اس نے مڑ کر دیکھا تو مارتھا آنکھیں بند کیے پرسکون انداز میں لیٹی ہوئی تھی۔

دوسرے روز دفتر پہنچ کر راجر نے فیصلہ کن انداز میں ٹیلیفون اٹھایا اور اپنی محبوبہ گلوریا کا نمبر ملانے لگا۔ "گلوریا! مجھے تم سے کچھ ضروری

باتیں کرتی ہیں۔ میں وہ باتیں فون پر نہیں کر سکتا۔ تم گھر کب تک ہوگی؟"

"دن بھر۔"

"تو پھر میں آرہا ہوں۔"

اطلاعی گھنٹی کی آواز سن کر گلوریا نے دروازہ کھولا اور مسکراتی ہوئی نظروں سے راجر کی پذیرائی کے لیے بڑھی۔ راجر کے چہرے پر سنجیدگی دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ راجر اندر داخل ہو کر قالین پر ٹہلنے لگا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ گلوریا کوچ پر بیٹھ گئی اور متوقع نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

"میں یہ کام نہیں کر سکتا گلوریا۔" راجر ٹہلتے ٹہلتے اچانک رک گیا۔

"کون سا کام؟"

"دیکھو ناراض نہ ہونا۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں یہ کام کروں گا نہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے یہ معاملہ فی الحال التوا میں ڈال دیا ہے۔ اس وقت مارتھا کو راستے سے ہٹانا اس کے ساتھ بڑا ظلم ہوگا۔"

"بڑا ظلم ہوگا؟" گلوریا نے حیرت سے اس کے الفاظ دہرائے "لیکن تم نے تو خود کہا تھا کہ یہ موقع بے حد مناسب ہے۔ کیوں کہ ڈاکٹر ...... کیا نام ہے اس کا....؟ وہ اس امر کی شہادت دے گا کہ مارتھا نے ایک بار پہلے بھی خودکشی کی کوشش کی تھی اور اس میں خودکشی کا میلان بہت پایا جاتا تھا۔" راجر نے اثبات میں سر ہلایا۔ گلوریا نے کہا "تو پھر اب انتظار کس بات کا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آج کل وہ اپنی زندگی سے بے حد ناخوش ہے۔ یہی موقع اس کی خودکشی کے لیے مناسب ترین ہوگا۔"

"اور یہی وجہ ہے کہ میں نے فی الحال یہ معاملہ التوا میں ڈال دیا ہے۔ آج کل وہ بہت اداس اور مغموم رہتی ہے۔ اس بیچاری نے پوری زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزارا جو مسرتوں سے بھرپور ہو۔ شادی کے روز بھی وہ صرف ایک بار میرے ایک لطیفے پر مسکرائی تھی۔ اس کے بعد میں نے آج تک اسے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ تمہیں حاصل کر کے تو اسے بہت خوشی ہوئی ہوگی۔"

"میں اس کی قوت ہوں، اس کی توانائی ہوں۔" راجر نے بے خیالی میں اپنی بیوی کے الفاظ دہرائے۔ "لیکن میں نے اسے کبھی کوئی خوشی نہیں دی۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔ یہ انصاف نہیں ہے گلوریا کہ میں اسے کوئی خوشی دیے بغیر اس کی ساری دولت کا حق دار بن بیٹھوں۔ اس کے بدلے میں مجھے بھی تو کچھ دینا چاہیے۔"

"اوہ راجر! تم بہت عجیب انسان ہو۔" گلوریا نے اسے ستائش کی نظر سے دیکھا۔

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسے راستے سے ہٹانے سے پہلے مجھے اسے بہت ساری مسرتیں دینی چاہئیں۔ اسی طرح میں صحیح معنوں میں اس کی دولت کا حق دار بنوں گا۔"

گلوریا چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ وہ کہہ رہا تھا "مجھے معلوم نہیں کہ میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہو سکوں گا۔ ہو سکتا ہے، بالکل ناکام ہو جاؤں۔ اگر ڈاکٹر ملر کا تجربہ درست تسلیم کر لیا جائے تو اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دولت کی فراوانی نے مارتھا سے خوشی کی حس چھین لی ہے یہاں تک کہ وہ ایسی چیزوں سے بھی لطف اندوز نہیں ہو سکتی جو مفت حاصل ہوتی ہیں۔ جیسے مغرب میں سورج غروب ہونے کا منظر یا تاروں بھرا آسمان یا آسمان پر چھائے ہوئے بادل۔"

"اوہ راجر! تم کس قدر شاعرانہ مزاج رکھتے ہو۔"

"...یا سمندری ساحل پر ریت سے ہم آغوش ہونے والی لہریں یا بہت دیر تک پیدل چلنے کے بعد ہری ہری ٹھنڈی گھاس پر لیٹ جانا۔"

"ہاں ہاں، مجھے معلوم ہے۔" گلوریا نے جلدی سے کہا "میں سمجھ گئی کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں خود ان چیزوں سے عشق کرتی ہوں لیکن

نوجوان لڑکو اور لڑکیو!
تمہارے "دی لنک انٹرنیشنل" کا خاص نمبر شائع ہو گیا
ساتویں رنگینیٔ شباب کی جھلک
• قلمی دوستی کے لیے سیکڑوں غیر ملکی لڑکے لڑکیوں کے نئے پتے اور فوٹو۔
• ٹکٹوں اور غیر ملکی زبانوں کے بارے میں معلوماتی فیچر۔
• گھر بیٹھے روپے کمائیے • اے ون خط کیسے لکھتے ہیں؟
• محبت بھری، نفرت بھری آپ بیتیاں • پیارے پیارے خط • دلچسپ تصاویر،
• نظمیں • کارٹون • رنگین چھپائی۔
اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا یہ خاص نمبر آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب کریں یا ہم سے براہ راست بذریعہ ڈاک منگوائیں۔
قیمت فی پرچہ ۔/۲ روپے بذریعہ وی پی ۸۰/۲ روپے
ملنے کا پتہ:- دی لنک انٹرنیشنل ۴۳ الیوسف چیمبر، شاہراہ لیاقت، کراچی ۱
THE LINK

اگر اس کے ساتھ دولت بھی ہو تو کیا کہنے۔“

”نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”ان چیزوں سے دولت کے بغیر ہی لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ ان کی قیمت ادا کیے بغیر، ان کا ٹکٹ لیے بغیر، ان کا کرایہ ادا کیے بغیر، تم سمجھیں، میرا کیا مطلب ہے؟“

”آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟“

”میں مارتھا کو لے کر ایک طویل سفر پر جانا چاہتا ہوں، ایک بہت ہی خاص قسم کے سفر پر، پیسوں کے بغیر۔ ہم کسی ہوٹل میں قیام نہیں کریں گے۔ ہم سفر کے لیے طیارے بھی استعمال نہیں کریں گے، ——— اگر ہم نے ریل میں سفر کیا تو تیسرے درجے میں کریں گے، ورنہ پیدل ہی آگے بڑھتے رہیں گے۔ پھر میں دیکھوں گا کہ وہ غریبانہ زندگی میں بھی خوشی محسوس کرتی ہے یا نہیں؟ غریبوں کو کل کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ صرف زندہ رہنے ہی میں خوش رہتے ہیں۔ میں اور مارتھا بالکل تنہا ہوں گے۔ ایک مرد اور ایک عورت کی طرح، جو ازل سے ایک دوسرے کی قربت کے خواہش مند رہتے ہیں مجھے معلوم ہے گلوریا! تم مجھے پاگل سمجھ رہی ہو گی لیکن میں یہ تجربہ ضرور کروں گا۔ ممکن ہے اس طرح اسے مرنے سے پہلے کچھ خوشی نصیب ہو جائے۔“

●●

مارتھا کو پہلے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ”پیسوں کے بغیر ایک طویل سفر؟ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

راجر زور سے ہنسا۔ ”مجھے تم سے اسی ردِ عمل کی توقع تھی ڈارلنگ! لیکن میں نے جو کچھ کہا ہے، اس کے ایک ایک لفظ کے بارے میں سنجیدہ ہوں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہماری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہو گی۔ ہم اپنے ساتھ چار پانچ سو ڈالر لے کر چلیں گے لیکن کسی ہوٹل میں قیام نہیں کریں گے۔ کسی طیارے میں سفر نہیں کریں گے۔ کوئی گاڑی کرائے پر حاصل نہیں کریں گے۔ ہماری کل پونجی بس وہی چار پانچ سو ڈالر ہوں گے۔ انھی میں ہمیں تین مہینے تک گزر کرنی ہو گی۔ ظاہر ہے، چار پانچ سو ڈالر میں دو مہینے تک صرف اس طریقے سے گزارا کیا جا سکتا ہے کہ ہم ایک ایک سینٹ خوب سوچ سمجھ کر خرچ کریں اور زیادہ سے زیادہ بچت کریں۔“

”راجر! کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟ تم تو ہمیشہ اعلا ترین ہوٹلوں میں ٹھیرنے اور ہر چیز بہترین طریقے سے کرنے کے عادی رہے ہو؟“

”مگر ایسے مہنگے سفروں سے تم نے کتنا لطف حاصل کیا؟ میں کہتا ہوں، حقیقت پسند بنو مارتھا!“

”ہم جائیں گے کہاں آخر؟“

”ہر جگہ اور کہیں بھی نہیں۔ ہماری کوئی منزل نہیں ہو گی۔ ہم خانہ بدوشوں کی طرح سڑکوں پر زندگی گزاریں گے۔ جہاں بھی کوئی سڑک پسند آئے گی، ہم اس پر چل پڑیں گے، جہاں بھی کوئی پہاڑ اچھا لگے گا اس پر چڑھنے لگیں گے۔ جہاں بھی کوئی چشمہ ہمیں پکارے گا، ہم اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھ جائیں گے۔“

”اپنی گاڑی میں؟“

”نہیں، ہم سائیکلوں پر سفر کر سکتے ہیں؟ اپنے پیروں پر سفر کر سکتے ہیں اور ضرورت پڑی تو اپنے انگوٹھوں پر بھی سفر کر سکتے ہیں۔ ہم کون ہوں گے؟ کوئی بھی نہیں ہماری کوئی منزل نہیں ہو گی۔ ہم خانہ بدوش ہوں گے، آوارہ گرد ہوں گے، فقیر ہوں گے۔ اگر قسمت نے ہمارا ساتھ دیا تو ہم گرفتار ہو کر جیل پہنچنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔“

”جی نہیں۔ شکریہ۔“

”اور ہمارا کھانا یہ ہو گا کہ کسی درخت سے بیر توڑ لیے، کسی کھیت سے گنے کاٹ لیے، کسی ریڑھی والے سے آڑو خرید لیے، کسی گھٹیا ہوٹل سے سینڈوچ لے لیے۔ ہم گھٹیا سے گھٹیا ہوٹلوں میں ٹھیریں گے اور معلوم ہے، ہم وہاں کے رجسٹروں میں اپنا نام کیا لکھوائیں گے؟ مسٹر اور مسز اسمتھ، تاکہ منتظمین کو یہ شک کرنے کا موقع ملے کہ میں تمھیں تمھارے گھر سے بھگا کے لے جا رہا ہوں اور ہم قانونی طور پر شادی شدہ نہیں ہیں۔“

شادی کے بعد راجر نے دوسری بار مارتھا کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔

”راجر! میرا خیال ہے کہ تم کچھ کچھ پاگل ہو گئے ہو۔“

”کچھ کچھ نہیں، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہم دونوں مکمل طور پر پاگل ہو جائیں۔ میں صاف اور تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتا ہوں۔ گرم لو کے تھپیڑوں اور یخ بستہ ہواؤں کے کوڑے اپنے جسم پر محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ میں سمندر کے گدلے نمکین پانی میں تیرنا چاہتا ہوں اور گھٹیا شرابیں پینا چاہتا ہوں۔ میں تمھیں ایسی چیزوں کا تجربہ کرانا چاہتا ہوں جن کے بارے میں تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا۔“

”تم واقعی سنجیدہ نظر آ رہے ہو راجر!“

”میں چاہتا ہوں کہ ہم کل ہی اس سفر پر روانہ ہو جائیں۔ نہیں، آج ہی، اسی وقت۔ ہم کسی کو اپنے اس سفر کی اطلاع نہیں دیں گے، کسی کو بھی نہیں۔ تمھارے مالی مشیر کو بھی نہیں۔“ راجر کا چہرہ جوش سے تمتمانے لگا۔ ”مارتھا! گھر میں جتنی بھی رقم موجود ہو وہ

فوراً اکٹھی کر لو۔ چیک بک یا کریڈٹ کارڈ ہرگز ساتھ نہ لینا۔ کوئی سوٹ کیس لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔" مارتھا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ راجر نے کہا۔ "اچھا ایسا کرو کہ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس لے لو، بہت چھوٹا سا۔ جس میں صرف بے حد ضروری سامان رکھا جا سکے۔"

"راجر! میں نے اس سے زیادہ احمقانہ بات آج تک نہیں سنی۔ اس طرح تو ہم ایک ہفتے بھی زندہ نہیں رہ سکیں گے۔"

"اگر ایسا وقت پڑا تو ہم کسی مال بردار جہاز میں سوار ہو کر یورپ چلے جائیں گے اور راستے بھر جہاز میں کام کر کے اپنا کرایہ اور کھانے پینے کا خرچ ادا کرتے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے، اس طرح ہم پوری دنیا کی سیاحت کریں۔"

"راجر! آج سے پہلے میں نے کبھی تمہیں ایسا نہیں دیکھا تھا۔"

"اور میں نے آج تک تمہیں اتنا خوش نہیں دیکھا تھا مارتھا!"

راجر نے آگے بڑھ کر اُسے باہوں میں جکڑ لیا۔ "میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں مارتھا! بس تم ہاں کر دو۔"

"تو کیا ——— ہم مال بیشر کو بھی اس سفر کی اطلاع نہ دیں؟"

"اطلاع دینے کی کیا ضرورت ہے؟" راجر نے اپنی بیوی کو نیم رضامند دیکھ کر کہا۔ "ہم جب بھی کسی نئی جگہ پہنچیں گے تو وہاں سے اسے ایک پوسٹ کارڈ روانہ کر دیں گے کہ ہمارا وقت بہت اچھا گزر رہا ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ تم ہمارے ساتھ نہیں ہو۔"

اس رات مارتھا دوسری بار مسکرائی۔

دو مہینے بعد گلوریا کو راجر کا پہلا خط موصول ہوا۔ وہ تو اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئی تھی۔ اس مایوسی نے اس کے چہرے کی شگفتگی پر بھی اثر ڈالا تھا۔ اس کا ایک گھنٹے کا معاوضہ سو ڈالر سے کم ہو کے اسی ڈالر رہ گیا تھا۔ اس نے راجر کی تحریر پہچانتے ہی اتنی عجلت میں لفافہ کھولا کہ خط بھی ایک کونے سے پھٹ گیا۔ خط خاصا طویل تھا۔ راجر نے لکھا تھا۔

"میری جان گلوریا! سب سے پہلے تو میں تم سے خط نہ لکھنے کی معافی چاہوں گا۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ میرے لیے تمہیں خط لکھنا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ میں اور مارتھا ابھی ابھی بگ سر سے واپس آئے ہیں۔ وہاں ہمارا قیام مشہور کمیون سنٹر میں تھا۔ اس کمیون سنٹر کی خاص بات یہ ہے کہ وہاں پہنچ کر مردوں، عورتوں، لڑکیوں اور لڑکوں کے درمیان تمیز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سال وہاں کے لڑکوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ داڑھی رکھنا فیشن سے ختم ہو گیا ہے۔ جبکہ لمبے لمبے بال ابھی فیشن میں موجود ہیں۔ لڑکیوں نے فی الحال سر منڈوانے کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اس لیے چند مخصوص نشانیاں غور سے دیکھنے کے بعد ہی کسی کی جنس کے بارے میں کوئی حتمی رائے دی جا سکتی ہے۔ تمہیں یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ میں آج کل ایک بہت عمدہ اور شاندار بھوری داڑھی کا مالک ہوں۔ مارتھا بھی بالکل بدل گئی ہے۔ اگر تم اب اچانک اسے دیکھ لو تو پہچاننے سے قطعی قاصر رہو گی۔ گھر سے روانہ ہونے کے بعد اس نے ایک ہفتے تک تو میک اپ کیا (وہ اپنے ساتھ میک اپ کی آدھے درجن بوتلیں اور ڈبیائیں لائی تھی لیکن جلد ہی ایک ایک کر کے ان سے نجات حاصل ہو گئی) اب وہ میک اپ کے بغیر پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت نظر آتی ہے۔ اس کی رنگت اخروٹ کی طرح بھوری ہو گئی ہے۔ لیکن چہرے کی تمام شکنیں غائب ہو گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا وزن بھی پانچ سیر کم ہو گیا ہے، وہ دُبلی ہو کر اور زیادہ پرکشش ہو گئی ہے۔ اب وہ اپنے لباس کی بالکل پروا نہیں کرتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا حُسن اب لباس کی موزونیت کا محتاج نہیں رہا۔ اس نے ہر قسم کی فیشن ایبل چیزوں کا خیال اپنے ذہن سے نکال دیا ہے۔ واپس آ کر اب وہ کسی ایسی تقریب میں شرکت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی جس میں جدید فیشن کے تقاضوں کا خیال رکھنا لازمی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب تک مارتھا اچھی زندگی کے لیے جو چیزیں جزو لاینفک تصور کرتی تھی، ان سے اب اسے ذرا بھی دلچسپی نہیں رہی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرا تجربہ صد فی صد کامیاب رہا۔ مارتھا اب خوش ہے، وہ واقعی بہت خوش رہتی ہے۔

"گلوریا! یقین کرو، وہ اپنی زندگی میں کبھی اتنی خوش نہیں رہی۔ اس نے پوری زندگی میں اتنی آسودگی حاصل نہیں کی تھی جتنی ان دو مہینوں میں اسے ملی ہے۔ ہم نے جس رات اچانک اپنا سفر شروع کیا تھا، اُس وقت ہمارے پاس کل چار سو بارہ ڈالر تھے جن میں ہمیں دو مہینے گزارنے تھے۔ میں تمہیں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ یہ دو مہینے ہم نے کس طرح گزارے؟ کیا تم یقین کر سکتی ہو کہ ہم نے کھانے میں صرف بکرے کا گوشت کھایا۔ اس کے سوا کوئی ڈش موجود نہیں تھی۔ ہم نے مسلسل دو راتیں کھلے آسمان کے نیچے کھیتوں میں گزاریں۔ تیسرے درجے میں تین کھلنڈرے لڑکوں کے ساتھ ریل کا سفر کیا۔ وہ ساری رات ہارمونیم بجاتے رہے۔ ہم نے ایک بار سیب کے باغات میں سیب توڑنے کی ملازمت کی اور اس دوران میں ہم نے اتنے سیب کھائے کہ شاید اب زندگی بھر سیب کھانے کو دل نہ چاہے۔ ہم نے موسیقاروں

کی ایک ٹولی سے دوستی کر لی۔ وہ ہمیں اپنی بس میں چار ٹولی والی سے نارتھ کیرولینا تک مفت لے گئے۔ گلوریا! میں تمھیں تمام باتیں تو نہیں لکھ سکتا لیکن مستقبل ایک موقع ایسا دینے والا ہے کہ میں تفصیل سے تمھیں اس سفر کی ایک ایک بات بتاؤں گا۔ بس تم اس وقت کا انتظار کرو۔ وہ وقت بہت قریب آرہا ہے۔ میں تمھیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے وہی کیا جو میرے نزدیک صحیح تھا اور جسے کرنا میرا فرض تھا۔ اب میرا کام ختم ہو گیا ہے اور میں مارتھا کے ساتھ واپس آرہا ہوں۔ وہ بالکل بدل گئی ہے اور بہت ہنس مکھ ہو گئی ہے۔ لیکن میں تمھیں اپنے بارے میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں بالکل نہیں بدلا۔ میرے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تم میرا اشارہ سمجھ گئی ہوگی۔ اس لیے واپس آنے کے بعد اگر میں چند روز یا ہفتے بھر تم سے رابطہ قائم نہ کروں تو بدگمان نہ ہونا۔ تمھیں بہت جلد اس کی وجہ بھی معلوم ہو جائے گی۔ اچھا فی الحال میں تم سے رخصت ہوتا ہوں۔
ہاں یہ خط پڑھ کر فوراً جلا دینا۔ فقط   تمھارا راجر

گلوریا نے خط پڑھ کر اسے تلف کر دیا۔

مارتھا کو خودکشی کیے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا۔ گلوریا نے اخبار میں اس کی خبر پڑھ لی تھی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق خودکشی زیادہ تعداد میں خواب آور گولیاں کھا کر کی گئی تھی۔ ایک ہفتہ گزر چکا تھا مگر راجر نے اس سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ وہ اس سے گفتگو کرنے کے لیے بے قرار تھی۔ جب مزید صبر کرنا اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تو اس نے راجر کی ہدایات سے بے پروا ہو کے اسے ٹیلیفون کر ہی دیا۔ ایک ملازم نے جواب دیا کہ وہ اس وقت بے حد مصروف ہیں اس لیے انھیں ٹیلیفون پر نہیں بلایا جا سکتا۔

اسی رات راجر نے اسے فون کر کے بتایا کہ جس وقت اُس کا ٹیلی فون آیا تھا، وہ اپنی مرحوم بیوی کے مالی مشیر سے اہم معاملات پر گفت و شنید کر رہا تھا۔ راجر کی آواز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ گلوریا اس کی پریشانی کا سبب اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ ظاہر ہے، جو شخص قاتل ہو۔ اس کا ضمیر اسے پریشان ضرور کرتا ہے۔

دوسرے روز راجر نے گلوریا کو پھر ٹیلی فون کیا اور اسے بتایا کہ وہ اس کے پاس آرہا ہے۔ گلوریا اس کی آواز سے اس کے موڈ کا اندازہ نہیں لگا سکی۔ اس کا لب و لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

"تمھارا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔" گلوریا نے راجر کو دیکھتے ہی کہا۔ وہ چند لمحوں تک غور سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ "تم خود بھی عجیب نظر آرہے ہو۔"

"ہاں! اس کی وجہ میری داڑھی ہے۔" راجر نے جواب دیا۔ "میرے چہرے پر داڑھی تھی جسے میں نے یہاں آکر صاف کر دیا تھا۔ دو مہینے میں دھوپ کی تمازت سے میرا رنگ تانبے جیسا ہو گیا لیکن داڑھی میں پوشیدہ حصہ پہلے کی طرح سفید ہے۔ اسی لیے میں تمھیں عجیب سا نظر آرہا ہوں۔" راجر تھکے تھکے انداز میں کوچ پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی عمر سے دس سال بڑا نظر آرہا تھا۔ وہ خاموشی سے قالین پر بنا ہوا ایک پھول گھور رہا تھا۔

"راجر! کہیں تم چرس وغیرہ تو نہیں پینے لگے؟" گلوریا نے اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" راجر نے جواب دیا۔ اس کی نظریں اب بھی قالین پر جمی ہوئی تھیں۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"میں نے وہی کیا جو کہا تھا۔" راجر نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ "میں نے مارتھا کو اس کی موت سے پہلے بے شمار خوشیاں دیں۔ مسرتوں سے اس کی جھولی بھر دی۔ پھر میں نے اسے خواب آور گولیاں کھلا دیں اور وہ انھیں کھا کر ہمیشہ کے لیے سو گئی۔ گلوریا! میں قسم کھاتا ہوں کہ وہ موت کے بعد بھی مسکرا رہی تھی۔"

"کیا تمھیں مارتھا کی موت نے بہت متاثر کیا ہے راجر؟"

"نہیں۔" راجر نے جواب دیا۔ وہ غور سے اپنے ہاتھ دیکھنے لگا۔ پھر اس نے گلوریا کی طرف دیکھا۔

"میں مارتھا کے وکیل سے مل کر سیدھا آرہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے کہ مارتھا نے سفر سے واپس آتے ہی اپنی وصیت تبدیل کر دی تھی۔"

"کیا کر دیا تھا؟" گلوریا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"اس نے اپنی وصیت تبدیل کر دی تھی۔" راجر نے دہرایا۔ "اب اس کی تمام دولت غریبوں، یتیم خانوں، اسپتالوں، اور دوسرے خیراتی اداروں میں تقسیم کر دی جائے گی۔ مارتھا کو اپنی دولت سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ غریب ہونا چاہتی تھی کیوں کہ غربت ہی نے اسے مسرتیں بخشی تھیں۔"

چمکدار، مضبوط، رواں
مجاہد اور شہسوار
سلائی دھاگے
MUJAHID THREAD
کپڑا قیمتی ہو یا معمولی، مضبوط اور خوبصورت سلائی کے لیے ہمیشہ مجاہد اور شہسوار سلائی دھاگے استعمال کیجئے
مجاہد اور شہسوار سلائی دھاگے اپنی بہترین کوالٹی کے سبب پاکستان کے علاوہ
بیرونی ممالک میں بھی نہایت مقبول ہیں
تیار کنندگان:
جمال ٹیکسٹائل ملز
شعبہ:
حسین انڈسٹریز لمیٹڈ۔کراچی
ORIENT

ایک روز مجھے اپنے سر پر غیر معمولی چبھن محسوس ہوئی۔ میں نے کئی بار سر جھٹکا اور بالوں میں انگلیاں پھیریں مگر چبھن کم نہ ہوئی۔ ناچار میں نے اپنے سر پر تصور کی نگاہ ڈالی تو دنگ رہ گیا۔ ایک خوبصورت، نازک اور شوخ لڑکی اطمینان سے میرے سر پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ یہ انکا تھی۔ انکا ایک غیر مرئی اور ناقابلِ یقین طاقتوں کی مالک دیوی تھی۔ کسی بھی شخص کے سر پر جا کر اسے اپنا آلۂ کار بنا لینا اس کے لیے ایک کھیل تھا۔ وہ جس شخص کی مطیع ہو جاتی تھی اس کے لیے غیر معمولی کارنامے انجام دیتی تھی۔ اسے حاصل کرنے کے لیے ایک مخصوص جاپ کرنا پڑتا تھا مگر میرے سر پر وہ خود بخود چلی آئی تھی کیونکہ انکا نے مجھے پسند کر لیا تھا۔ اس کی آمد نے میری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ میں ایک قلاش کلرک تھا مگر انکا کی بدولت مجھے دنیا جہان کی نعمتیں حاصل ہو گئیں اور میرے شب و روز شراب و شباب، رنگ رلیوں اور محفلوں میں بسر ہونے لگے لیکن اس زندگی کا دوسرا رخ انتہائی ہولناک تھا۔ انکا اپنی پراسرار روح کی بقا کے لیے انسانی خون پینے کی محتاج تھی مگر کسی انسان کو خود قتل کرنا اس کے بس میں نہیں تھا لہٰذا یہ مکروہ اور لرزہ خیز کام مجھے انجام دینا پڑتا تھا۔ انکا کے اشارے پر سب سے پہلے میں نے اپنی محبوبہ نرگس کے منگیتر کو قتل کیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا قتل تھا۔ اس کے صلے میں انکا نے بڑے ڈرامائی انداز میں نرگس کو ہمیشہ کے لیے میری رفیق بنا دیا۔ نرگس اپنے ماں باپ سے کھلم کھلا باغی ہو کر میرے سہارے عشق میں آگئی تھی۔ نرگس کی رفاقت میرے دل کا سب سے بڑا ارمان تھا لیکن اس کا حصول میرے لیے تسکین کا باعث نہیں ہو سکا کیونکہ میں انکا کی وجہ سے آئے دن قتل و غارت، مقدمات، گرفتاری اور رہائی کے چکروں میں گھرا رہنے لگا۔ یہ صورت حال نرگس کے لیے بھی تشویشناک تھی اس لیے ہم دونوں نے ایک رات انکا سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کا ہمیں سخت خمیازہ بھگتنا پڑا۔ انکا نے انتقاماً میری کار کا ایکسیڈنٹ کروا دیا۔ اس حادثے میں مجھے اپنے ایک ہاتھ سے محروم ہونا پڑا اور دوسری طرف نرگس اغوا کر لی گئی۔ میں نے اسے بڑی شرمناک حالت میں ایک غیر مرد کی آغوش میں دیکھا۔ یہ صدمے معمولی نہیں تھے نتیجتاً مجھے انکا سے مفاہمت کرنی پڑی۔ وہ نہال ہو گئی اور اس نے مجھے عیش و عشرت کی جنت میں پہنچا دیا۔ انہی دنوں ایک روز انکا نے مجھے یہ وحشت اثر خبر سنائی کہ پونا کے ایک پنڈت تربینی داس نے اس کے حصول کا جاپ شروع کر دیا ہے۔ میں پریشان ہو گیا کیونکہ انکا اب میری عادت بن چکی تھی اور اس کا فراق میرے لیے تباہی اور بربادی کا سامان تھا۔ میں نے اور انکا نے تربینی داس کے جاپ میں خلل ڈالنے کی بہت کوشش کی لیکن قسمت مہربان نہیں تھی اس لیے وہ اپنے جاپ میں کامیاب ہو گیا اور انکا بادلِ ناخواستہ مجھ سے بچھڑ کر اس کی تحویل میں چلی گئی۔ تربینی داس ایک کینہ توز شخص تھا۔ اس نے مجھ سے گن گن کے بدلے لیے۔ مجھے غلام بنا لیا۔ نرگس پھر مجھ سے چھن گئی۔ مجھ سے زبردستی بھیانک جرائم کروائے گئے اور آخر میں سڑکوں پر بھیک مانگنے کے لیے بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا۔ قسمت برگشتہ ہو تو موت بھی آدمی کے پاس نہیں پھٹکتی۔ اسی زمانے میں میری حالتِ زار پر ترس کھا کر بدری نرائن نامی ایک پنڈت نے مجھے شہر رام پور کے مجذوب برکاتی شاہ کا پتا بتایا کہ اگر برکاتی شاہ کی دست گیری ہو تو انکا مجھے دوبارہ مل سکتی ہے۔ میں اسے کچھ روز کے لیے بدری نرائن کے تصرف میں دے دوں گا۔ میں ایک زندہ لاش کی طرح گھسٹتا ہوا، السّم لیتیم برکاتی شاہ کی خدمت میں پہنچا۔ اس مرد قلندر نے مجھے چالیس دن تک چلّہ کھنچوایا اور چند روز بعد انکا واقعی مجھے مل گئی۔ روٹھی ہوئی مسرتوں نے مجھے پھر گلے لگا لیا مگر ساتھ ہی بدری نرائن ہاتھ دھو کے میرے پیچھے پڑ گیا کیونکہ حسبِ وعدہ انکا اسے مستعار دے دی لیکن مجھے انکا کی جدائی کا بڑا تلخ تجربہ ہو چکا تھا اور بدری نرائن قول و فعل کے لحاظ سے ایک مشکوک آدمی تھا اس لیے میں اسے ٹالتا رہا۔ اس کا اصرار بڑھتا چلا گیا۔ آخر ایک روز تنگ آ کے میں نے اس سے صاف انکار کر دیا۔ وہ بھڑک اٹھا اور اس نے مختلف طریقوں سے مجھے زچ کرنے کے علاوہ ایک روز اپنے بیروں کے ذریعے میری زندگی کی سب سے قیمتی متاع نرگس کو مجھ سے چھین لیا جو انکا کے دوبارہ آنے کے بعد میرے ساتھ ہی رہنے لگی تھی۔ میں بدری نرائن کی بوٹیاں نوچ لینے کے لیے آندھی اور طوفان کی طرح اس کے تعاقب میں دوڑا لیکن وہ بزدل کسی نہ کسی طرح کلکتے پہنچ کے کالی کے مندر میں پناہ گزیں ہو گیا۔ کالی کی مہان شکتی کے سامنے انکا بھی بے بس تھی پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور اشتعال کے عالم میں مندر کے بڑے پجاری کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مجھ پر جنون سوار تھا۔ انکا نے مجھے قابو میں رکھنے کے لیے میرے ہوش و حواس سلب کر لیے۔ میں دیوانوں کی طرح شہر در شہر بھٹکتا پھرا۔ اسی پاگل پن میں ایک نوجوان اور موڈرن لڑکی مجھے مل گئی۔ اس نے کوشش کی کہ میں نرگس کا غم بھول جاؤں۔ گلدیپ پونا کے ایک سیٹھ کی بیٹی تھی مگر میری محبت میں گرفتار ہو کر خاندانی قیود سے آزاد ہو گئی تھی اور میرے ساتھ ہندوستان بھر میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ کالی کے مندر میں بدری نرائن کا قیام طویل ہو گیا تھا اور اُس کینہ پرور کو بھی پانے کے لیے میری کوئی سعی کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں نے اس سلسلے میں ہندوستان کے ایک بڑے پنڈت پریتم لال سے مدد لینے کا فیصلہ کیا اور انکا اور گلدیپ کے ساتھ میسور کی ویران پہاڑیوں میں جا پہنچا جہاں پریتم لال کا استھان تھا۔ یہاں مجھ سے ایک فاش غلطی سرزد ہو گئی۔ میں پریتم لال کی خوبصورت اور کنواری داسی مالا پر دست درازی کر بیٹھا۔ دھیان، گیان اور گیانی دھیانی پریتم لال نے اس جسارت پر مشتعل ہو کر مجھے مجہول و مفلوج کر دیا اور انکا کو میرا خون پینے پر مجبور کیا۔ یہ ایک کڑی سزا تھی۔ میں بے بسی سے برسوں برباد اور موت کی آرزو کرتا رہا۔ اسی کسمپرسی میں ایک طویل مدت گزر گئی تا آنکہ پریتم لال کا آخری وقت آ پہنچا۔ نزع کے عالم میں اس نے گلدیپ کو اپنی داسی بنا لیا اور مجھے معاف کر کے مالا کا ہاتھ ہمیشہ کے لیے میرے ہاتھ میں دے دیا کیونکہ میں وہ پہلا شخص تھا جس نے اس کا پراسرار کنوار چھوا تھا۔ پریتم لال کی وفات کے چند روز بعد مجھے بادلِ ناخواستہ گلدیپ سے رخصت ہونا پڑا اور میں انکا اور مالا کو ساتھ لے کر پونا آ گیا۔ یہاں میں نے تربینی داس سے اپنی ذلتوں کا بھیانک انتقام لیا۔ میں نے انگلیاں گاڑ کے اس کی آنکھیں نکال لیں اور اس قدر بے دردی سے اسے زدوکوب کیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے۔ اس مہم کے بعد میں بدری نرائن سے نمٹنے کے لیے کلکتے آ گیا۔ وہ شیطان اب تک کالی کی پناہ میں تھا۔ کلکتے آتے ہوئے برسوں بعد میری اپنے سگے چچا سے ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ میں گھر چلوں۔ بدری نرائن سے جلد معاملہ نمٹنے کے کوئی آثار نہیں تھے اس لیے میں نے لکھنؤ کا قصد کیا۔ ریل میں مجھے ایک خوبصورت لڑکی ترئین ملی جس میں نرگس کی شباہت دیکھ کر میرا دل خود بخود اس کی طرف کھنچنے لگا۔ میں نے اس سے اپنائیت کے ساتھ گفتگو کی اور شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس طرح اُسے بھی میری طرف راغب ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور مجھ پر یہ افسوسناک انکشاف ہوا کہ اسے لکھنؤ کی ایک مشہور طوائف اشرفی بیگم نے بچپن میں اغوا کر کے پال لیا تھا اور اب اس کی دوشیزگی نیلام کر کے اپنا تمام محنت وصول کرنا چاہتی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس معصوم لڑکی کو اس لعنتی ماحول سے نجات دلائے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ لکھنؤ میں میرے چچا زاد بھائی اور بہنوں نے مجھے اور مالا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میں مدتوں بعد اپنے خاندان میں پہنچا تھا اس لیے وہاں میں نے مالا کی آغوش میں چند روز بڑے سکون سے گزارے۔

مگر جلد ہی میری زندگی پھر ہنگاموں میں مبتلا ہو گئی۔ میں نے اشرفی بیگم کے بالاخانے پہنچ کے انکا کی مدد سے ہلچل مچا دی۔ ہکا ترئین کی خریداری کے لیے لکھنؤ کے امرا اور نوابین نے بڑھ چڑھ کر بولیاں لگائیں۔ ایک بڑا رئیس نواب بتن علی خاں خصوصیت سے اس معاملے میں پیش پیش تھا۔ میں اس کے راستے کی دیوار بن گیا۔ یہ دخل اندازی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے مشتعل ہو کے کرائے کے غنڈوں کے ذریعے میری چچا زاد بہن درخشانہ کو اغوا کروا لیا لیکن میری تاک سر پر ہاتھ ڈالنا اسے بہت مہنگا پڑا۔ میں نے درخشانہ کو تو فوراً اس کی حویلی سے برآمد کر لیا لیکن بتن علی کو نہیں بخشا۔ چنانچہ اسے انکا کے زیر اثر شاہی ایک خوبصورت داشتہ کو قتل کر کے جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ اس کی دو حسین و جمیل نوجوان بہنیں درخشاں زر افشاں تھیں۔ میں نے عہد کیا کہ انھیں کوٹھے کی زینت بنا کے دم لوں گا مگر رحیق نامی ایک جن ان بہنوں کے عشق میں مبتلا ہو کے ان کا نگراں بن گیا تھا اور اس نے میرا راستہ مسدود کر دیا تھا اس لیے مجھے عارضی طور پر اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ دوسری طرف اشرفی بیگم نے ترئین کا سودا کسی اور سے طے کر دیا لیکن جس شام وہ بے زبان فروخت ہونے والی تھی اسے کسی نامعلوم طاقت نے بالاخانے سے غائب کر دیا۔ اشرفی بیگم نے اس کی گمشدگی کا الزام مجھ پر دھرا اور عیاش افسروں سے ساز باز کر کے مجھے جیل پہنچوا دیا۔ گرفتاری کی اذیت ہی کیا کم تھی کہ مجھ پر دکھ کا ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بدری نرائن نے موقع پا کر انکا کے حصول کا جاپ کیا اور اُسے مجھ سے توڑ لیا۔ میری کائنات ایک بار پھر اندھیری ہو گئی اور جب میں جیل سے باہر نکلا تو بدری نرائن کی پے در پے انتقامی کارروائیوں نے مجھے زندہ درگور کر کے رکھ دیا۔ وہ مجھے جان سے مارے بغیر نہ چھوڑتا لیکن ایک اجنبی اور پُراسرار لڑکی کلپنا نے ہر نازک موقع پر اچانک نمودار ہو کے مجھے بے بسی کی موت مرنے سے بچا لیا۔ ان جھانی پریتم لال کا ایک دوست سادھو جگ دیا اکثر مواقع پر میری پشت پناہی کرتا تھا۔ اس نے مجھ پر سب سے بڑا احسان یہ کیا کہ مخصوص جاپ کر کے انکا کو بدری نرائن کے پنجے سے نکالا اور بڑی بے نیازی سے میری جھولی میں ڈال دیا۔ میری مسرتوں میں انکا کو پا کر اور اشرفی بیگم کی خبر لینے کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں اشرفی بیگم کی دکان دل نشیں نامی ایک نو دمیدہ پھول سے سجی ہوئی تھی۔ بتن علی بری ہو چکا تھا اور دل نشیں کی خریداری میں زبردست دلچسپی لے رہا تھا۔ میں اس کے مقابلے پر جا پہنچا اور ایک منصوبے کے تحت بڑی بڑی بولیاں لگانے لگا چنانچہ بتن علی نے اپنی ناک بچانے کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیا جو اس کے پاس تھا اور میں ایک بیک پیچھے ہٹ گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بتن علی کو دل نشیں کی چند روزہ صحبت کے عوض اپنی پائی پائی اشرفی بیگم کے حوالے کرنے کے علاوہ آبائی حویلی بھی اس کے پاس گروی رکھنی پڑی۔ وہ قلاش ہو کے اشرفی بیگم کے پاس جلیں بھرنے لگا۔ اس سے نمٹ کر میں اشرفی بیگم پر ملتفت ہوا۔ اشرفی بیگم کی موت بڑی عبرتناک ثابت ہوئی۔ اس کے ایک سازندے بنّے خاں نے انکا کے زیر اثر درندوں کی طرح اس کا خون پیا۔ بالاخانے میں افراتفری پھیل گئی۔ بتن علی موقع سے فائدہ اٹھا کر تجوری سے اپنی حویلی کے کاغذات لے اڑا۔ میں نے فوراً انکا کو اس کے تعاقب میں روانہ کر دیا اور حالات کا تنِ تنہا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے پولیس پہنچ گئی۔ پولیس کے ساتھ بدری نرائن بھی تھا اور انکا کی غیر موجودگی غنیمت سمجھ کے مجھے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کے اشارے پر اس کے ناپاک بیروں نے مجھے گھیر لیا لیکن کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے کیونکہ پراسرار کلپنا نے بروقت نمودار ہو کر ان سے خطرناک مقابلہ کیا اور مجھے بخیروخوبی یہاں سے نکال لائی۔ یہیں بتن علی اور ترئین نے کمال تو ترئین کے استھان پہنچا دیا۔ یہاں خلافِ توقع ترئین بھی موجود تھی۔ گلدیپ، بن باس اور کٹھن تپسیا کی وجہ سے مہان شکتی کی مالک بن چکی تھی اور اس نے ترئین میں میری خصوصی دلچسپی کے پیش نظر اسے یہیں بلوا لیا تھا۔ یہ جگہ میرا گھر تھی۔ یہاں میں نے بڑے آسودہ دن گزارے۔ گلدیپ اور ترئین نے کمال محبت میری آؤ بھگت کی۔ کچھ روز بعد انکا بھی وہیں پہنچ گئی۔ گلدیپ کی چاہت اب شفقت میں بدل گئی تھی اور مجھے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا تاہم ایک روز میں نے جذبات کی شدت سے بے قرار ہو کر اسے زبردستی آغوش میں بھر لیا۔ اس لمحاتی غلطی کا نتیجہ انتہائی دہشت ناک نکلا۔ گلدیپ کی دلی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر بدری نرائن نے لکھنؤ میں مالا کا کام تمام کر دیا۔ یہ دوسری چوٹ تھی جو اس نے میرے دل کی گہرائیوں میں لگائی تھی۔ میں دیوانہ ہو گیا مگر چونکہ بدری نرائن دوسروں کے بجائے کالی کے تحفظ میں آ گیا تھا اس لیے میرا دستِ انتقام اس کی گردن کا پھندا نہیں بن سکا۔ ہندوستان کی زمین سرِدست مجھ پر تنگ تھی اس لیے میں نے گلدیپ اور سادھو جگ دیا کے مشورے پر یورپ کی چند روزہ سیاحت کا پروگرام مرتب کیا اور دولت علی کے فرضی نام سے پاسپورٹ بنوا کر بمبئی سے لندن آ گیا۔ جلد ہی مجھے لندن کی ایک دلنشیں زلفی سارا مل گئی تھی۔ انکا کی مدد سے مجھے اُسے شیشے میں اتارتے میں دیر نہیں لگی۔ لندن میں سارا کے ساتھ میں نے بڑی حسین شامیں گزاریں لیکن اس غریب کو میری قربت بہت مہنگی پڑی۔ اس کے ایک نوجوان امیدوار نے جوشِ رقابت میں اس کے باپ کو قتل کروا دیا اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ قتل کا الزام میرے سر منڈھ دیا جائے۔ اس افتاد سے بچنے کے لیے مجھے انکا کے ذریعے باطنی علم اور حاضرات ارواح کا سہارا لینا پڑا۔ نوجوان سراغ رساں جم میری مخفی صلاحیتیں دیکھ کر دنگ رہ گیا اور اس نے مجھ سے ایک عجیب کام لیا۔ برلن سے ایک جرمن سائنس داں کو اغوا کر کے لندن لانا تھا۔ یہ مہم کرشمہ کار انکا کے لیے معمولی کھیل تھا لیکن اس کی انجام دہی کا صلہ مجھے غیر معمولی ملا۔ جم کی سراغ رساں ساتھی جین پکے ہوئے پھل کی طرح میری جھولی میں آ گری۔ میں نے برلن کے ایک شاندار ہوٹل میں بند ہو کر پندرہ روز تک اس کے بارغ بدن کی سیاحت کی اور سرشار ہو کے لندن لوٹ آیا۔ یہاں میں نے بڑا ہنگامہ خیز وقت گزارا۔ ایک طرف امرائے لندن کے کلب میں امیر و کبیر دوشیزاؤں کو اپنی قربت سے مالا مال کیا، دوسری طرف ترک کے دو جیّد جادوگروں کو برسرِ عام شکست دی اور ان کی نوجوان ساتھی نگار کاحل اور بدن جیت لیا۔ لندن کا ایک جاگیردار میری دوست سارا کی دولت اور جوانی کا اس حد تک خواہاں تھا کہ اس نے مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے چھ غنڈے میرے پیچھے لگا دیے۔ انکا کو ان چھ سرخ و سپید انگریزوں کا خون پی کر بڑی فرحت حاصل ہوئی اور جاگیردار مذکور کو بڑے ڈرامائی انداز میں خودکشی کرنی پڑی اور میں نے سارا کو جم کے مضبوط بازوؤں میں پہنچا کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.Com

کر دیا۔ ان متنوع اور تحیر خیز حالات نے مجھے لندن میں بھی سکون کا سانس نہیں لینے دیا۔ میں اپنے ہی خوابوں کا اشک بار مجھ چھوڑ کر دیا تب میں سوار ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں ہندوستان کی حدود میں داخل ہوتا بدری نرائن کے ہرکاروں نے مجھے پالیا۔ بالا ٹھکانے لگانے کے لیے جہاز گھیر لیا۔ اگر انکا یہ خیال تھا کہ ہوتی اور پُراسرار کلیشاندر کو منتیج جانتی تو میری اور دوسرے مسافروں کی لاشوں کا بھی پتہ نہ چلتا۔ ایک زبردست کشمکش کے بعد تہران کے ہوائی اڈے پر اتر گیا تین بدھ بھکشو بھی میرے ہم سفر تھے۔ ان کا سربراہ کرپالا ایک پہنچا ہوا شخص تھا۔ اس نے اپنے کشف سے میرے حالات کا سراغ لگا کر مجھ سے ہمدردی کا برتاؤ کیا اور مجھے اپنے ساتھ تبت چلنے کی دعوت دی مگر بدری نرائن مجھ پر بھوت کی طرح سوار تھا اس لیے میں تہران سے سیدھا ہندوستان پہنچ گیا۔

اس عرصے میں میرا محسن سادھو جگ دیو سورگ باش ہو چکا تھا اور کلدیپ کسی طویل جاپ میں مصروف تھی۔ بدری نرائن نے ہندوستان بھر کے پنڈتوں کو میرے خلاف بھڑکا دیا تھا اور چپے چپے پر میرے لیے جال پھیلا دیے تھے۔ جنھوں نے کلدیپ کے استھان تک پہنچنے کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔ میں اپنے کسی ارادے اور کسی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا چنانچہ بددلی سے ایک قافلے کے ساتھ گیارہ مہینے کا پیدل سفر کر کے تبت چلا گیا۔ کرپالا حسب سابق مروت اور مہربانی سے پیش آیا۔ پھر اس نے مجھے ریاضت اور قلب ماہیت کے لیے ایک برگزیدہ بھکشو مندا کے سپرد کر دیا۔ مندا نے مجھ پر بہت محنت صرف کی اور خصوصی توجہ دی۔ اس کی جاں لیوا تربیت نے میری مخفی قوتیں اجاگر کر کے مجھے ایک ناقابلِ تسخیر چٹان بنا دیا۔ جب میں فارغ التحصیل ہو گیا تو ایک روز اس نے مجھ سے ایک قتل، بلا دینے والی فرمائش کی۔ میں اس کا حکم ٹالنے کی جرات نہیں رکھتا تھا چنانچہ میں نے ایک وزنی پتھر سے اس کا سر پھاڑ کے اسے قیدِ حیات سے آزاد کر دیا اور اس کی وصیت کے مطابق اس کے خون سے غسل کیا۔ اس طرح وہ تمام شکتیاں مجھ میں منتقل ہو گئیں جو اس کی کل زندگی کی ریاضت کا نتیجہ تھیں۔ عظیم مندا کے تحفے نے مجھے طاقت ور بنانے کے ساتھ ساتھ مشتعل مزاج بھی بنا دیا تھا اس لیے جب میں واپس ہندوستان پہنچا تو جلد از جلد تزئین کے قرض سے سبکدوش ہو کر کلدیپ کے ساتھ شریفانہ زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھنے لگا لیکن بدری نرائن اپنی کمینگی سے باز نہیں آیا۔ اس نے قدم قدم پر میرے لیے رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ خون بہائے بغیر پُرامن طریقے سے یہ رکاوٹیں روندتا ہوا آگے بڑھ جاؤں لیکن دشمنوں کو یہ منظور نہیں تھا نتیجتاً وہ میرے اور انکا کے ہاتھوں ہلاک ہوتے چلے گئے۔ پے در پے پسپائی نے انھیں میرے خون کا پیاسا بنا دیا تھا مگر میں ان کی دسترس سے دور تھا اس لیے انھوں نے کھسیانی بلیوں کی طرح کھمبا نوچنا شروع کر دیا۔ بمبئی کے ایک پنڈت گوپال داس نے ایک معصوم لڑکی ناہید کو میری ہمدردی کے جرم میں اتنا مجبور کیا کہ وہ زندہ نہ بچتی لیکن میں نے بروقت پہنچ کر گوپال داس کو ٹھکانے لگایا اور ناہید کو طبی امداد کے لیے ایک مشہور ڈاکٹر سکسینہ کی کوٹھی میں لے گیا۔ علاج کے دوران میں انکا ڈاکٹر کی سرپرستی اور میں ڈاکٹر کی نوجوان لڑکی پریم کے ساتھ وقت گزاری کرتا رہا۔ میرے سراقبوں اور راز کی شفقتوں نے پریم کو میرا عقیدت مند بنا دیا وہ سگی بیٹی کی طرح میرا خیال رکھنے لگی۔ چند روز بعد جب ناہید شفایاب ہو گئی تو میں اسے اس کے گھر پہنچانے کے لیے گلبرگے گیا۔ اس کے باپ رکن الدین نے بچھڑی ہوئی بیٹی کو کلیجے سے لگا لیا اور میری مہمان داری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اس نے مجھے گلبرگے کے ایک مجذوب سید سے ملوایا۔ سید ایک پہنچا ہوا ملنگ تھا۔ اس کی ایک ہی عارفانہ نگاہ نے مجھے اس کا گرویدہ کر دیا۔ میں اس کی قربت سے فیض یاب ہونا چاہتا تھا مگر وہ چھلاوے کی طرح اچانک کہیں غائب ہو گیا۔ میں اس کی تلاش میں ایک مندر کی طرف جا نکلا۔ مندر کا پجاری آنند لال مجھے پہچان کر مجھ پر وار کر بیٹھا۔ اسے اپنے قدموں میں گرانا میرے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا پھر بھی میں نے اسے زندہ چھوڑ کے اپنا احسان مند کر لیا۔ انھی دنوں بمبئی پولیس کی درخواست پر نظام شاہی پولیس مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آگئی۔ انکا نے پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی پیش کش کی مگر میں نے اسے روک کے خود کو خاموشی سے پولیس کے حوالے کر دیا۔ نوجوان پولیس انسپکٹر سید غوث اچھا آدمی تھا۔ میرے قلندرانہ حلیے نے اسے میری طرف راغب کر دیا اور اس کے سوالات کے جواب میں جب میں نے اسے مختصراً اپنی سرگزشت سنائی تو وہ اس حد تک متاثر ہوا کہ اس نے بمبئی پہنچ کر مقدمے میں میری مدد کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مجھے بمبئی لے جایا گیا۔ بمبئی میں مجھ پر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا۔ یہ ہندوستانی تاریخ کا ایک عجیب و غریب مقدمہ تھا اور اپنی پُراسرار نوعیت کی بنا پر عوام سے مخفی رکھا گیا تھا۔ تزئین وہ اس بحیثیت ہندوستان بھر کے پنڈتوں پجاریوں نے میرے اور انکا کے خلاف دھواں دھار بیانات دیے اور مجھے پھانسی دلوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا لیکن گلبرگے کے پنڈت آنند لال نے میری حمایت میں بیان دیا۔ وہ اس کام کے لیے خاص طور پر بمبئی گیا تھا۔ سید غوث بھی آ پہنچا تھا اور میرے توسط سے پریم کے گھر مقیم تھا۔ اس عجیب و غریب مقدمے کا فیصلہ ایک انگریز جج کے ہاتھ میں تھا۔ فیصلے کے روز دکن کا مجذوب سید اچانک عدالت کے بند کمرے میں گھس آیا اور اپنی قلندرانہ دخل اندازی کی وجہ سے دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا پھر انگریز جج نے فیصلہ سناتے ہوئے اس نکتے پر مجھے باعزت بری کر دیا کہ چونکہ جمیل احمد خاں نے جو کچھ کیا وہ انکا کے پُراسرار وجود کے زیرِ اثر کیا اس لیے وہ بے قصور ہے۔

اس فیصلے نے دشمنوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور انھوں نے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے آنند لال کو قید کر لیا۔ میں اسے رہائی دلانے کے لیے پہنچا تو دھوکے سے مجھے بھی پھانس کے ایک تاریک ترین تہہ خانے میں قید کر دیا گیا جہاں ناقابلِ یقین جسامت کے خون خوار چوہوں نے مسلسل گیارہ مہینے تک مجھے موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا رکھا۔ اس عرصے میں ہری چرن نامی ایک پنڈت نے انکا کا جاپ کر کے اُسے اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور اس کی اعانت سے کنواری پریم کی جوانی داغ دار کر دی تھی۔ میں تہہ خانے سے باہر نکلا تو دنیا تاریک تھی لیکن مجھے اپنے متعلقین کے مفاد میں بہر حال زندہ رہنا تھا۔ آنند لال ان دنوں نالکہ آشرم میں میری دوستی کی کڑی سزا بھگت رہا تھا۔ میں نے لٹی ہوئی پریم اس کے دل شکستہ باپ اور سید غوث کو رکن الدین کے گھر منتقل کیا اور خود آنند لال کی دستگیری کے لیے چل کھڑا ہوا۔ آخر ایک لمبی مسافت اور کئی ہولناک معرکوں سے گزرنے کے بعد میں اسے اس جہنم سے نکال لایا۔ واپسی میں نالکہ آشرم کی ایک تراشیدہ اور زندہ مورتی مالا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ میں نے ان دونوں کو بھی رکن الدین کے گھر پہنچا دیا اور بمبئی میں پریم کے مجرم ہری چرن کو ڈرامائی حالات میں موت کے گھاٹ اتارتا ہوا اپنے گھر کلدیپ کے استھان پہنچ گیا۔ کلدیپ اور تزئین کی قربت میری گزشتہ تمام کلفتوں کا ماحاصل تھی مگر اس بار میں وہاں ٹھیرنے نہیں گیا تھا بلکہ کلدیپ اور تزئین کو اپنے ساتھ لانے گیا تھا۔ کلدیپ اب عزلت نشینی اور تقدس کی ایک ایسی دنیا میں پہنچ چکی تھی جہاں سے اس کا واپس آنا ممکن نہیں تھا۔ میں کہہ کہہ کر تھک گیا مگر وہ آنجہانی پریتم لال کی گدی چھوڑنے پر کسی طرح تیار نہ ہوئی۔ میں دل برداشتہ ہو کر صرف تزئین کو گلبرگے لے آیا اور ایک سلسلہ وار چار شادیوں کا اعلان کر دیا۔ میری دعوت پر چچا جان اپنے خاندان کے ساتھ لکھنؤ سے گلبرگے پہنچ گئے اور چند روز بعد تزئین کی شادی سید غوث سے، مالا کی شادی آنند لال سے، حمیدہ یعنی ناہید کی شادی میرے چچا زاد بھائی سے اور پریم کی شادی اس کے پارسی محبوب سہراب سے دھوم دھام کے ساتھ ہو گئی۔ سہراب کو بمبئی سے لانے کا سہرا انکا کے سر تھا۔ ان فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد میں آزادی سے اپنی زندگی کے آخری مشن کی تکمیل کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اب میں ہر قیمت پر دھرتی کو بدری نرائن کے بوجھ سے پاک کر دینا چاہتا تھا۔ انکا میری مونس و رفیق تھی۔ بدری نرائن میرے ارادے سے باخبر ہو کر ایک شہر سے دوسرے شہر فرار ہوتا پھر رہا تھا۔ میں اس کی تلاش میں مختلف شہروں کی خاک چھانتا ہوا لکھنؤ جا پہنچا۔ لکھنؤ میں نواب بتن علی خاں کی حویلی نظر آئی جس میں ان کی خوبصورت بہنیں درخشاں اور زرافشاں رہتی تھیں۔ مگر ان کی سرمستی اور سرپرستی سے انھوں نے مجھے پکارا اور میں بے اختیار ان کی دہلیز پر جا پہنچا۔ رحیق بتن نے حسبِ معمول میرے آڑے آنے کی کوشش کی لیکن وہ کوئی برگزیدہ جن نہیں تھا اس لیے مجھے روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں نے اسے محصور کر کے درخشاں اور زرافشاں کا مہکتا گلستانِ شباب چند ساعتوں میں اجاڑ کے رکھ دیا۔ وہ زخمی کبوتروں کی طرح پھڑپھڑاتی اور سسکتی ہی رہ گئیں۔ میں ماتھے کا پسینہ پونچھ کے انکا کے ساتھ باہر نکلا اور اس کے اکسانے پر اپنے جانے پہچانے بازارِ حسن میں پہنچ گیا۔ یہاں کے سب سے مرصع بالاخانے پر ایک رسیلی دوشیزہ سمن نغمہ سرا تھی اور حیدرآباد کا ایک فیاض رئیس سلامت جان اُسے داد و خراج دے رہا تھا۔ سلامت جان صاحبِ ذوق آدمی تھا اس لیے مجھے اس کا دوست بننے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ حیدرآباد لے جانے پر مصر ہو گیا۔ میں نے حامی بھر لی اور اس کے اشارے پر سمن کی بولی بھی لگا دی۔ نائکہ بڑی کائیاں تھی۔ اس نے انکار کر دیا اور سمن کو ہم سے بچا کے ایک بینچ کی گود میں ڈال دیا۔ میں ایک فیصلہ کر کے سلامت جان اور انکا کے ساتھ ریل میں آ بیٹھا۔ چند لمحوں بعد سلامت جان نے حیرت زدہ نگاہوں سے یہ کرشمہ دیکھا کہ نائکہ اور بینچ نے خود اسٹیشن پہنچ کر بڑی نیاز مندی سے سمن کو ہمارے حوالے کر دیا۔ اس واقعے نے سلامت جان کو اور زیادہ میرا گرویدہ بنا دیا۔ حیدرآباد پہنچ کے مجھے معلوم ہوا کہ سلامت جان کی حویلی کسی شہنشاہ کے حرم سرا سے کم نہیں ہے۔ وہاں ہندوستان بھر کی چنیدہ حسینائیں موجود تھیں۔ میں نے خارجی حالات سے بے نیاز ہو کر کچھ روز راجہ اندر کی طرح وہاں گزارے۔ میرے اور انکا کے تعاون سے سلامت جان کی جنت میں کچھ اور پھولوں کا اضافہ بھی ہوا۔ ایک روز سلامت جان کسی تقریب میں ایک حسین و جمیل رئیس زادی صبا کو دیکھ آیا اور ضد کرنے لگا کہ جس طرح بھی ممکن ہو میں اُسے لا کر سلامت جان کی محفل میں بٹھا دوں۔ چنانچہ میں ایک رات صبا کے شبستان میں جا پہنچا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے تڑپ کے ایک مشاق گدھ کی طرح ہاتھ بڑھایا مگر مجھے یکایک پیچھے ہٹنا پڑا کیونکہ دکن کا بے بدل مجذوب سید خلافِ توقع وہاں موجود تھا۔ [illegible] سے زیادہ سرخ نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے ندامت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور سید سے معذرت چاہی۔ گریزاں سید کا دامن تھام لینے کا یہ اچھا موقع تھا مگر اُس نے مجھے اس کی مہلت دیے بغیر طنز و حقارت سے کچھ کہا اور حسبِ عادت نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے کچھ سوچ کر صبا کو دبوچا اور سلامت جان کی حویلی میں لے آیا۔ میرا خیال تھا کہ صبا کی وجہ سے لامحالہ سید کو میرے پاس آنا پڑے گا اور میں اپنا کلیجا نکال کے اس کے سامنے رکھ دوں گا مگر افسوس میرا خیال خام ثابت ہوا۔ سید نہیں آیا۔ اُدھر سلامت جان میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر صبا کی خواب گاہ میں پہنچ گیا اور اس پر ہوس ناک دست درازی کرنے لگا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لمحوں میں اس کا دماغ الٹ گیا اور اس نے اپنی حویلی تمام ساز و سامان اور تمام حسیناؤں سمیت اپنے ہاتھوں سے جلا کے راکھ کر دی اور خود بھی جل کر بھسم ہو گیا۔ صبا پُراسرار طور پر غائب ہو گئی تھی اور مجھے انکا نے بچا لیا تھا۔ اس المیے نے مجھے کہیں کا نہ رکھا اور پاگلوں کی طرح در بدر بھٹکتا پھرا۔ اگر مجھے اپنے دیرینہ دوست بدری نرائن سے ایک فیصلہ کن ملاقات کی خواہش نہ ہوتی تو دیواروں سے سر پھوڑ کے کبھی کا مر گیا ہوتا۔ بدری نرائن میرے سامنے سے بھاگتا پھر رہا تھا۔ اس کی مرعوبیت کی بزدلی نے مجھ سے ملک کے چپے چپے کی خاک چھنوائی اور رحیق بتن نے مجھے انتقاماً فریبِ نظر میں مبتلا کرنے کے لیے جگہ جگہ بدری نرائن کی شبیہیں بکھیر دیں۔ میں جھنجلاہٹ میں کبھی یہاں دوڑتا کبھی وہاں۔ ایک مدت بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ بنارس میں موجود ہے اور اس کی پشت پناہی بنارس کا ایک مہان پجاری امر لال کر رہا ہے۔ میں بنارس پہنچا اور بدری نرائن سے میرا آمنا سامنا ہو ہی گیا۔ میں اسے چیونٹی کی طرح مسل کر پھینک دیتا مگر اس کے پشتیبان امر لال کے آگے میری اور انکا کی ایک نہ چلی۔ اب تک جتنے پنڈتوں سے میرا سابقہ پڑا تھا امر لال ان سب سے زیادہ طاقت ور شخص تھا۔ مگر میں جوشِ انتقام میں ایک موسے کی طرح اس شہباز پر جھپٹ پڑا جس کا نتیجہ میرے حق میں بے حد عبرت ناک ثابت ہوا۔ اس نے میری تمام قوتیں سلب کر لیں اور میں ایک اپاہج کوڑھی کی طرح کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا۔ لوگ مجھے ایک ڈھیر سے دوسرے ڈھیر پر منتقل کرتے رہے۔ میں غلاظت کا ایک حقیر کیڑا تھا جس پر لوگ تھوکتے تھے اور روندتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے۔ میں نے اس سے زیادہ ہلاکت آمیز اور اذیت ناک حالات کبھی نہیں بھگتے تھے۔ نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک چلا اور کب تک چلتا۔ آخر ایک روز انکا نے میری متعفن لاش گندگی کے انبار سے اٹھا کے کلدیپ کے پوتر استھان پہنچا دی۔

زندگی میں پہلی بار کلدیپ کے استھان آنا بے کار رہا کیونکہ کلدیپ کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ انکا بھی کوشش کے باوجود اس کے موجودہ مقام کا تعین نہ کر سکی۔ ناچار انکا نے جمیل احمد خاں کا بوجھ اٹھوا کے اسے بہتے ہوئے بدھ گیا میں پہنچا دیا اور خود باہر ٹھیر گئی۔ یہاں میرے دیرینہ دوست ناگرا نے تن دہی سے میری زبردست دیکھ بھال کی اور تبت کے بھکشو کرپالا نے عجیب ڈرامائی طریقِ علاج سے میرے زخم مندمل کیے۔ کرپالا ان دنوں فرشتۂ رحمت کی طرح اتفاقاً آ گیا تھا۔ شفایابی کے بعد میں نے باقی ماندہ زندگی یہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا اور ناگرا کے ساتھ ایک سال سے زیادہ مدت تک زہد و ریاضت میں غرق رہا۔ اب بدھ گیا سے باہر جانے کے لیے میرا جی نہیں چاہتا تھا۔ زندگی زہد و ریاضت میں سکون سے گزر رہی تھی کہ میں نے ایک روز خلافِ توقع آنند لال کو اپنے سامنے پایا۔ اس کا آنا خالی از علت نہیں تھا۔ ایک دہشت انگیز اور شرم ناک خبر اس کے ساتھ آئی تھی کہ میری بیٹی تزئین اغوا کر لی گئی ہے۔ اُسے میرے حریف جن بتن علی خاں کے ذریعے اٹھوا کر دلی لے گئے تھے۔ اس صورت میں میرے لیے گیا میں ٹھیرے رہنا دوبھر تھا۔ میں ناگرا اور بدھ بھکشو کو اطلاع دیے بغیر آنند لال کے ساتھ فوراً باہر نکلا۔ وہاں انکا بھی منتظر تھی۔ ہم نے کسی تاخیر کے بغیر سفر شروع کر دیا۔ راستے میں جب لکھنؤ کا اسٹیشن آیا تو میں نے اچانک اپنا سفر ملتوی کر دیا اور رات کے سناٹے میں شہر میں داخل ہو گیا۔ میرا رخ بتن علی کی حویلی کی طرف تھا۔ وہاں میں نے بتن علی خاں کی اجاڑ حویلی میں متعین جنات سے ایک ہنگامہ خیز معرکہ کر کے درخشاں زرافشاں کو یرغمال بنا لیا اور جوشِ غضب میں حویلی جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دی۔ انکا نے میرے لیے ایک گاڑی فراہم کی جس میں ہم لکھنؤ سے بریلی تک گئے۔ بریلی سے گاڑی میں بیٹھ کر دلی آ گئے۔ درخشاں زرافشاں سہمی ہوئی ہرنیوں کی طرح ہمارے ساتھ تھیں۔ ہم پر لوگوں کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔ ایک غنڈے شبن خاں نے [illegible] پیچھا کرنا اور آوازے کسنا شروع کر دیا۔ میں نے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی کیونکہ لڑکیوں کو رکھنے کے لیے مجھے کوئی محفوظ جگہ چاہیے تھی۔ شبن خاں ہمیں اپنے اڈے لے گیا۔ وہاں کئی شہدے جمع تھے جو لڑکیوں کو دیکھتے ہی اصلیت پر اتر آئے۔ شبن خاں بھی ان کا ساتھ دینے لگا۔ انھیں سیدھی راہ پر لانے کے لیے مجھے ایک دلچسپ ہنگامے سے گزرنا پڑا جس کے باعث شبن خاں اور اس کے ساتھی بولائے بھوتوں کی طرح مجھ سے عقیدت کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے لڑکیوں کو شبن خاں کی نگرانی میں دیا اور خود انکا اور آنند لال کو لے کر آندھی اور طوفان کی طرح اس ویران اور شکستہ حویلی میں پہنچا جہاں تزئین مقید تھی۔ سب سے پہلے ایک بوڑھا جن ہمارے راستے کی دیوار بنا۔

بوڑھے جن نے کرختگی سے خبردار کیا کہ آگے بڑھنا خطرناک ہوگا لیکن میں غیظ و غضب میں اپنی صلاحیتوں سے اُن کا غیر مرئی حصار توڑ کے آخند لال اور انکا سمیت آخر اندر پہنچ گیا۔ وہاں جنوں کی ایک بھاری تعداد ہماری پذیرائی کے لیے موجود تھی۔ انھوں نے میری بیٹی تزئین کو بتن علی کے ساتھ ناقابلِ بیان حالت میں گھیر رکھا تھا۔ تزئین کو چھڑانے کے لیے مجھے اپنی تمام ذہنی، نفسی اور روحانی قوتیں مجتمع کر کے ایک زبردست معرکہ سرانجام دینا پڑا۔ رفیق میری آمد سے پہلے ہی فرار ہو چکا تھا اس لیے میں نے بتن علی مردود کو اسی طرح نیم مُردہ حالت میں چھوڑ کے بے ہوش تزئین کو تحویل میں لے لیا اور جنات کو آخری تنبیہ دے کر باہر نکل آیا۔ ہم ابھی زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ تزئین ایک اذیت ناک جھرجھری کے ساتھ اچانک بیدار ہو گئی کیونکہ رفیق موقع پا کر اُس کے بدن میں حلول کر گیا تھا۔ میں کلیجا تھام کے رہ گیا۔ رفیق سے گلو خلاصی کے لیے تزئین کو شدید کرب اور جسمانی تکلیف سے گزرنا لازمی تھا۔ یہ بات میری برداشت سے باہر تھی پھر بھی میں نے کلیجے پر پتھر رکھ کر کچھ عمل پڑھے جن کا ردِعمل اتنا خوف ناک ثابت ہوا کہ مجھے پیچھے ہٹنا پڑا۔ قریب تھا کہ میں مایوسی میں اپنا گلا گھونٹ لیتا کہ یکایک کلپنا خود دار ہوئی اور اُس نے بڑے ڈرامائی انداز میں رفیق کو لمحوں میں وہاں سے دفع کر دیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لے کے آخند لال اور تزئین کو فوراً بمبئی پہنچنے کی ہدایت کی نیز انکا کو احتیاطاً تزئین کے سر پر بھیج دیا۔ پھر میں درخشاں، زر افشاں کو لینے کے لیے سیدھا شبتن خاں کے اڈّے پہنچا۔ وہاں نقشہ ہی الٹ گیا تھا۔ پولیس کے غیر متوقع چھاپے نے قمار خانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ یہ سب کچھ درخشاں، زر افشاں کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں بھیڑ اور پہرا چیرتا ہوا بہ بڑی مشکل سے اندر پہنچا تو ایک دلچسپ انکشاف نے بڑھ کر میرے قدم چومے۔ شبتن خاں نے لڑکیوں کے متعلق میرے استفسار پر شدید حیرانی سے کہا۔ "اُستاد! ابھی تو انھیں یہاں سے لے گئے تھے۔" میں سمجھ گیا کہ یہ کس کی کارستانی ہے؟ رفیق جمیل احمد خاں بن کر انھیں لے اڑا تھا۔ میں نے شبتن خاں کو اُس کی تباہی پر دلاسا دیا اور اُس کی مدد کے لیے جلد پہنچنے کا وعدہ کر کے لڑکیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ لڑکیاں تو دتی کے ایک نواحی گاؤں میں ایک بڑھیا کے گھر سے برآمد ہو گئیں لیکن رفیق میری بُو سونگھ کے وقت سے پہلے ہی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ میں اُس پر لعنت بھیج کے درخشاں اور زر افشاں کے ساتھ گلبرگہ کے لیے ریل میں سوار ہو گیا۔ راستے میں اُن کے سامنے میں نے اپنا دل کھول کے رکھ دیا۔ اس طرح اُن کی جھجک اور شکایت دُور ہو گئی۔ جب ہم گلبرگہ پہنچے تو نیک دل رکن الدین نے انھیں حسبِ عادت اپنی بیٹیوں کی طرح قبول کیا۔ تین چار روز بعد بلائے جانی انکا بھی آ دھمکی۔ میں نے اُس کی معیت میں اپنی کلدیپ کے امتحان جانے کے لیے بڑے ارمانوں سے سفر کا آغاز کیا لیکن راستے میں منتقی انکا نے پھر ایک خبر سنا کے میرا رُخ تبدیل کروا دیا۔ اُس نے بتایا کہ میرا بدترین دشمن بدری نرائن آج کل کلکتے کے ایک گاؤں میں اکیلا ہے کیونکہ اُس کا پشت پناہ امرلال کسی مخصوص جاپ کے لیے ونددھیاچل چلا گیا ہے۔ یہ کوئی خبر نہیں تھی۔ میں بیچ سفر میں ایک جھٹکے سے ویران اسٹیشن پر اُتر گیا۔

یہ ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ گاڑی چنگھاڑتی ہوئی چلی گئی تو اسٹیشن سناٹے میں ڈوب گیا۔ دُور سے مجھے روشنی کا ایک نقطہ ٹمٹماتا نظر آیا۔ اسٹیشن کا کوئی عہدے دار لالٹین سنبھالے تفتیشِ حال کے لیے اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا، پھر وہ روشنی بھی معدوم ہو گئی اور رات کو ٹرٹرانے اور رینگنے والی آوازوں کی سوگواری بھی تاریکی میں شامل ہو گئی۔ کوئی رات ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ میرا بس چلتا تو ان آوازوں کا گلا دبا دیتا۔ یوں بھی دورنِ جسم کچھ کم شور نہیں ہو رہا تھا۔ یہ آوازیں اس پر مستزاد تھیں۔ بدھ گیا میں سکون اور قناعت کا جو خول میرے جسم پر چڑھ گیا تھا، انکا نے بدری نرائن کا ذکر کر کے اُسے پھر کھرچ دیا تھا۔ غصے نے میرا سارا وجود لرزا دیا تھا۔ میں اندھیرے میں اسٹیشن کے پچھے پلیٹ فارم کی ایک بنچ پر دراز ہو گیا۔

"اب گاڑی کب آئے گی؟" میں نے انکا سے پوچھا

انکا میرے اشتعال سے سہمی ہوئی تھی۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "گاڑی آنے میں خاصی دیر ہے لیکن مال گاڑیاں یہاں سے گزرتی رہتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے جو گاڑی بھی پہلے آجائے گی ہم اسی میں سوار ہو جائیں گے، چاہے وہ مال گاڑی ہی کیوں نہ ہو۔"

"مال گاڑی میں تمھیں تکلیف ہوگی، اچھا ہے تم سو جاؤ، جب سواری کی گاڑی آئے گی، میں تمھیں جگا دوں گی۔" انکا نے شفقت کے انداز میں مشورہ دیا۔

"تکلیف؟" میں نے زہرخند سے کہا۔ "کیا اب تک تکلیف اور راحت کا کوئی احساس باقی رہنا چاہیے؟ کیا میں کوئی انسان رہا ہوں؟"

"تم جو کہتے ہو، سچ ہے، مال گاڑی آئے گی تو تم مویشیوں کے ساتھ بیٹھ جانا۔" انکا نے تنک کے جواب دیا اور خاموش ہو گئی۔

میں نے ٹوٹی ہوئی بنچ پر اپنے جسم کا تناؤ دُور کرنے کی کوشش کی لیکن غصے میں ایک منزل ایسی بھی آتی ہے جہاں اُسے کم کرنے کے بجائے فزوں کرنے کو دل چاہتا ہے۔ میں اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ رات خاموشی سے بہہ رہی تھی، نہ معلوم یہ کون سا اسٹیشن تھا؟ میں اپنے اندر پیچ و تاب کھاتا ہوا اس کنارے سے اس کنارے تک چل رہا تھا۔ آخر تھک کر پھر بنچ پر دراز ہو گیا۔ اس خنک رات میں آنکھوں میں سوزش سی ہونے لگی تھی۔ مچھروں کے ایک غول نے میرے سر اور چہرے پر منڈلانا شروع کر دیا۔ انکا سر پر بیٹھی پھونکیں مار رہی تھی۔ میں نے ہاتھ نہیں ہلایا کیونکہ چھوٹے موٹے کیڑے جسم پر اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔ جسم زہر کا عادی ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد انکا نے مال گاڑی آنے کی خبر دی اور میرے سر سے اتر گئی۔ اسٹیشن پر یہ لمبی ٹرین میری ہی وجہ سے ٹھیری تھی۔ تمام ڈبوں پر سیل لگی ہوئی تھی اور جو ڈبے کھلے ہوئے تھے ان میں لوہے کی سلاخیں دھری تھیں۔ میں نے ایک ڈبے کی سیل توڑ دی اور اندر داخل ہو گیا۔ اس میں لکڑی کی پیٹیوں میں مال بھرا ہوا تھا لیکن میرے ٹھیرنے کے لیے گنجائش کافی تھی۔ میرے بیٹھتے ہی گاڑی روانہ ہو گئی اور جیسے ہی گاڑی چلی انکا میرے سر پر وارد ہو گئی۔

"گاڑی واپس بمبئی جا رہی ہے۔" انکا نے محبت سے میرے بال کھینچتے ہوئے کہا۔

"اب تم مجھے بمبئی اسٹیشن پر ہی جگانا۔ میں یہاں سمادھی لگائے

بیٹھتا ہوں، تم چاہو تو سو جاؤ۔"

"میں ویسے بھی خاموش رہوں گی۔ اطمینان رکھو۔"

میں کلدیپ سے ملنے جا رہا تھا۔ ارادہ تھا کہ اسے صرف ایک نظر دیکھ لوں۔ شبّن خاں کی رہائی کے لیے دلّی روانہ ہو جاؤں گا جب بھی کلدیپ سے ملنے کی آس بندھتی، کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور پیش آ جاتا اس بار کلدیپ کی تمام تر بے نیازیوں کے باوجود اسے دیکھنے کی خواہش نے کچھ ایسی شدت اختیار کی تھی کہ مجھے خود پر قابو نہیں رہا تھا۔ البتہ بدری نرائن کی سرکوبی کی خواہش اس سے زیادہ شدید تھی۔ اس کے سامنے تمام ارادے سرد پڑ گئے۔ شبّن خاں جیل میں سڑ رہا ہوگا۔ میں پھر اپنی زندگی کی سب سے مشکل مہم پر روانہ ہو رہا تھا۔ نہ جانے کتنے پنڈت پجاری میرے ہاتھوں سے مارے گئے تھے۔ جن لوگوں کا خون میرے سبب سے ہوا تھا۔ اب ان کی تعداد بھی مجھے یاد نہیں تھی۔ مگر بدری نرائن کوئی ایک شخص نہیں تھا۔ اس نے اپنے گرد اَن دیکھی طاقتوں کا جال بُن لیا تھا۔ کبھی وہ کال کے مندر میں روپوش ہو جاتا، کبھی اسے دو موسموں کے لیے کالی کی پناہ مل جاتی۔ کبھی کوئی بڑا پنڈت اس کی پشت پناہی کے لیے آ جاتا تھا۔ اس کا نام آتا تو مجھے اپنے جسم کی بے شمار جگہوں پر ٹیسیں محسوس ہونے لگتیں۔ میرا جسم دکھنے لگتا۔ میری تلخیاں بدری نرائن کے نفرت انگیز وجود کے خیال سے سلگنے لگتیں اسے ختم کرنے کے لیے میں نے دربدر کی خاک چھانی اور مجھے شکست نصیب ہوئی۔ وہ ہر بار فتح مند ثابت ہوا۔ وہ ہر بار میری زد سے نکل گیا۔ اِنکا کی باتوں کا سچ جاننے کے لیے میں گاڑی میں اِنکا میں مستغرق ہو گیا۔ میرے باہر ہر طرف اندھیرا تھا لیکن اندر روشنی ہی روشنی تھی۔ مجھے وہ مکان صاف نظر آ رہا تھا جہاں بدری نرائن مقیم تھا۔ اس کی طرف جانے والے تمام راستے بھی روشن نظر آ رہے تھے۔ درمیان میں کوئی دیوار حائل نہیں تھی۔ اِنکا کی اطلاع کے مطابق امر لال وندھیاچل کی پہاڑیوں پر گیان دھیان کرنے چلا گیا تھا اور بدری نرائن امر لال کے ایک چیلے بھگوان داس کے ہاں مقیم تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ کہیں میری آمد سے باخبر نہ ہو جائے۔ چنانچہ میں نے اپنی سمتوں سے اُسے لاعلم رکھنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کر لیں۔ ڈبے میں صابن، اگربتی اور عمدہ لکڑی کی بو پھیلی ہوئی تھی اور میں اپنے آپ میں ضم ہو گیا تھا جب میرا الحاق میرے باطن سے ہوتا تھا تو مجھے باہر کی خوشبوؤں اور آوازوں کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ بمبئی کے قریب اِنکا نے میرے سر میں اپنے پنجے چبھوئے تو میں حواس میں آیا۔ مال گاڑی اسٹیشن سے دُور ٹھہر گئی تھی۔ میں لائنوں پر اُتر گیا۔ رات پر نزع کا عالم طاری تھا۔ میں لائنوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اسٹیشن پہنچ گیا۔ اسٹیشن صبحِ کاذب کے وقت بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ سید غوث اور تزئین اسی شہر میں رہتے تھے اور میں چند گھنٹے پیشتر ہی ان سے جدا ہوا تھا۔ اُس وقت میری طبیعت میں کسی جھیل کا سا ٹھیراؤ تھا مگر اب میرے سینے میں ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن تھا۔ آدمی بھی کیا چیز ہے؟ وہ ہمیشہ اپنے دنوں، خود سے متعلق اشیا اور اپنے رشتوں اور رابطوں ہی کا پابند رہتا ہے۔ یہ تمام سلسلے آدمی کی مشین کے بٹن ہیں، اسے جس طرح دبا دیتے اسی طرح کا ردِ عمل ظاہر ہوگا۔ اِنکا نے میری نفرت اور غضب کا بٹن دبا دیا تھا۔

صبح آٹھ بجے تک میں بمبئی سنٹرل اسٹیشن کی انتظار گاہ میں کلکتے جانے والی گاڑی کا انتظار کرتا رہا۔ عین وقت پر اِنکا نے میرے سر پر ٹھوکا دیا۔ میں فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں جا کے بیٹھ گیا۔ یہاں پہلے ہی ایک جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ اس جوڑے نے میری آمد پر کسی قدر خفگی اور گھبراہٹ کا اظہار کیا۔ میں خود وہاں سے واپس ہونا چاہتا تھا لیکن گاڑی چل پڑی تھی۔ میں نے مہذب لہجے میں ان سے معذرت چاہی۔ لڑکی بے حد حسین تھی اور نرم دل معلوم ہوتی تھی۔ وہ میری معذرت اور بھاری بھرکم لہجے سے متاثر ہو گئی۔

تزئین نے چلتے وقت ایک سوٹ کیس تیار کر دیا تھا جس میں میرے لیے چند کُرتے پاجامے تھے اور شیروانیاں رکھی تھیں۔ اس وقت میرا لباس خاصا معقول تھا۔ پاؤں میں جوتے بھی اچھے تھے۔ شیو بھی بنا ہوا تھا لیکن سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ شکل و صورت سے میں کوئی غیر معمولی شخص نظر آتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ہمسفر میری موجودگی سے ہراساں ہیں۔ کبھی لڑکی لڑکے کی طرف دیکھتی تھی، کبھی لڑکا لڑکی کی طرف دیکھتا تھا۔ تھوڑی دیر میں ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ لڑکی اپنے والدین سے جُدا ہو کر اپنے محبوب کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ لڑکا اس بات سے پریشان تھا کہ اُسے راستے میں پکڑ نہ لیا جائے۔ انھوں نے چوری چھپے شادی بھی کر لی تھی جب والدین اس شادی پر رضامند نہ ہوئے تو انھوں نے بمبئی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اِنکا مجھے چپکے چپکے لڑکی اور لڑکے کے بارے میں بتاتی رہی۔ ان کے عشق میں فریب کی کوئی آمیزش نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے ان پر پیار آنے لگا۔ میں وہ ڈبا چھوڑ دیتا مگر میں نے ان کی حفاظت کے لیے وہیں ٹھیرنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "میرے

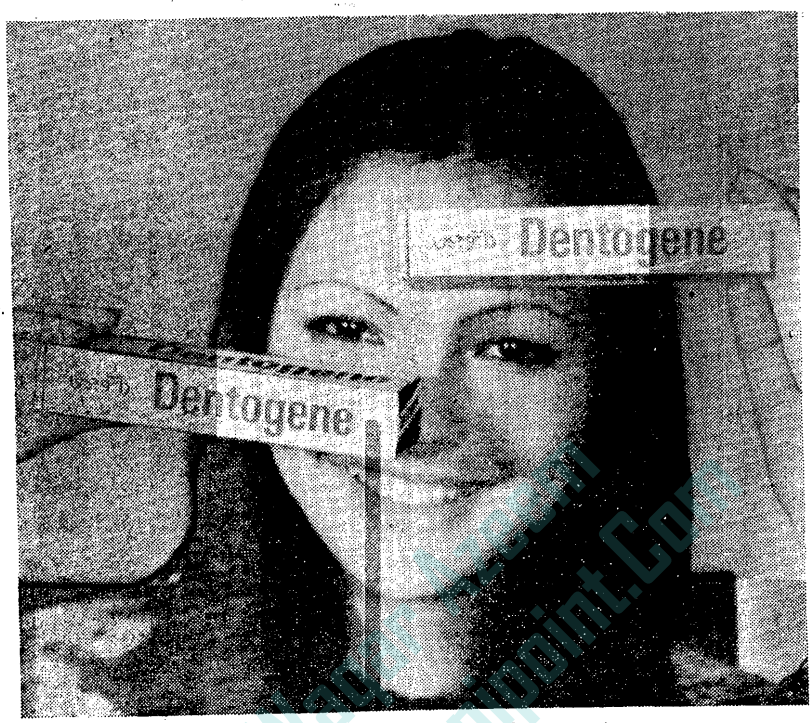

نیا طرزِ زندگی - نیا لطفِ حیات

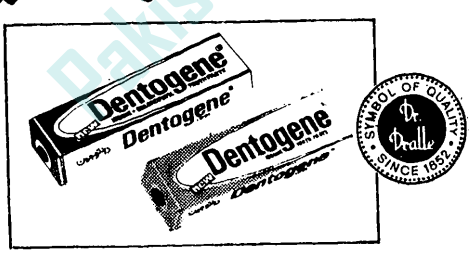

اور نیا ڈینٹوجین ٹوتھ پیسٹ
(دانت خوشنما - مزا خوشگوار)

MNJ

بچو! میں یہاں سے چلا جاتا۔ تمہیں تنہائی کی ضرورت ہے لیکن تمہیں شاید میری ضرورت پیش آئے اس لیے میں یہاں ٹھیر گیا ہوں۔"

میرے شفیق لہجے پر لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ادب سے بولی۔ "بابا۔ آ، آپ ہمارے بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

"میں کیا جانتا ہوں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "ارے بچو! میں کیا نہیں جانتا؟ میں جانتا ہوں کہ تم دونوں پریمی ہو، تمہیں اپنا من اور گھر بسانے کی اجازت نہیں ملی تو تم نے اپنے گھر چھوڑ دیے۔ تمہارے ماتا پتا بہت بیاکل ہیں۔"

"بابا ——" ان دونوں کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ انھوں نے دوڑ کر میرے پیر پکڑ لیے۔ "بابا ہمیں شرن دیجیے۔"

میں نے ان دونوں کو اپنے پیروں سے اٹھایا۔ وہ میری برتھ پر میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ میں ان کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ "ہم مجبور ہو گئے تھے، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔"

"میں تمہیں برا نہیں کہہ رہا ہوں مگر بچو! زندگی بڑی بری چیز ہے، تمہیں اس کا تجربہ نہیں ہے، آخر تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے ان دونوں کے شانوں پر ہاتھ رکھ کے پوچھا۔

"ہم اپنے ماتا پتا سے بہت دور کلکتے جا رہے ہیں۔" لڑکی نے معصومیت سے جواب دیا۔ "سریش انگلینڈ سے پڑھ کر آئے ہیں۔ کلکتے میں ان کے کئی دوست ہیں۔ میں بھی گریجویٹ ہوں۔ میں کسی اسکول میں پڑھانے لگوں گی۔"

مجھے اس کی معصوم باتیں بہت اچھی لگیں اور میں نے انھیں زمانے کے نرم و گرم کے بارے میں سنجیدگی سے سمجھانا شروع کر دیا۔ لڑکی کا نام انوپا تھا۔ بات چیت سے بھی وہ کسی اچھے خاندان کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ "تمہارے پاس روپے بھی بہت کم ہیں۔ یہی کوئی ڈیڑھ ہزار روپے۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "اور کلکتہ بہت بڑا شہر ہے۔ اگر کسی نے وہاں تمہارا ساتھ نہ دیا تو تم کیا کرو گے؟"

وہ دونوں چونک کر میری طرف دیکھنے لگے۔ "بابا آپ سب کچھ جانتے ہیں۔"

"ہاں، کیوں نہیں۔" میں نے اعتماد سے جواب دیا۔

"تو پھر ہمیں مشورہ دیجیے، ہم کیا کریں؟" نوجوان سریش نے مچل کے پوچھا۔ اس کے چہرے سے حیرت ہویدا تھی۔

"کاش میرا کوئی گھر ہوتا تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلتا مگر میں ایک بے گھر شخص ہوں۔ تمہیں صرف مشورہ دے سکتا ہوں۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"آپ کو گھر کی کیا ضرورت ہے، بھگوان کے لیے ہماری مشکلیں حل کیجیے۔" انوپا نے اس طرح کہا جیسے مجھ پر اس کا حق ہے۔ وہ میری منتیں کرنے لگی۔

"ٹھیرو، ٹھیرو۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مجھے سوچنے کا موقع دو، پیارے سریش اور پیاری انوپا! میں اوپر کی برتھ پر جاتا ہوں، تم میری موجودگی سے بے خبر ہو کے یہاں ایک دوسرے کے بارے میں باتیں کرو۔"

"مگر آ۔ آپ۔" انوپا نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

"میں یہیں موجود ہوں۔" میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے اسے اطمینان دلایا اور اوپر کی برتھ پر چڑھ گیا۔ دیر تک مجھے ان کی آواز نہیں آئی۔ پھر ان کی دبی دبی سرگوشیاں ابھریں۔ وہ میرے متعلق باتیں کر رہے تھے اور انکا مجھ سے گفتگو کرنے میں محو تھی۔ انکا کو خاموش کر کے میں بے سدھ ہو گیا تھا۔ اوپر کی برتھ پر جیسے میری لاش پڑی تھی اور گاڑی تیزی سے کلکتے کی جانب رواں تھی۔

دوپہر کے قریب گاڑی ٹھیری ہوئی تھی کہ دروازے پر دھپ دھپ کی آوازیں آنے لگیں۔ ابھی تک کسی مسافر نے اس ڈبے میں آنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ انکا نے مجھے جگایا۔ "باہر پولیس تمہارے ان سفری رفیقوں کی منتظر ہے۔"

"پولیس؟" میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"ہاں۔ انوپا کے پتا نے تمام بڑے اسٹیشنوں پر اطلاع کرا دی ہے۔" انکا نے ٹھنک کے کہا۔

میں چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر میں نے انوپا سے کہا۔ "دروازہ کھول دو انوپا۔"

انوپا نے جھجک کے ساتھ دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ دروازہ کھلا تو ایک انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ نظر آیا۔ سریش اور انوپا کو دیکھ کے اس کے ہونٹوں پر رعونت کی ایک لہر گزر گئی۔ "معاف کیجیے۔" اس نے مصنوعی شائستگی سے کہا۔ "کیا آپ ہماری مدد کریں گے؟"

"کس قسم کی مدد؟" سریش نے گھبرا کے پوچھا۔

"کچھ معلومات درکار ہیں۔" انسپکٹر نے ڈبے کے اندر گھس کے ایک طائرانہ نظر ڈالی اور مجھے بطور خاص گھور کے دیکھا۔

"فرمائیے، ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟" سریش نے مہذب

لہجے میں دریافت کیا۔

"آپ کا نام؟" انسپکٹر نے خشونت سے پوچھا۔

"میں، میرا نام رام چند ہے۔"

"یہ آپ کی دھرم پتنی ہیں؟"

"ہاں۔" سریش کے لہجے میں اضطراب تھا۔

انسپکٹر نے کچھ اور معلومات کر کے ان سے سامان کی تلاشی کے لیے کہا۔ سامان میں میرج سرٹیفکیٹ رکھا ہوا تھا۔ میں اب تک خاموش رہا تھا۔ انسپکٹر سریش اور انوپا کے جوابات سے لطف لینے لگا تھا مگر اسے اب تک یقین نہیں تھا کہ یہی وہ جوڑا ہے جس کی اسے تلاش ہے۔ عموماً فرسٹ کلاس کے مسافروں کے ساتھ پولیس کا رویہ ایسا نہیں ہوتا۔ انسپکٹر بتدریج سختی اختیار کرتا جا رہا تھا۔ جب سامان کی تلاشی کی بات آئی تو میں نے کروٹ لی اور ایک انگڑائی لے کے اپنی نشست پر کسمسانے لگا۔

"بچو! اسے بتاؤ کہ تمہارے بزرگ اوپر بیٹھے ہیں اور اس سے کہو کہ وہ تہذیب کے دائرے میں رہ کے بات کرے۔" میں نے اوپر لیٹے لیٹے کہا۔

"یہ کون بدزبان ہے؟" انسپکٹر ایک دم بھڑک اٹھا۔

"یہ ہمارے بابا ہیں۔" اس بار انوپا نے ہمت سے جواب دیا۔

"بابا — کیا یہ تمہارے پتا جی ہیں؟"

"ہاں۔" انوپا جھجک کے بولی۔

انسپکٹر یقین کرنے نہ کرنے کی حالت میں مبتلا رہا۔ اس کا میرے سر پر مضطرب تھی۔ میں نے اسے روک کے رکھا تھا۔ "میں تمہارے سامان کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔" انسپکٹر نے جھلا کر کہا۔ "میرے ساتھ تعاون کرو۔"

"ہم اپنی چیزیں غیروں کو نہیں دکھاتے۔" میں نے اوپر کی برتھ سے جواب دیا۔ "تمہیں معزز لوگوں سے بات کرنے کی تمیز آنی چاہیے۔"

"بڑے میاں نیچے اترو، یہ کیا اوپر سے بکواس لگا رکھی ہے۔" انسپکٹر نے گرج کر کہا۔ "میں تم سب کو عدم تعاون کی بنا پر گرفتار کر سکتا ہوں۔"

میں اتر کر نیچے آ گیا۔ انوپا اور سریش صورت حال کے بگڑ جانے کے خدشے سے سہمے ہوئے تھے۔ "یہ سامان ہے۔" میں نے ان دونوں کے سوٹ کیس اس کے سامنے ڈال دیے۔ "لے کھول لے۔" میں نے جلال کے عالم میں کہا۔

انسپکٹر میری قہر آلود نظروں اور پر جلال لہجے کی تاب نہ لا سکا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا جسم تھرتھرا گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے

ساتھیوں کو حکم دیا۔ "چلو، یہاں سے واپس چلو، یہاں کچھ نہیں ہے۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے انوپا سے کہا۔ "دروازہ بند کر لو، میں اسی لیے تمہارے ساتھ ٹھیرا تھا۔"

"آپ تو کوئی اوتار ہیں، آپ نہ ہوتے تو ہماری بڑی رسوائی ہوتی۔" سریش نے پھر میرے پیر پکڑ لیے۔

"سریش! قسمت نے عجب انداز میں مجھے تم سے ملایا ہے۔ میں میسور جا رہا تھا کہ میں نے راستے میں ارادہ بدل دیا اور واپس بمبئی چلا آیا۔ اتفاق سے میرے قدم تمہارے ہی ڈبے کی طرف اٹھے۔ یہ تمہارے پریم کی سچائی تھی کہ اس نے مجھے کہاں سے کہاں کھینچ لیا۔ سچا پریم اسے کہتے ہیں۔ وعدہ کرو کہ تم انوپا کو ہمیشہ خوش رکھو گے۔"

سریش کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میں وچن دیتا ہوں۔"

گاڑی چل پڑی۔ انوپا میرے سرہانے بیٹھی تھی اور اس کے دل میں یہ شدید خواہش مچل رہی تھی کہ وہ میرا سر دبائے۔ میں نے اس کے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے۔ آہ اس کی نازک انگلیوں میں کیسی ٹھنڈک تھی۔ میں نے اسی وقت ایک فیصلہ کیا اور انکا سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ انکا میرے سر سے رخصت ہو گئی اور انوپا میرے بالوں میں عقیدت سے انگلیاں پھیرتی رہی۔ سریش میرے پائنتی بیٹھا تھا اور میں برتھ پر لیٹا ہوا تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ دل جذبات سے لبریز تھا۔ انکا خاصی دیر بعد واپس آئی۔ اس نے مجھے جو کچھ سنایا، میں اس سے مطمئن ہو گیا۔ کئی وقت ہم نے کھانا ایک ساتھ ہی کھایا۔ میں نے بمبئی میں تزئین اور سید غوث اور گلبرگے میں رکن الدین کا پتہ سریش کو دیا کہ وہ انھیں اپنے گھر سمجھ کے جب چاہے وہاں جائے اور

جب تک چاہے ٹھیرے۔ وہ میرے بارے میں پوچھتے رہے۔ اس جوڑے کی ہم سفری میں وقت کا پتہ نہیں چلا۔ میں زیادہ تر انھی میں منہمک رہا۔ کلکتے سے کچھ اسٹیشن پہلے جب انکا میرے سر پر نہیں تھی اور سریش اور انوپا اونگھ رہے تھے، گاڑی ایک جگہ ٹھیری۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ ایک شخص سراسیمہ سا بھاگتا ہوا میرے ڈبے میں آیا اور ایک وزنی تھیلا چھوڑ کر کہیں غائب ہوگیا۔ میں نے سریش اور انوپا کی نظریں بچا کر تھیلا اوپر کی برتھ پر لوٹ دیا۔ نوٹوں کی گڈیاں برتھ پر پھیل گئیں۔ یہ نوٹ ایک لاکھ سے کم کیا ہوں گے۔ میں نے گڈیاں جلدی جلدی برتھ کے اندر کی طرف دھکیل دیں اور گاڑی چلتے ہی خالی تھیلا کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

کلکتے کے قریب سریش اور انوپا اداس ہونے لگے تھے۔ میں رخصت ہونے والا تھا اور ان پر نئی زندگی کے خوف مسلط تھے۔ وہ میری برتھ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں نم تھیں۔ انکا بھی واپس آگئی تھی۔ میں نے انھیں گلوگیر لہجے میں مخاطب کیا۔ "سریش اور انوپا! اب میں تم سے رخصت ہو رہا ہوں۔ تم جہاں رہو گے مجھے علم رہے گا۔ تمھاری شادی پر تمھارے گھر والوں نے خوشی نہیں منائی لیکن تم نے مجھے بابا کہا ہے۔ تم سدا سکھی رہو۔ میں نے تمھارے لیے اپنی طرف سے جہیز کا انتظام کیا ہے۔" یہ کہہ کے میں اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے اوپر کی برتھ سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کے ان کے حوالے کرنا چاہیں۔ ان کے چہروں پر حیرت اور مسرت سے ایک رنگ آتا تھا، ایک جاتا تھا۔ ان کی زبانیں ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ کبھی وہ منع کرتے تھے، کبھی میرا ہاتھ چومتے تھے۔ میں اس کیفیت کا حال بیان نہیں کرسکتا۔ خود میری آنکھوں میں خوشی ہی خوشی بھری ہوئی تھی۔

"آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟" انوپا اور سریش نے ایک ساتھ کہا۔

"میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔" میں نے انوپا کے سر پر دھپ مارتے ہوئے کہا۔ "کیا تمھیں کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں۔ مگر یہ بہت ہیں بابا، ہم ان کا کیا کریں گے؟"

"تم پہلے ایک بڑے ہوٹل میں ٹھیرو گے۔ پھر عمدہ سا مکان تلاش کرو گے۔ پھر سریش چاہے گا تو کوئی کاروبار کرے گا یا مزے سے انھیں اڑائے گا اور ملازمت کرے گا۔ تم راج کرو گی۔" میں نے سرشاری میں کہا۔

"اوہ بابا، آپ بڑے دیالو ہیں، بابا! آپ بھی ہمارے ساتھ رہیں۔" انوپا نے بچوں کی طرح مچل کے کہا

"تم پگلی ہو، کبھی بابا بھی اپنی بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں؟" میں نے اس کے رخسار پر ہلکی سی چپت لگائی۔

انھوں نے میرے اصرار پر نوٹ جلدی جلدی اپنے سوٹ کیسوں میں ٹھونسے اور عقیدت سے میرے قریب بیٹھ گئے۔ کلکتہ اسٹیشن پر ان سے وداع کا منظر بڑا رقت انگیز تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں کے رفیق چھوٹ رہے ہوں۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئے تو مجھ پر بھی یاسیت اور نامرادی نے غلبہ پا لیا اور میں انھیں دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ انکا بھی مرجھا گئی تھی۔ کلکتہ اسٹیشن پر تنہا کھڑے ہوئے مجھے اکیلے پن کا شدید احساس ہوا۔ میں جیسے گہری نیند سے چونک گیا — بدری نرائن، ہاں وہی موذی بدری نرائن! مجھے اس کمینے کے استھان پر روانہ ہونا تھا۔ میں اسٹیشن سے باہر آگیا اور شہر سے دور ایک نواحی آبادی میں داخل ہوا۔ یہ ایک نیم شہری علاقہ تھا۔ جھونپڑیوں اور کچے مکانوں کی اس بستی میں داخل ہوتے ہی میرے اعصاب میں کشاکشی ہونے لگی۔ میں محتاط انداز میں اپنا محاصرہ کرتا ہوا اس مکان کے قریب ہو رہا تھا جہاں وہ شیطان بدری نرائن ٹھیرا ہوا تھا۔ شیطان نے اپنے تعاقب میں میرے اوسان خطا کر دیے تھے۔

بستی میں کسی نے میری طرف مشکوک نظروں سے نہیں دیکھا، اب تک تمام راستہ بخیر و خوبی گزر گیا تھا۔ بستی کے ایک سرے پر چھوٹے چھوٹے مندروں کا سلسلہ تھا جن کے کلس ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر میں سرگرداں معلوم ہوتے تھے۔ اسی کے قریب بھگوان داس کا دو منزلہ پختہ مکان دور سے نظر آ رہا تھا۔ میں نے ایک درخت کے نیچے بنے ہوئے مٹی کے صاف چبوترے پر ڈیرا جما دیا۔ انکا بھی خلافِ معمول گم سم بیٹھی تھی۔ میرے لیے آگے جانے سے پہلے احتیاطاً اپنے سامنے کے علاقے کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ میں آنکھیں نہیں بند کرسکا کیونکہ جب میں نے استغراق کے لیے انھیں بند کرنا چاہا تو وہ حیرت سے خود بخود کھل گئیں۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ حقیقت تھی۔ میں نے پریشانی کے عالم میں انکا کی سمت سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ وہ بے قراری سے میرے سر پر پہلو بدل رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ میری باطنی آنکھوں نے جس حیرت انگیز منظر کا نظارہ کیا ہے، انکا کی سحر کار نظر نے بھی اسے دیکھ لیا ہے مگر انکا اب اسے بیان کرنے سے کترا رہی ہے۔ اس کے انداز میں ندامت تھی۔ آنکھوں میں شرمندگی اور حقیقت کا یہ تاثر مجھ پر ترس کھانے کے سوا کسی اور سبب سے نہیں تھا۔ انکا کی کوئی غلطی

نہیں تھی، خود میں نے میسور اور بمبئی کے راستے میں اطمینان کر لیا تھا۔ راستہ بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ اب کیا ہوا؟ بدری نرائن کو کیسے خبر ہو گئی کہ میرا رُخ اس طرف ہے اور کس نے یہ فصیل تعمیر کر دی ہے؟ یہ جو ایک پُراسرار چادر تنی ہوئی ہے یہ کسی مہان سادھو کی شکتی کا کرشمہ ہے؟ امرلال کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ مگر امرلال کی موجودگی کے یہاں کوئی آثار نظر نہیں آتے، وہ خود مدھیا چل میں ہے۔ پھر کس نے یہ سنگلاخ دیوار کھڑی کر دی ہے؟ کس نے میری بُو سونگھ لی اور پیش قدمی کی؟ کیا میں پھر ناکام واپس چلا جاؤں؟

کیا میں اسی طرح نادم ہوتا رہوں؟ وہ شخص جو تبت کے راہب سندرا کی طاقتوں کا امین ہے، جس نے تبت اور بدھ گیا میں بیٹھ کے مراقبے اور ارتکاز میں کمال حاصل کیا ہے جس کے پاس انکا ہے اور جو مضبوط ارادے اور آہنی عزم کا شخص ہے کیا وہ خودکشی کر لے اور شکست تسلیم کر لے کہ ایک پنڈت اس کی طاقت سے باہر ہے۔ وہ عمارت میری آنکھوں میں کھُب رہی تھی۔ ہندو طرزِ تعمیر کی اس عمارت کے روشندان اور کھڑکیاں، ستون اور دیواریں میرا منہ چڑا رہی تھیں، میں نے ہمیشہ اپنی کوتاہی کی سزا پائی۔ بدری نرائن کو میرے ارادے کی خبر ہو گئی تھی کیونکہ مجھ پر انسانی ہمدردی کے جذبات ناوقت غالب آگئے تھے۔ میں سریش اور انوپا کے معاملاتِ قلب سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ راستے میں تمام احتیاطی تدابیر ہی بھلا بیٹھا تھا۔ اب میرے سامنے ایک جال تھا۔ اگر میں اندر قدم بڑھاتا ہوں تو جال میں پھنس سکتا ہوں، اسے دیکھتے ہی مجھے اس کی مضبوطی کا احساس ہو گیا۔ اسے کوئی ماہر ہی بُن سکتا تھا، اپنی بوٹیاں نوچنے کے لیے میرا جسم تھا اور وحشت میں سر پٹکنے کے لیے درخت کا موٹا تنا۔

"تم کچھ دیکھ رہی ہو؟" میں نے بے بسی سے انکا کی طرف دیکھا۔

"ہاں! اندر بدری نرائن موجود ہے۔ بھگوان داس بھی ہے اور اُس کی نوجوان لڑکی شاردا بھی۔ اس کا تمہارا فاصلہ بہت کم ہے مگر تم اندر نہیں جا سکتے۔ درمیان میں تم دیکھ رہے ہو، کیا ہے؟" انکا نے پژمردگی سے اپنے لب کھولے۔

"میں یہ جال جلا دوں گا، یہ دیوار ڈھا دوں گا۔ میں قیامت تک نہیں بیٹھا رہوں گا۔"

"تم ایک حماقت کے بعد اب دوسری حماقت کر رہے ہو۔"

"میں ایک آخری حماقت ضرور کروں گا۔ میں یہیں بیٹھ کر بدری نرائن کا حوصلہ آزماؤں گا اور جب تک اسے باہر نہیں کھینچ لاؤں گا،

کیا آپ باہر جانا چاہتے ہیں

آپ ملک سے باہر جانا چاہتے ہوں یا باہر مقیم ہوں، ہر صورت میں آپ کو کوئی ٹیکنیکل کام ضرور سیکھ لینا چاہیئے فوٹوگرافی ایک ایسا فن ہے جو ہر ملک میں کام آتا ہے، لندن انسٹیٹیوٹ عرصے سے پاکستان اور پاکستان سے باہر سینکڑوں افراد کو فوٹوگرافی کی بذریعہ ڈاک تربیت دے رہا ہے۔ اگر آپ کے پاس ہمارا اُردو میں چار ماہ کا پورا باتصویر کورس ہو تو آپ کسی وقت بھی اپنا فوٹو اسٹوڈیو کھول سکتے ہیں یا کہیں بھی ملازمت حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم فوٹو کھینچنا۔ دھونا۔ انلارج کرنا۔ ڈارک روم و اسٹوڈیو بنانا سینما سلائڈ بنانا منٹ فوٹوگرافی واٹر کلر و آئل فوٹو پینٹنگ پریس و کلر و موی و پولا رائیڈ فوٹوگرافی بذریعہ ڈاک سکھاتے ہیں اختتام کورس پر ڈپلوما دیا جاتا ہے ماہانہ فیس ۱۵ روپئے داخلہ فارم منگائیے یا لیکچر کا پہلا سیٹ بذریعہ وی پی طلب فرمائیے

پاکستان سے باہر مقیم طلبہ کو پورا کورس ایک ساتھ بھیجا جاتا ہے اور ان سے پورے کورس کی فیس ۵½ پونڈ لی جاتی ہے۔

فوٹوگرافی سکھانے کے علاوہ لندن انسٹیٹیوٹ ریڈیو کا کام جاننے والے حضرات کا بذریعہ ڈاک امتحان بھی لیتا ہے جس کو پاس کرنے پر ڈپلوما دیا جاتا ہے۔ امتحان میں شرکت کے خواہش مند حضرات اپنا رجسٹریشن کرالیں۔

★

پرنسپل - زیڈ اے نقوی ایم اے

لندن انسٹیٹیوٹ

۳۵۶ - اے نیشنل ہائی وے - ملیر کالونی - کراچی ۲۷

یہیں پڑا رہوں گا۔"

"اس وقت تک امرلال آچکا ہوگا اور دوسرے پنڈت پجاری بھی بدری نرائن کی مدد کو پہنچ جائیں گے۔"

"تم کیا مذاق کرتی ہو؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "میں یہاں آنا نہیں چاہتا تھا، تم نے خود ہی ذکر چھیڑا اور اب منزل پر آ کے کہہ رہی ہو کہ واپس چلا جاؤں۔ میں کہیں اور جا کے سکون سے رہ سکوں گا؟"

"مجھے معلوم ہے لیکن یہاں بیٹھے رہنے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا، ادھر تم اپنی طاقتوں کا کھیل دکھاؤ گے، اُدھر وہ تمھیں ہٹانے پر اپنا پورا زور لگا دیں گے۔ اب تو بدری نرائن کا خیال کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ چلو شبن خاں کی طرف چلتے ہیں، وہ جیل میں کس مپرسی کے دن گزار رہا ہے، ادھر زر افشاں درخشاں کے لیے تمھیں بر تلاش کرنے ہیں۔ تمھیں ابھی بہت سے کام ہیں۔ کہیں اور نہیں چلتے تو کلدیپ ہی کے ہاں چلو، وہیں سمادھی لگا دینا۔" انگا نے آہستگی سے کہا۔

"اب سب باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی، میں تو یہاں سے کہیں اور نہیں جاؤں گا۔ اگر موت یہیں لکھی ہے تو اسی مٹی میں دفن ہو جاؤں گا۔" میں نے بپھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"یہ پچھتاوا ہے لیکن بعد از وقت پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ میسور جاتے ہوئے جب میں نے بدری نرائن کا ذکر چھیڑا تھا تو تم بُری طرح بے چین ہو گئے تھے۔ اگر تمھارے اضطراب کا یہی حال رہتا تو بدری نرائن تمھارے آنے سے کبھی آگاہ نہ ہوتا لیکن تم اس معمولی جوڑے کی خاطر تواضع میں سب کچھ بھول گئے۔ سنو جمیل احمد خاں!" انگا نے لہجہ بدل کے ترشی سے کہا۔ "یہ عمارت امرلال کی شرن میں ہے۔ اس نے بدری نرائن کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا تو اپنی عدم موجودگی میں اُسے تنہا کیسے چھوڑ دیتا؟ اس نے بدری نرائن کو اپنے چیلے بھگوان داس کے پاس بھیج دیا۔ اور اسے کوئی ایسا منتر بتا دیا کہ جب تم ادھر کا رُخ کرو، ایسا ایک جال تمھارے آنے سے پہلے یہاں بن جائے۔ ممکن ہے انھوں نے تمھیں گھیرنے کے لیے کوئی جال چلی ہو، تم یہاں بیٹھ کے اپنا وقت ضائع کرو گے، کچھ سمجھ میں آیا میں نے کیا بکواس کی ہے؟"

"میں تمھاری بکواس سن رہا ہوں انگا!" میں نے مایوسی سے کہا۔ "اب تک کیا بکا ہے؟ وقت ہی ضائع کیا ہے، کچھ اور وقت ضائع کرنے دو۔ میں نے اپنا آخری ٹھکانا ڈھونڈ لیا ہے۔ یہ درخت ہے، یہ چبوترا ہے اور میں ہوں۔ میں آنکھیں بند کرتا ہوں، تمھارے اندر برداشت کا حوصلہ ہے تو میرے سر پر ٹھیری رہو، نہیں تو اُتر جاؤ۔"

"یہاں تم پر کوئی اور مصیبت آسکتی ہے۔" انگا نے تلملا کے کہا۔

میں نے انگا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور عمارت کی جانب نظر کی، کھڑکی میں مجھے بدری نرائن کا چہرہ نظر آیا، وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا، میں نے زمین سے ایک پتھر اٹھایا اور شدید نفرت سے اُسے چار بار گھما کے عمارت کی جانب اچھال دیا، پتھر کسی آواز کے بغیر درمیان ہی میں ٹکرا کے واپس آگیا۔ اتنی دور سے میں بدری نرائن کے چہرے کے تاثرات دیکھ سکتا تھا۔ اس کی رعونت میری برداشت سے باہر تھی۔ میں نے اپنی انگلیوں کو حرکت دی اور زور زور سے پھونکیں ماریں، میرے کسی عمل سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، بدری نرائن نے رعونت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کھڑکی کے پٹ بند کر دیے اور میں اپنی جگہ تلملا کے رہ گیا، پہلے شاید میں انگا کے اصرار پر اس جگہ سے اٹھ جاتا مگر بدری نرائن کو اپنے سامنے دیکھ کے مجھ سے رہا نہ گیا۔ انگا اسی شدومد سے واپسی کے لیے اصرار کر رہی تھی، میرا عزم اور پختہ ہوتا جاتا تھا۔ آخر انگا نے ہار مان لی۔ اسے چُپ سی لگ گئی اور میں نے چبوترے کو اپنا مسکن بنا لیا۔ میرا جسم ساکت ہو گیا اور آنکھیں پتھرا گئیں۔ وہ اسی سمت مرکوز تھیں جہاں بدری نرائن کھڑا ہوا نظر آیا تھا۔ میں تین دن تک یوں ہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا، یہ برداشت کی انتہا تھی؟ اس دوران میں کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ تین دن بعد میں نے اپنے اندر کے دروازے بند کر کے باہر کی طرف جھانکنا چاہا تو مجھے شدید مایوسی ہوئی۔ میں نے بدری نرائن تک پہنچنے اور درمیان کا پردہ ہٹانے کی ایک اور کوشش کی۔ مکان کے گرد قائم حصار میں سر مو کوئی فرق نہیں آیا۔ البتہ میرے لیے ایک اور مشکل پیدا ہو گئی یہ کوئی غیر آباد علاقہ نہیں تھا۔ میری موجودگی اور میری مشکل تپسیا کی خبر سارے علاقے میں پھیل گئی۔ میں نے دھول جھاڑنے کے انداز میں اپنے جسم کو حرکت دی تو مجھے اپنے گرد پروانوں کی طرح منڈلاتے ہوئے لوگ دکھائی دیے۔ یہ غریب لوگوں کی بستی تھی مگر میرے چبوترے پر انواع اقسام کے کھانوں کے تھال رکھے تھے۔ میں نے انھیں چھوا تک نہیں۔ پھر میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بھگوان داس کے مکان کا چکر لگایا، بھگوان داس کے مکان میں گزشتہ تین روز سے کوئی شخص داخل نہیں ہوا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مکان عام انسانی آنکھ سے اوجھل ہوگیا ہو۔ اس کی جانب کسی کی توجہ مبذول نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ان لوگوں کی طرف سے نگاہیں پھیرلیں جو میری توجہ کے منتظر تھے، ان سب پر میری ہیبت اور بے نیازی کا اثر ہوا، رات کو مجھے سکون مل گیا اور میں نے دو چار لقمے زہر مار کیے، پھر سورج نکلنے سے پہلے میں اپنے عمل میں مصروف ہوگیا، میرے اور بدری نراتن کے درمیان قوتِ برداشت کی ایک جنگ جاری تھی۔ اگر میں اندر داخل نہیں ہوسکتا تھا تو وہ بھی تو باہر نہیں نکل سکتا تھا، اس کی دیوار کے ساتھ میری بھی کئی دیواریں تھیں اور سب سے بڑی چٹان تو میں خود تھا۔

ارتکاز میں ہر چیز ٹھہر جاتی ہے، وقت بھی منجمد ہوجاتا ہے۔ سفیدی و سیاہی کا احساس ہی نہیں رہتا، کوئی ایک ہفتے کی کٹھن تپسّیا کے بعد میں نے ایک وقفہ لیا، اس مرتبہ میری وحشت دو چند ہوگئی۔ سادہ لوح دیہاتی میرے گرد ارادت سے بیٹھے ہوئے تھے، میری پتھرائی ہوئی آنکھوں میں جنبش ہوئی تو انھوں نے احترام کے ساتھ میرے پیر چھونے شروع کردیے۔ میں ان پر بھڑ پڑا اور چیخ کر انھیں اپنے سامنے سے ہٹ جانے کا حکم دیا، وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے، میں یک بیک کھڑا ہوگیا اور ان کے وجود سے بے پروا ہوکے میں نے اپنا ہاتھ عمارت کی جانب دراز کیا، میں تادیر فضا میں لکیریں بناتا رہا اور انھیں قطع کرتا رہا پھر میں نے انتہائی طیش میں اپنے قریب رکھے ہوئے تھالوں کے ڈھیر سے جلتے ہوئے لوبان کا برتن اٹھا کر عمارت کی طرف پھینک دیا، برتن دُور جا کر رُک گیا اور زمین پر گرا، اس میں سے چند شعلے اُبھرے اور فوراً ٹھنڈے پڑگئے، میرے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے یہ منظر دہشت میں دیکھا اور زور زور سے دیوتاؤں کے نام کا جاپ کرنے لگے۔

"تمھاری یہ کوشش بے کار ہوگی۔" انکا نے میری ناکامی پر درشتی سے کہا۔ "وہ بے وقوف نہیں ہیں۔"

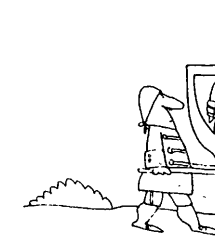

میں تیز تیز سانس لے کے اور پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھر کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی عقیدت مند ہاتھ جوڑے چبوترے کے نزدیک ہونے لگے میری نظریں ابھی تک بھگوان داس کے مکان کی کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں جس کے پٹ بند تھے، میری آنکھیں شعلے اُگل رہی تھیں، میری یہ کیفیت ان لوگوں سے پوشیدہ نہیں رہی جو کسی معجزے کی تمنا میں میرے قریب اکٹھے ہوگئے تھے جنھوں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ شخص ساکت و جامد کچھ کھائے پیے بغیر دنوں اور ہفتوں بیٹھا رہتا ہے، میرے بارے میں انھوں نے صحیح اندازہ لگایا

تھا، انھوں نے مجھے پہچان لیا تھا لیکن خود میں اپنے آپ پر شُبہ کررہا تھا، میں گیارہ روز کی تپسّیا کے بعد بھی بھگوان داس کے مکان میں داخل ہونے کے لیے کوئی چھوٹا سا راستہ تلاش نہیں کرسکا تھا۔ اچانک کھڑکی کے پٹ کھلے، میری پوری طاقت سمٹ کے نگاہوں میں مرکوز ہوگئی۔ وہاں بدری نراتن کی جگہ ایک نہایت حسین اور نازک اندام لڑکی کھڑی تھی، انکا بھی میری طرح کھڑکی کی طرف متوجہ تھی، اس نے مجھے اسی وقت بتایا کہ یہ بھگوان داس کی لڑکی شاردا ہے، اسے حُسن کی سند دینے میں کسی کو کوئی تعرّض نہ ہوتا۔ اسے دیکھ کے میری نگاہوں میں ایک بجلی سی چمکی، شاردا صرف ایک لمحے میری تقنا طیسی نگاہ کے سامنے ٹھیر سکی۔ پھر اُس نے گھبرا کر نگاہیں نیچی کرلیں اور کھڑکی کے پٹ اس طرح بند ہوگئے جس طرح میرے اچھے دنوں کے پٹ بند ہوگئے تھے۔ شاردا، یہ نام کئی بار میرے ذہن میں گونجا اور میرے جلتے ہوئے اعصاب پر نیل کا اثر کرگیا۔

اس موقع پر مجھے اپنے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کی موجودگی بُری محسوس ہوئی۔ میں نے انھیں پھٹکار کر کہا۔ "کیوں بیٹھے ہو؟ جاؤ اپنا راستہ لو۔ یہاں میٹھا تقسیم نہیں ہو رہا ہے۔"

"مہاراج! دیا کرو۔" ایک ساتھ کئی آوازیں گونجیں۔ "ہمیں اپنی سیوا کا اوسر دو۔"

"مجھے کسی سیوا کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے حقارت سے کہا۔ "جاؤ، اپنا کام کرو، میری تپسّیا میں کیوں خلل ڈالتے ہو؟"

"تم گیانی دھیانی ہو مہاراج! کالی نے تمھیں ہمارے پاس بھیجا ہے، یہاں سب کالی مائی کے اشارے پر اپنا جیون تیاگ دینے کے لیے بیاکل ہیں۔ ہمارے بڑے بھاگیہ جو تم یہاں پدھارے۔ بتاؤ مہاراج! تمھیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟" ان میں سے ایک عاجزی سے بولا۔

"نہیں بس اتنی سیوا کرو کہ میری نظروں سے دُور ہو جاؤ۔" میں نے ڈپٹ کر کہا۔

"مہاراج!" وہ سراپا عقیدت بن گئے۔ "ہمیں نراش مت کرو۔ اپنے پاس بیٹھنے دو، یہ چڑھاوے سویکار کرو۔"

میں سمجھ گیا کہ ان سے آسانی کے ساتھ چھٹکارا پانا مشکل ہوگا چنانچہ مزید حجت سے بچنے کے لیے میں نے ان کی ہر تھال پر سویکار کرنے کے انداز میں اپنا ہاتھ رکھ دیا لیکن وہ پھر میرے پیچھے بیٹھ گئے، ایک پستہ قد شخص مجھ سے مخاطب تھا۔ میں نے اسے بلا کر حکم دیا کہ وہ یہ تھال دیہات میں تقسیم کر دے اور میرے حصے کے طور پر ہر تھال میں سے کچھ نہ کچھ نکال کر ایک پتے پر رکھ دے۔ اس نے پھرتی سے میرے حکم کی تعمیل کی، ادھر میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر انکا کو بیدار کیا، انکا میرا مطلب سمجھ گئی۔ میں نے باری باری ان سب اجنبی لوگوں کو ان کے ناموں سے پکارنا شروع کیا۔ اپنے نام میری زبان سے سُن کے ان کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے اور جب میں نے ان میں سے ہر ایک کے دُکھ اور نجی زندگی کے بارے میں بتانا شروع کیا تو ان کی حالت غیر ہو گئی، میں نے ان کے زخموں پر انگلی رکھ دی تھی۔ وہ بلک بلک پڑے۔ پہلے میری حالت ایک پہنچے ہوئے سادھو کی تھی، اب میں انھیں کوئی اوتار نظر آ رہا تھا، میں نے ان کے دلوں میں جھانکا تو مجھے اُن سے ہمدردی ہونے لگی، وہ سب میری ہی طرح چاک گریباں تھے، سب کا سینہ میری طرح چھلنی تھا۔ کوئی مطمئن نہیں تھا، ہر شخص ستایا ہوا تھا۔ میں نے انکا کو ہدایت کی کہ ان غم زدہ لوگوں کا غم ہلکا کرنے کا تدارک کرے اور ان کے ساتھ چلی جائے۔ آخر وہ میرے حکم پر سہمے ہوئے پیچھے ہٹ گئے اور انکا انھیں ہنکا کے بستی میں لے گئی۔

ان لوگوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد میری نظریں پھر کھڑکی کی جانب ٹک گئیں۔ بھگوان داس کی عمارت کی ہر اینٹ میری نظروں کے احاطے میں تھی، ایک بار پھر شاردا کھڑکی پر نمودار ہوئی اور جلد ہی وہاں سے غائب ہو گئی۔ وہ دن اسی آنکھ مچولی میں گزر گیا، شام کو انکا میرے سر پر آ گئی، وہ ان مصیبت زدہ لوگوں کی امداد میں دن بھر سرگرم رہی تھی۔ اس نے کیا کچھ کیا ہوگا، مجھے اس کی تفصیل سُننے کی فرصت نہیں تھی۔

"آخر تم نے کیا سوچا ہے؟" انکا نے تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا

"بس میں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"اب تمھارا رہنا مشکل ہو جائے گا۔ سارے گاؤں میں صبح تک تمھاری خبر پھیل جائے گی، یہ بنگال ہے، صبح تک نہ جانے کتنے لوگ یہاں موجود ہوں گے۔ پھر تم مجھے حکم دو گے۔ میں بھلا کس کس کے سر پہ جا کر ان کی مصیبتیں دُور کرتی رہوں گی؟ ان سب کو ایک ہی چیز درکار ہے، پیسہ۔" پھر وہ پیار بھرے انداز میں بولی۔ "جمیل! میری بات مانو، آج رات ہی یہاں سے نکل چلو۔ تم جب ایک بُت کی طرح ساکت و جامد بیٹھ جاتے ہو تو مجھے بہت بُرے لگتے ہو۔ بالکل غیر معلوم ہوتے ہو۔"

"تم نے شاردا کو دیکھا ہے؟ بھگوان داس کی یہ لڑکی کچھ عجب تیکھے نقوش رکھتی ہے۔"

"تم مجھے بہلا رہے ہو، شاردا اس گھر سے کبھی باہر نہیں آ سکتی یہ بات تم بھی جانتے ہو۔"

"بھگوان داس اور بدری نرائن کیا کر رہے ہوں گے؟"

"وہ تمھاری تپسیا کا جواب دینے کے لیے جاپ میں مگن ہوں گے، انھوں نے وندھیاچل میں امرلال سے پرارتھنا کی ہوگی۔ تم نے یہ عمارت ڈھانے کے لیے کون سی کسر اٹھا رکھی ہے؟"

"تو پھر شاردا اس بھرے گھر میں ویران، اُداس پھر رہی ہو گی؟ تمھارا کیا خیال ہے؟"

"لیکن وہ اپنی اُداسی مٹانے کے لیے تمھارے پاس نہیں آئے گی۔"

"میں یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔"

"تم پاگل ہو جاتے ہو۔" انکا جز بز ہو کے بولی۔

شاردا کا ذکر میں نے اس سے دانستہ کیا تھا حالانکہ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ میں انکا کو یہاں بیٹھنے کے لیے آمادہ کرنا چاہتا تھا۔ رات کو میں نے ایک اور کوشش کی اور صبح جب سورج کی کرنوں نے اندھیرے پر غالب آنا شروع کیا تو انکا نے میرے سر پر بیٹھ کے پنجے مار مار کے پریشان کر دیا۔ کل میرے عقیدت مندوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی، آج میں انھیں گننے سے قاصر تھا۔ میں نے بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت مول لے لی تھی۔ جس جس کو خبر ہوتی تھی، وہ یہاں موجود تھا، آٹھ بجے تک عورتوں اور مردوں کی ایک بڑی تعداد میرے چبوترے کے سامنے جمع ہو چکی تھی، وہ سب میری طرف اُمید کی نظروں سے دیکھ رہے تھے، میں کبھی بھگوان داس کے مکان کی طرف دیکھتا، کبھی ان کی طرف، میں کس کس کی شنوائی کرتا اور ایک انکا کس کس کی مدد کرتی؟ میں نے سوچا، میں ارتکاز میں ڈوب جاؤں تاکہ وہ لوگ مایوس ہو کر خود

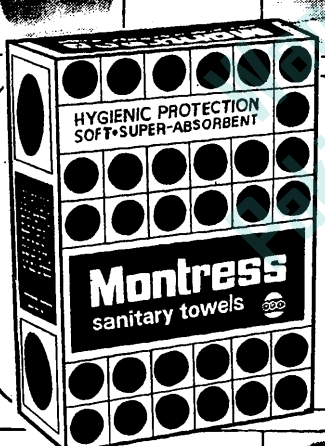

مونٹریس
سینیٹری ٹاول
بہترین تحفّظ کے حامل
HYGIENIC PROTECTION
SOFT•SUPER-ABSORBENT
Montress
sanitary towels
باشعور خواتین کا پسندیدہ
نہایت نرم، انتہائی جاذب
ہر ٹاول روئی کی چار تہوں پر مشتمل ایک حفاظتی تہہ کے ساتھ
حفظانِ صحت کے عالمی معیار کے مطابق تیار شدہ
کوالٹی میں اعلیٰ — قیمت میں ارزاں
TMI
کی ایک اور قابلِ اعتماد پیشکش
ڈسٹری بیوٹرز:
اِرمکو ایجنسیز آرام باغ روڈ - کراچی فون: ۲۳۸۹۴۱ ۲۳۴۰۸۳
ORIENT

بخود چلے جائیں لیکن اسی لمحے مجھے شاردا کا چہرہ کھڑکی میں مہ کامل کے مانند نظر آیا۔ اب کے وہ دیر تک کھڑی رہی۔ میں نے اس کی موجودگی سے تحریک پائی، غیر شعوری طور پر میں نے انکا کو کام پر لگا دیا۔ وہ مجمع میں موجود ہر شخص کے بارے میں جزئیات بتاتی رہی اور میں کنکھیوں سے اُسے دیکھتا رہا جب میں کسی غریب کا احوال بتاتا تو مجمع میں ایک ہیجان سا برپا ہو جاتا، وہ نارائن نارائن چیختے ہوئے دیوانہ وار میرے پیر چھونے کے لیے بڑھتے۔ میں انھیں پیچھے دھکیل دیتا۔ عورتیں مردوں سے سبقت لیے جا رہی تھیں۔ دوپہر تک یہی سلسلہ جاری رہا، انکا مسلسل بولتی رہی اور شاردا بار بار کھڑکی پر جلوہ گر ہوتی رہی۔ صرف شاردا ہی کھڑکی پر نظر آتی تھی، بدری نرائن اور بھگوان داس نے یقیناً کوئی جاپ شروع کر دیا تھا۔

میں آگے کی تفصیل کیا بیان کروں، انکا کی موجودگی میں روز لگنے والی اس نوٹنکی میں کیا کیا تماشا نہ ہوا ہوگا؟ اور میں نے خالی وقت میں ارتکاز، مراقبے، تزکیۂ نفس اور استغراق کا کون سا عمل نہ کیا ہوگا؟ کئی ہفتے بیت گئے اور میں وہ فاصلہ عبور کرنے میں ناکام رہا جو میرے اور بدری نرائن کے درمیان حائل تھا، اردگرد کے دیہات کے لوگ بھی اب اس طرف آنے لگے تھے، کئی نوجوان پنڈت پجاریوں نے میرے قریب ہی سمادھی لگا دی تھی۔ اس صورتِ حال سے میں بہت پریشان تھا۔ میں یہاں سے ہٹ بھی نہیں سکتا تھا اور آنے والے لوگوں کو منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ میری طبیعت میں چڑچڑاپن پیدا ہو گیا۔ میں آنے والے لوگوں کو بُری طرح دھتکار دیا کرتا لیکن میں جتنا انھیں دھتکارتا، اتنا ہی وہ میرے پیچھے پڑ جاتے۔ صرف ایک امید نے مجھے یہاں روک رکھا تھا ورنہ میں طویل ارتکاز میں ڈوب کر یہ قصہ ہی تمام کر دیتا۔ شاردا کی آنکھوں میں میرے لیے ایک کیفیت پیدا ہو رہی تھی اور میں صرف اسی قدر کامیاب ہوا تھا کہ اُسے کھڑکی پر دیر تک کھڑا رکھوں اور اس کے دل میں اپنا خیال منتقل کر سکوں۔ اگر یہ پُراسرار دیوار حائل نہ ہوتی تو شاردا بندھی چلی آتی۔ یہ ایک صبر آزما کام تھا۔ میری ریاضت اور عقیدت، ہندوؤں کی مجھ سے ارادت دیکھ کے شاردا نے میرے بارے میں بہت سی مثبت رائیں قائم کر لی ہوں گی جن کا ثبوت یہ تھا کہ اب وہ رات کو بھی کھڑکی میں کھڑی ہونے لگی تھی۔ میں سنگلاخ چٹان پہ تنکے مار رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں یہ چٹان انھی تنکوں سے توڑ دوں گا، روز میرے روحانی اعمال میں شدت پیدا ہو جاتی تھی۔

میں نے انھی دنوں اچانک ایک رات اپنے قریب کوئی سایہ سا گزرتا محسوس کیا۔ انکا فوراً میرے سر سے اُتر گئی، میں نے پلٹ کے اِدھر اُدھر دیکھا، وہ کلدیپ کا پرتو، اس کی نمائندہ کلپنا تھی۔ اس کی خلافِ توقع آمد سے میرا انہماک ٹوٹ گیا اور میں خشمگیں نظروں سے اسے گھورنے لگا، وہ جب بھی میرے پاس آتی تھی، میں سمجھتا تھا، کلدیپ آگئی۔ اس وقت مجھے کوئی ہمدردی قبول نہیں تھی، کوئی مشورہ یا دخل پسند نہیں تھا، کلپنا نے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ”جمیل احمد خاں! میں کلپنا ہوں۔“

”ہاں ہاں، میں دیکھ رہا ہوں، تم کلپنا ہو، کلدیپ ہی کا کوئی جلوہ۔ تم شاید مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرنے آئی ہو مگر میں اپنے معاملے میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتا۔“ میں نے تیزی سے کہا۔ ”اب تمھاری دیوی سے میرا کیا واسطہ؟ میری یہ حالت اسی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ وہ بار بار مجھے کیوں تنگ کرتی ہے؟ میں مر جاؤں گا تو کیا ہوگا۔ میں ناکام ہو جاؤں گا تو اس کے گیان دھیان میں کیا فرق پڑے گا؟“

”تم دیوی سے بہت ناراض ہو۔ میں تم سے اس وقت کچھ نہیں کہوں گی، میں تمھیں یہ مشورہ دینے آئی ہوں کہ تم یہاں بیٹھے اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔“

”میں یہاں سے ہٹ کے بھی اپنا وقت ضائع ہی کروں گا۔ اب مجھے دنیا میں کون سا کام رہ گیا ہے؟ پنڈتوں پجاریوں سے لڑنا، مشکلوں میں پڑنا اور ان سے نکلنا۔“

”تمھاری ایک لڑکی، داماد اور تم سے متعلق اور لوگ بھی اس دنیا میں موجود ہیں، تم یہاں تنہا نہیں ہو۔“ کلپنا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تمھیں اپنے خیر خواہوں کے مشورے قبول کرنے چاہئیں۔ میں نے کبھی تمھارے ساتھ کوئی غیر ہمدردانہ سلوک نہیں کیا ہے۔“

”میں تمھارا احسان مند ہوں۔“ میں نے طنزاً کہا۔ ”میری زندگی پر نہ جانے کس کس کے احسانات ہیں؟ میں ان کے بوجھ تلے دب گیا ہوں۔ اب یہ وتیرہ ترک کر دو اور مجھے میری حالت پر چھوڑ دو، زندہ رہا تو ایک بار تمھاری دیوی کے درشن ضرور کروں گا، میں اسے دیکھنے کے لیے جا رہا تھا کہ راستے ہی سے واپس آگیا۔“

”چلو دیوی کے استھان چلو۔ یہاں بیٹھے ہوئے تم.....“ کلپنا کی بات ادھوری رہ گئی۔ میں نے ناراضی اور غصے سے کہا۔ ”مجھے یہاں سکون مل رہا ہے۔“

”تمھاری مرضی لیکن تم میری بات پر غور کرنا، وقت سے

پہلے یہاں سے اٹھ جانا۔ اس بات کا بھی خیال رکھنا جمیل احمد خان کہ تمہارے کچھ اور بہی خواہ بھی اس دنیا میں موجود ہیں۔" کلپنا نے تیکھے لہجے میں کہا اور رات کی سیاہی میں مدغم ہوگئی۔ اس کے جانے سے مجھے سکون ہوا۔

کلپنا نے انکا سے کوئی الگ بات نہیں کہی تھی۔ وہی تکرار تھی جسے سنتے سنتے میں تنگ آگیا تھا، یہاں رہتے ہوئے رفتہ رفتہ پندرہ دن اور گزر گئے، ڈھائی ماہ کے عرصے میں کوئی شخص مکان میں داخل نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی گاؤں کے کسی آدمی نے نظر گھما کے مکان کی طرف دیکھنے کی جسارت کی تھی۔ ان سب کی نظریں یہ عمارت دیکھنے سے قاصر تھیں، میں اپنے انہماک میں حسب معمول غرق تھا۔ دوپہر تک میرے اطراف دیہاتیوں کا بڑا ہجوم شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتا رہتا اور انکا میرے حکم پر ہر شخص کی مشکل حل کرتی رہتی جب اتنے دنوں کی صبر آزما تگ و دو کے بعد بھی کوئی روزن نہ کھلا، دیوار میں کوئی شگاف نہ پڑا اور شیشے میں کوئی بال نہ آیا تو کلپنا اور انکا کی باتیں میرے ذہن میں رینگتی ہوئی داخل ہونے لگیں۔ میں اپنے ہر عمل میں ناکام ہوچکا تھا۔ میرا اعتماد مجروح ہونے لگا تھا۔ اب مجھے اپنی آگ بجھانے کے لیے کسی اور ہی ذریعے کی تلاش تھی۔ شاردا ؟ ہاں شاردا، بس ایک ہی چارہ تھا کہ کسی طور شاردا مکان سے باہر آجائے میری جانب اس کی آمادگی کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ دیوار پھاند کر چلی آتے گی۔ اندر سے کسی شخص کے آنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ قید صرف جانے والوں کے لیے ہونی چاہیے۔ میں نے اپنی پوری توجہ شاردا پر صرف کردی تھی۔ شاردا میرے اشارے سمجھنے لگی تھی، وہ میرے چمتکار حیرت سے دیکھتی رہتی تھی۔ آخر ایک رات، میں نے اسے آواز دی اور اشارے سے اپنے پاس بلانا چاہا۔ میری آواز دور دور تک گونج گئی۔ شاردا نہیں آئی، میں سمجھا میرے کلام میں اثر نہیں رہا اور میری نگاہ اپنی کشش کھو بیٹھی ہے۔ شاردا نہیں آئی۔ جنون کچھ اور فزوں ہوگیا، اسے بلانے اور پکارنے میں اور شدت پیدا ہوگئی۔

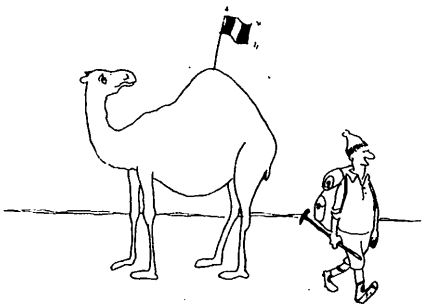

لیکن دوسرے دن ہجوم میں ایک ملنگ شخص بانسری بجاتا ہوا میری طرف نکل آیا۔ انکا کے مشورے پر میں نے اس سے بانسری طلب کرلی۔ اس نے بے پروائی سے اسے میری جانب پھینک دی انکا نے مجھے ایک افسانوی ترکیب بتائی تھی کہ ممکن ہے اس میں کوئی منفعت ہو۔ خود میں نے قدیم کہانیوں میں پڑھا تھا کہ ایک محبوب اپنی محبوبہ کو بلانے کے

لیے رات کو جنگل میں بانسری بجایا کرتا تھا۔ محبوبہ کھنچ کر اس کے پاس پہنچ جاتی تھی اور اسے اپنی سدھ بدھ نہیں رہتی تھی اسے آنے میں دیر ہوگئی تو محبوب نے اس رات فراقِ یار میں ایسی بانسری بجائی کہ اس کی سانس نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ رات کو میں نے یہی افسانہ دہرایا۔ مجھے بانسری بجانی نہیں آتی تھی لیکن انکا میرا ساتھ دے رہی تھی، انکا نے اس میں عجیب سوز پیدا کردیا تھا، کوئی شبہ نہیں کہ میری دردناک لے نے پرندوں کی نیند اڑادی ہوگی۔ بانسری میرے ہونٹوں سے ٹکی ہوئی تھی اور اس سے راگنیاں پھوٹ رہی تھیں، میں خود مدہوش ہوا جارہا تھا۔ موسیقی بھی جادو ہے۔ انکا اسے بجا رہی تھی۔ وہ انکا جس کی طاقت کے طفیل میں نے لندن میں ترکی جادوگر کو شکست دی تھی، وہ انکا جو لندن میں ایک دبلی پتلی لڑکی کے سر پر گئی تو اس لڑکی نے بھرے مجمع میں جادوگر کو اپنے نازک ہاتھوں پر اٹھا لیا مگر مجھے انکا کی اس خوبی کا اندازہ نہیں تھا۔ اگر مجھے پہلے سے اس خوبی کا علم ہوتا تو میں اسے لندن کے کلب میں موسیقی کی بزم بھی سجاتا پھر سارا اور جین کا کیا حال ہوتا ؟ سلسلۂ خیال کہاں سے کہاں لے گیا۔ میں بانسری بجا رہا تھا اور شاردا کھڑکی میں مچل رہی تھی، میں اسی طرح اپنی دھن میں مگن رہا۔ پھر میں نے کھڑکی کے پٹ کھلتے اور بند ہوتے دیکھے، وہ اضطراب میں مبتلا تھی، آخر کھڑکی کے پٹ کھلے رہ گئے اور مجھے عمارت کے دروازے تیزی سے کھلنے کی آوازیں آئیں۔ شاردا بھاگتی ہوئی میری سمت آرہی تھی۔ وہ جب دروازے سے نکل آئی تو تیزی سے فاصلہ عبور کرنے لگی۔ اس کے پیچھے بھگوان داس چلاتا اور دوڑتا نظر آیا مگر شاردا کو ہوش نہیں تھا۔ وہ تڑپتی ہوئی آئی اور میرے قریب آکے گنگ سی کھڑی ہوگئی۔ انکا اسی وقت اس کے سر پر پہنچ گئی۔ بانسری میرے ہونٹوں سے الگ ہوچکی تھی، موسیقی کے

سحر نے اپنا کام کر دیا تھا، میں حیرت سے شاردا کو دیکھ رہا تھا، اس کے دونوں ہاتھ اپنا سینہ چھپاتے ہوئے تھے۔ ساری جسم پر ٹھیک طرح نہیں بندھی تھی، وہ ہانپ رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، اس کا جسم گلاب کی کوئی شاخ تھا جس پر گلاب جیسا اس کا چہرہ لگا ہوا تھا، بھگوان داس دہشت میں شاردا شاردا پکارتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا، اس نے آتے ہی شاردا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شاردا نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا، میں خاموش کھڑا کچھ دیر تک باپ بیٹی کی نوک جھونک سے لطف لیتا رہا۔ شاردا نے بھگوان داس کے ساتھ واپس جانے سے انکار کر دیا تھا، بھگوان داس سراسیمہ اور حواس باختہ تھا، اس نے ابھی تک مجھ سے نظریں ملانے کی جرأت نہیں کی تھی، خوف سے اس کا جسم لرز رہا تھا آواز بھی تھرا گئی تھی۔ میں نے بڑھ کے شاردا کا ہاتھ تھام لیا، وہ میرے سینے سے لگ گئی۔ میں نے بھگوان داس سے تلخی کے ساتھ کہا "صرف ایک شرط پر تم شاردا کو لے جا سکتے ہو کہ بدری نرائن کو میرے حوالے کر دو۔"

"میں بدری نرائن کو تمھارے حوالے نہیں کر سکتا۔ میں نے گرو امرلال کو وچن دیا ہے کہ میں اس کی حفاظت کروں گا۔" بھگوان داس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"مجھے شاردا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اسے میں نے صرف بدری نرائن کو حاصل کرنے کے لیے بلایا ہے، اگر تمھیں یہ سودا منظور نہیں ہے تو میں شاردا کو ساتھ لے جاؤں گا۔" میں نے سیدھے سادے الفاظ میں کہا۔

"تم اسے نہیں لے جا سکتے، گرو دیو کی شکتی امر ہے، تم نے پہلے ہی بہت کافی تکلیف اٹھائی ہے، گرو دیو تمھیں اس بار برا کشٹ دیں گے۔"

"مجھے گرو دیو سے خوف ہوتا تو میں کبھی یہاں نہ آتا، تم نے ایک کمینے شخص بدری نرائن کو شرن دی ہے، وہ میرا مجرم ہے، شاردا کے عوض تم اسے میرے حوالے کر سکتے ہو۔"

"مجھے مجبور نہ کرو مہاراج جمیل احمد خاں! میں ایسا نہیں کر سکتا۔" بھگوان داس نے خوشامد کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم شاردا سے سدا کے لیے ہاتھ دھو لو، میرا مشورہ ہے بھگوان داس کہ تم بدری نرائن کے پاس جا کے اسے صورتِ حال سے آگاہ کرو، اگر وہ تمھارا دوست ہے اور بڑا پنڈت ہے تو تمھاری بیٹی کی زندگی کے لیے باہر آ جائے گا۔" میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"میں جانتا ہوں، وہ باہر نہیں آئے گا۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"تم پھر تم نے ایسے نیچ شخص کو شرن کیوں دی ہے؟"

"میں نے گرو دیو امرلال کو دیے ہوئے وچن کا پالن کیا ہے۔"

"وچن؟" میں نے قہقہہ لگایا۔ "میں نے بھی اپنے آپ سے کوئی وچن کیا ہے بھگوان داس! تم میری شکتی کے بارے میں کچھ جانتے ہو۔؟"

"میں جانتا ہوں۔" وہ خوشامدانہ بولا۔ "پر مہاراج! میں مجبور ہوں، جب تک گرو دیو نہیں آ جاتے، میں اسے تمھارے حوالے نہیں کر سکتا۔ میری بیٹی مجھے واپس کر دو۔"

"میں بھی مجبور ہوں بھگوان داس! میں نے بہت کوشش کی کہ بدری نرائن خود بخود میرے پاس آ جائے مگر وہ نہ آیا، مجھے یہ قدم مجبوراً اٹھانا پڑا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ شاردا یا بدری نرائن، بیٹی یا وچن کا پالن، ان میں سے ایک چیز اپنے لیے چن لو، سمجھے۔"

"مہاراج! اسے معلوم ہے شاردا چلی گئی ہے، اگر وہ آنا چاہتا تو کب کا آ چکا ہوتا، میں نے اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر بتایا تھا مگر وہ اپنے جاپ میں لگا رہا، اس نے میری بات نہیں سنی۔ میں نے ہی اپنا جاپ توڑ دیا۔" بھگوان داس عاجزی سے بولا۔

"جب تم امرلال کو یہ سب بتاؤ گے تو وہ تمھیں کوئی کشٹ نہیں دے گا، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، فیصلہ تمھیں کرنا ہے، جلد سے جلد کوئی فیصلہ کرو۔ میں شاردا کو لیے جا رہا ہوں، جب تمھارے گرو دیو وندھیاچل سے ادھر پدھاریں گے تو ان سے معاملہ نپٹ لیا جائے گا۔"

شاردا چپ چاپ میرے اور بھگوان داس کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ بھگوان داس عاجزی کے ساتھ مجھ سے فریادیں کرتا رہا لیکن میں نے ایک قدم بھی پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ بھگوان داس کی فریاد حد سے تجاوز کر گئی اور اسے سننا میری برداشت سے باہر ہو گیا تو میں نے عمارت کی جانب منہ کر کے چیخ چیخ کر بدری نرائن کو مخاطب کیا، عمارت کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے غصے سے شاردا کو اپنی طرف کھینچا اور اندھیرے میں ایک سمت چل پڑا۔ بھگوان داس لجاجت سے درخواست کرتا رہا۔ اس نے میرے پیر پکڑ لیے۔ میں نے اسے حقارت سے ٹھوکر مار دی، اچانک بھگوان داس کی عاجزی، درشتی میں تبدیل ہو گئی، اس نے سخت لہجے میں مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں شاردا کو چھوڑ دوں پھر وہ مجھے امرلال کا خوف دلانے لگا، میں نے اس کی بات پر کان نہیں دھرے۔ بس چلتا رہا پھر رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے سر پر کوئی وزنی پتھر کھینچ مارا ہو،

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

غصے میں میری آنکھیں باہر نکل آئیں، میں نے مڑ کر دیکھا، بھگوان داس میرے پیر جکڑنے کے لیے منتر کا جاپ کر رہا تھا۔ بدری نرائن کے نہ ملنے سے میرے رگ و پے میں زہر دوڑ گیا تھا۔ میں نے شاردا کا ہاتھ چھوڑا اور بھاگ کر بھگوان داس کے زمین بوس جسم پر ایک ٹھوکر ماری۔ وہ لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا اور کرب سے چیختا رہا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ بھگوان داس کو مارنے سے ممکن ہے، شیشے کی وہ دیوار ٹوٹ جائے جو میرے اور بدری نرائن کے درمیان حائل ہے۔ میں نے اپنی انگلیوں کو حرکت دی، بھگوان داس ایک معمولی درجے کا پنڈت تھا، وہ زمین پر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے چند لمحے توقف بھی کیا کہ شاید بدری نرائن اپنے دوست کو موت و زیست کی کشمکش میں محسوس کر کے باہر آ جائے لیکن وہ نہ آیا۔ بھگوان داس زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا، ہولناک چیخوں کے ساتھ تڑپتا ہوا دنیا سے اپنے رشتے توڑ بیٹھا۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے جل گیا تھا، یوں بھی اگر میرا اس کا جسمانی مقابلہ ہوتا تو اسے زیر کرنے میں مجھے زیادہ زحمت نہ کرنی پڑتی۔ بہرحال بھگوان داس نے اپنے عہد کی اور میں نے اپنے فیصلے کی پاسداری کی۔ میں اپنے اس جارحانہ فعل پر قطعاً نادم نہیں تھا۔ بھگوان داس کو تو مجھ سے گفتگو کرنے کی مہلت بھی مل گئی۔ اس عمارت میں رینگنے والے حقیر کیڑوں تک سے مجھے نفرت ہو گئی تھی۔ شاردا نے اپنے باپ بھگوان داس کی عبرتناک موت اپنی آنکھوں سے دیکھی مگر وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکی۔ اس کے سر پر انکا تھی؛ انکا نے اس کے حواس اپنے قابو میں کر لیے تھے۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر نصب تھیں مگر اسے ان پر اختیار نہیں رہا تھا۔

میں شاردا کے ساتھ دوبارہ اپنے چبوترے کی طرف آیا اور میں نے مکان کے گرد چکر لگا کے کئی عمل آزمائے، دیواریں جوں کی توں موجود تھیں اور اس کے اندر بدری نرائن بہت معمولی فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں بھگوان داس کو مارنے اور شاردا کو اپنی تحویل میں لینے کے بعد بھی اسے باہر نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ انکا نے مجھے صبح سے پہلے یہ جگہ چھوڑ دینے کی ہدایت کی۔ میں انتظار کرتا رہا مگر انتظار بے سود ثابت ہوا۔ اندھیرا چھٹنے کو تھا۔ عمارت کی طرف تھوک کر میں نے کہا۔ "بدری نرائن! تجھ پر لعنت۔" آگے کے الفاظ میرے حلق میں اٹک گئے۔ میں انھیں تلخ گھونٹ کے مانند پی گیا۔

شاردا ہمارے ساتھ تھی۔ بھگوان داس کے مکان میں اب صرف بدری نرائن رہ گیا تھا۔ اس کے باہر نکلنے کی اب ہر امید ختم ہو گئی تھی۔

سقراط

کو اپنی موت کا انتظار تھا۔ عقیدت مند اور شاگرد اس کے سامنے مضمحل، اداس اور سوگوار آتے اور نصیحتیں اور عقل و دانش کی باتیں سن کر چلے جاتے۔ ان میں بعض وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے سقراط کی مخالفت کی تھی اور اسے سزائے موت دلوانے کے ذمے دار تھے۔ سقراط نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اگر تم نے مجھے موت کے گھاٹ اتار دیا تو یاد رکھو تمھیں مجھ جیسا انسان آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس شہر پر حملہ کرنے کے لیے اتارا گیا ہے۔ تم میری بات اس طرح سمجھنے کی کوشش کرو کہ یہ شہر ایک بہترین نسل کا گھوڑا ہے جو بدقسمتی سے سستی اور کاہلی کا شکار ہو چکا ہے اور میرا کام اس مکھی کی طرح ہے جو اسے ہر طرف سے کاٹتی ستاتی رہتی ہے تاکہ اس کی کاہلی دور کرے اور اسے حرکت پر آمادہ کرے۔ میں ہی وہ مکھی ہوں جسے خدا نے تمھاری طرف بھیجا ہے!"

وہ اس وقت تک باہر نہیں آتا جب تک امرلال واپس نہ آ جاتا یا جب تک اس کے سر سے میرا خطرہ نہ ٹل جاتا۔ میں نے بھگوان داس کو ختم کر کے اور شاردا پر قبضہ کر کے امرلال سے ایک بڑی مڈبھیڑ کے لیے میدان ہموار کر لیا تھا۔ امرلال اپنے اطاعت شعار چیلے بھگوان داس کی موت پر خاموش بیٹھنے والا شخص نہیں تھا۔ ہم اندھیرے اندھیرے میں بستی سے نکل گئے اور ایک بس میں بیٹھ کے شہر میں داخل ہو گئے۔

میں نے سورج کی روشنی میں شاردا کو دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ سراپا لطافت ہے۔ دراز بال، گھنے ابرو، چمکتا رنگ، اُمڈتا بدن، لہراتا قد، کشمیری رخسار، موتیوں جیسے دانت، ہرن آنکھیں، پنکھڑی لب، چہرے پر شرم، انداز میں بے ساختگی، شرارت کرتے ہوئے خدوخال۔ اسے دیکھ کے گزرے ہوئے دن یاد آتے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں بدری نرائن کے عوض اس سودے پر بہت شاداں ہوتا، سلامت جان مرحوم زندہ ہوتا تو میرے اس انتخاب پر بے تحاشا میرے ہاتھ چومتا، وہ درخشاں تھی، زرافشاں تھی، کہ وہ کسی بھی حسین لڑکی کی طرح حسین تھی۔ حسین لڑکی کو سنبھالنا اور نظرِ بد سے بچاتے رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ زرافشاں اور درخشاں کے بارے میں مجھے یہ تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ مجھے حالات نے ایک اور لڑکی کا ذمے دار ٹھیرا دیا تھا۔ کلکتے پہنچ کے میں نے سرتیش اور انوپا کی خبر لی۔ معلوم ہوا سرتیش نے اپنے ایک بنگالی دوست کے ساتھ

کاروبار شروع کر دیا اور بڑے ٹھاٹ سے ایک فیشن ایبل مکان میں رہتا ہے۔ میرے پاس وقت کی کمی تھی لیکن میں اس کا مکان تلاش کر کے وہاں پہنچ ہی گیا۔ انھیں امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی مجھ سے ملاقات ہو جائے گی ان پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں نے وہاں غسل کر کے نیا لباس پہنا۔ میرا سوٹ کیس سریش ہی کے پاس تھا۔ اس نے میرے کپڑے پہننے کے لیے دے دیے۔ انوپا کو اتنی خوشی تھی جیسے اس کا باپ گھر آیا ہو۔ سریش نے ایک گاڑی بھی خرید لی تھی۔ انھیں خوش و خرم دیکھ کے مجھے فخر کا احساس ہوا۔ انھوں نے ہماری خاطر ہر کام چھوڑ دیا۔ نشاردا کو انوپا نے اپنی بیش قیمت ساڑیاں تحفے میں دے دیں۔ چند گھنٹے انوپا اور سریش کی جنت میں گزار کے میں وہاں سے چلا آیا۔ اسٹیشن پر سریش اور انوپا مجھے چھوڑنے آئے۔ گھر سے رخصت ہوتے وقت میں نے سریش سے کچھ رقم ادھار مانگنے کی درخواست کی تھی۔ اس کی آنکھیں لبریز ہو گئی تھیں، اس نے انوپا کا تمام زیور اور نقدی میرے سامنے ڈال دی۔ میں نے چند سو روپے لے کے باقی سب کچھ اسے واپس کر دیا۔ انکا شاردا کے سر پر تھی، اس لیے میں نے کسی زحمت سے بچنے کے لیے سریش سے رقم لینے کا ارادہ کیا تھا، بعد میں احساس ہوا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، ہونے والی بات ہو گئی۔ انوپا اور سریش کے بوسے لے کے اور انھیں دعائیں دے کے میں ان سے رخصت ہو گیا۔

راستے میں انکا شاردا کے سر سے اتر کے میرے پاس آ گئی۔

شاردا اس کے ہٹتے ہی چونک کے کھڑی ہو گئی۔ وہ خوف زدہ نظروں سے گرد و پیش تک رہی تھی جب دوسرے ٹلے پہ اس نے مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پہ زردی چھا گئی۔ میں نے اسے سنبھالا ورنہ وہ بے ہوش ہو جاتی۔ "تم میرے پاس ہو شاردا!" میں نے محبت سے کہا۔ "کیا تم میرے پاس آنا نہیں چاہتی تھیں؟"

"میں کہاں ہوں؟" وہ سہم کر بولی۔

"تم ریل گاڑی میں ہو اور میرے ساتھ جا رہی ہو۔ تم نے کئی بار میرے قریب آنے کا ارادہ کیا مگر کوئی تمھارے پاؤں پکڑ لیتا تھا، آخر ایک رات میں نے بانسری بجائی اور تمھیں زنجیریں توڑنے پر مجبور کر دیا پھر تمھیں کچھ ہوش نہیں رہا۔ تمھارے باپ نے بدری نرائن کو اپنے ہاں پناہ دینے کے جرم میں سزا پائی اور وہ پرلوک سدھار گیا، تمھارا کوئی نہیں رہ گیا تھا، اس لیے میں تمھیں اپنے ساتھ لے آیا۔"

"میرے پتا جی کو کیا ہوا؟" وہ میری نرم، ٹھنڈی گفتگو سے متاثر نظر آتی تھی لیکن اپنے باپ کا ذکر سن کے بے چین ہو گئی۔

"مجھے افسوس ہے" وہ پراسرار شکتیوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ بدری نرائن ان کی مدد کو نہیں آیا۔"

اس کے چہرے پر تذبذب اور کشمکش کے آثار نمودار ہوئے اور اس کی سسکیاں نکل پڑیں۔ میں نے اسے کھل کے رونے دیا اور اس کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ میں اسے تسلیاں دیتا رہا۔ اتنے بڑے حادثے اور اپنے گھر سے اچانک دور ہو جانے کا صدمہ معمولی نہیں تھا۔ میں تمام سفر میں اپنے حسنِ سلوک اور شفیق رویے سے اس کا سینہ ہلکا کرنے میں مصروف رہا، اس میں پہلے ہی از خود رفتگی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے ڈھائی ماہ کے عرصے میں اس کی آنکھیں اپنی جانب مائل کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے ہاں جو کچھ جھجک تھی وہ انکا نے ہموار کر دی۔

کلکتے سے دلی تک کے سفر میں مجھے خاصا وقت مل گیا تھا۔ میں نے اسے دلی پہنچنے تک پوری طرح منقلب کر لیا تھا اور اب میں اطمینان سے اس کے رخِ زیبا کا نظارہ کر سکتا تھا۔ میں نے اس کے حسنِ جہاں تاب کا خوب نظارہ کیا اور میں، جس کے جذبات کہیں سو گئے تھے، اس کے حسن کی گرمی سے پگھلنے لگا۔ اس کے سامنے ایک عجیب و غریب شخص بیٹھا تھا، جس کا مشاہدہ کرنے اور جس کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم کرنے کے لیے اسے کافی وقت مل گیا تھا۔ میری شخصیت کی گوناگوں خوبیوں، میرے اسرار اور بات چیت سے وہ بہت متاثر تھی، اب اس کے لبوں میں ایک سپردگی تھی کیونکہ وہ پھڑکتے تھے جیسے میں ہی اس کا سب کچھ ہوں۔ اس کی جانب میری توجہ دیکھ کے انکا کو شرارتیں سوجھیں۔ وہ مجھے چھیڑنے لگی اور ایک عرصے بعد اپنی روایتی شوخیوں پر اتر آئی۔ کہنے لگی "اے جمیل! اس کے لبوں میں کس بلا کا رس ہے۔"

میں نے کہا "ہاں ہے تو۔"

"تو پھر اس تنہائی میں اپنی تھکن دور کیوں نہیں کر لیتے؟ تمھیں یہ خشک زندگی بسر کرتے ہوئے کتنے دن ہو گئے۔"

"اسے صرف دیکھتے رہنا بھی کسی لذت سے کم نہیں ہے۔"

"مگر اس کے اصل جوہر تو اس وقت کھلیں گے جب اسے برتو گے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا، میں اسے کس طرح برتوں؟"

ایک بہترین لڑکی کی طرح — یہ تو مالِ غنیمت ہے۔ اس پر تمھیں پورا اختیار ہے بلکہ تمھارا حق ہے۔"

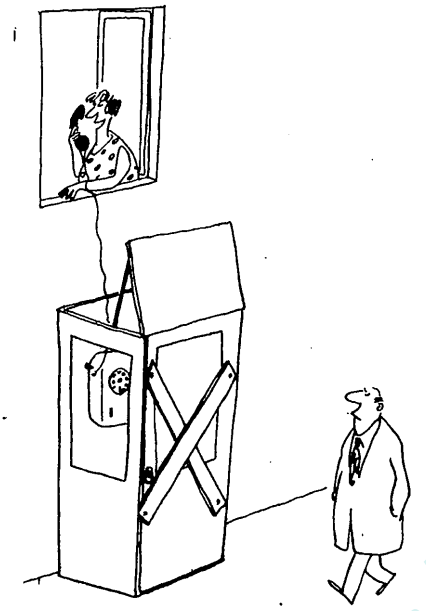

"اب کچھ جی نہیں کرتا، اس کی مظلومیت پر ترس آتا ہے۔"

"واقعی، تم سے بڑا مظلوم کون ہوگا؟"

"ہاں ۔۔۔ خاصا وقت گزر گیا، اب میں شاید بوڑھا ہو چکا ہوں۔"

"تم بے وقوف ہو گئے ہو۔ سنو! امرلال، شاردا کا اغوا اور بھگوان داس کی موت آسانی سے درگزر نہیں کرے گا، شاردا آئی ہے تو جا بھی سکتی ہے۔ پہلی فرصت میں اس پر محبت کی مہر ثبت کر دو ورنہ بعد میں پچھتاؤ گے۔"

"ابھی نہیں ۔۔۔ اور کل کا ذکر مت کرو، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

میں انکا کی باقی باتیں نہیں سن سکا۔ شاردا کے چہرے میں مجھے کئی چہرے نظر آنے لگے تھے۔ نرگس، مالا، کلدیپ، سارا، جین، درخشاں، زرافشاں کے چہرے ۔ انکا نہ جانے کیا کیا کہتی رہی اور میں آنے والے وقت کے بارے میں سوچتا رہا۔ کاش اور بہت سی طاقتوں کی طرح مجھ میں، آنے والا وقت گرفت میں لینے کی طاقت بھی ہوتی۔

آنے والے وقت پر نہ انکا کو اختیار تھا، نہ مجھے۔ کون احتیاط نہیں کرتا اور خود بخود کون خطروں میں کودنے کی حماقت کرتا ہے؟ میں اپنے پچھلے دنوں کا حساب بے باق کرنا چاہتا تھا لیکن قرضے بڑھتے جاتے تھے اور داستان کہیں ختم نہ ہوتی تھی۔

میری سوچوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دلی اسٹیشن آگیا تھا۔ شاردا کا دلکش سراپا سنبھالتے ہوئے میں نے دلی کی سرزمین پر قدم رکھے، زرافشاں درخشاں کو کسی محفوظ جگہ رکھنے کے لیے پہلے تو شبن خاں کا قمار خانہ مل گیا تھا۔ اب شبن خاں جیل میں تھا اور اس کا قمار خانہ اس کے بدقماش ساتھی چلا رہے تھے۔ شبن خاں کی رہائی کے لیے مجھے انکا کو ساتھ رکھنے کی ضرورت تھی، اس طرح شاردا تنہا رہ جاتی، اسے ساتھ لے کر جیل جانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دلی میں اور کوئی جان پہچان بھی نہیں تھی، ہوٹل میں بھی قیام نہیں کیا جا سکتا تھا، میں مخمصے میں پڑ گیا۔ شبن خاں کی قیام گاہ میں پھر کسی سے ربط ضبط قائم کرتا اور وہاں شاردا کو محفوظ کرنے کا مرحلہ طوالت طلب تھا۔ شاردا کو ریلوے کے لاک اپ یا سرد خانے میں بھی نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ میری سمجھ میں ایک ہی بات آئی۔

اسٹیشن سے ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور جیل خانے کے نزدیک اتر گئے۔ ہم جیل کے گردونواح میں چل رہے تھے کہ دفعتاً شاردا ایک چیخ مار کے زمین پر گر گئی۔ میری مدد کو کئی راہ گیر آ گئے۔ شاردا بے ہوش ہو گئی تھی۔ راہ گیروں نے جلدی سے ایک ٹیکسی فراہم کی اور مجھے ڈاکٹر

بھٹناگر کے اسپیشل کلینک کا پتہ دیا، میں نے لشتم پشتم شاردا کو ٹیکسی میں دھکیلا اور اسپتال پہنچ گیا۔ تفصیل فضول ہے، ڈاکٹر بھٹناگر کو معقول معاوضہ دے کر میں نے ایک خاص کمرہ شاردا کے لیے محفوظ کرا لیا اور دو نرسیں اس کی خدمت پر مامور کرا دیں اور کمرہ مقفل کر کے اپنے گھر والوں کو اطلاع دینے اور مزید روپے فراہم کرنے کے بہانے وہاں سے چلا آیا۔ ڈاکٹر نے اسے میرے سامنے ہوش میں لانے کی کوشش کی لیکن شاردا کو کوئی مرض ہوتا تو وہ ڈاکٹر کے علاج سے ہوش میں آ جاتی۔ یہ مرض ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ پیسہ سب کچھ کرا دیتا ہے۔ اس میں ماورائی طاقتوں سے کہیں زیادہ طاقت ہے۔ مجھے یقین تھا کہ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا اور اس وقت تک ڈاکٹر بھٹناگر اور اس کی نرسیں شاردا کو ہوش میں لانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گی۔ شاردا کی طرف سے مطمئن ہو کے میں اسپتال سے باہر آیا اور پیدل ہی جیل کی طرف روانہ ہو گیا۔

جیل میں قیدیوں سے ملاقات کا ایک وقت مقرر ہے۔ انکا نے مجھے بتایا تھا کہ اس بار شبن خاں کو پولیس نے بری طرح پھانس

لیا ہے اور شبّن خاں کے ساتھی ایک دُوسرے بدمعاش راحت گینڈا سے مل گئے ہیں اور انھوں نے شبّن خاں کی سزا بڑھواتے اور اس کے اڈّے پر قبضہ جمانے کے لیے پولیس کا منہ بھر دیا ہے۔ بہرحال اب شبّن خاں کا دوست جمیل احمد خاں جیل کے دروازے پر موجود تھا۔ میں نے وہاں جاتے ہی غیر معمولی حرکتیں شروع کر دی تھیں جس سے تمام پہرے داروں کی توجہ میری جانب مبذول ہو گئی تھی۔ میں نے دھمکی کے انداز میں جیلر سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی جسے حسبِ توقع مسترد کر دیا گیا مگر پھر انکار کرنے والا پہرے دار اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکا بلکہ دھم سے زمین پر گر گیا اور میں نے حلق سے ایک نعرہ لگایا۔ میرے حلیے اور ناقابلِ فہم رویّے سے دوسرے پہرے دار سراسیمہ ہو گئے۔ میں جیل میں لمبے جھگڑے اور خون خرابے کے ارادے سے نہیں آیا تھا۔ جب میں نے باقی پہرے داروں کی ذات کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کیے تو وہ تمام کام چھوڑ کے میرے پیچھے لگ گئے۔ یہ ایک آزمودہ اور تیر بہدف نسخہ تھا، نتیجتاً وہ تمام لوگ ریشہ خطمی ہو گئے جنھوں نے پہلے مجھے کرختگی سے مخاطب کیا تھا۔ مجھے مزید کسی تاویل اور حجت کے بغیر جیلر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اِنکا میرے سر پہ پوری طرح مستعدی سے کھڑی تھی۔ جیلر نے خوش دلی سے میرا استقبال نہیں کیا لیکن میں نے جیلر کی ویران اور خشک آنکھوں میں اپنی آنکھیں جما دیں۔ اس سے میرا تعارف ایک پہنچے ہوئے بزرگ کی حیثیت سے کرایا گیا۔ وہ سٹپٹا سا گیا اور گھبراہٹ میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

"میں تیرے کان پکڑنے آیا ہوں۔ تو نے میرا ایک آدمی روک رکھا ہے۔" میں نے سختی سے کہا۔

"کون ہے وہ؟" اس بار اس نے سنبھل کر تلخی سے کہا۔

"شبّن خاں۔ میرا آدمی۔" میں نے خشونت سے کہا۔

"اوہ۔" وہ زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔ "شبّن خاں بدمعاش؟ تم اس نکمے سے ملنے آئے ہو؟"

"ہاں۔ تو نے صحیح سمجھا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے جواب دینے کے بجائے پہرے داروں کو ڈانٹا کہ وہ ایک پاگل آدمی کو کیوں اس کے کمرے میں لے آئے ہیں۔ پہرے داروں نے کچھ کہنا چاہا لیکن ان کی جگہ میں بول پڑا۔ "ان سے کیا پوچھتا ہے؟ میں خود آیا ہوں۔ چل، بُلا شبّن خاں کو، مجھے اس سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"جانتے ہو اس طرح جیل میں گھسنے کی سزا کیا ہے؟ میں تمھیں بھی اس کے ساتھ بند کر دوں گا۔" جیلر نے غصّے سے کہا۔

"چپڑی مار۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "تو مجھے بند کرے گا؟"

"لے جاؤ اسے۔" جیلر نے پہرے داروں کو حکم دیا۔

پہرے دار میری طرف بڑھے، میں نے تساہل سے کام لیا۔ جیلر نے گرج کے انھیں دوبارہ حکم دینا چاہا لیکن میرے ایک اشارے پر جیلر کی تلخ و تند آواز حلق میں اٹک گئی۔ وہ اپنا گلا پکڑ کے رہ گیا ایک لمحے میں اس کا عجیب حال ہو گیا۔ وہ میری سمت خوف سے بڑھا اور کرب سے اپنے گلے پر ہاتھ رکھ کے اُچھلنے کودنے لگا۔

"تیری آواز کہاں گئی؟ بولتا کیوں نہیں؟" میں نے چیختے ہوئے پوچھا اور اپنی اُنگلی کا اشارہ کیا۔ جیلر کی سہمی سہمی آواز نکلی۔ اُس نے فوراً مجھے کُرسی پیش کی اور پہرے داروں کو باہر جانے کا حکم دیا۔

"میں آپ کو غلط سمجھا بڑے صاحب، مجھے معاف کر دیجیے، مجھ سے پہچاننے میں کوتاہی ہو گئی۔" وہ فدویانہ انداز میں بولا۔

"چل اب زیادہ باتیں نہ بنا۔ شبّن خاں کو بُلا۔"

"ابھی حاضر کرتا ہوں، اس کا مقدمہ عدالت میں چل رہا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ یاد رکھ وہ میرا آدمی ہے۔"

"میں شرمندہ ہوں۔" اس نے فوراً شبّن خاں کو کمرے میں لانے کا حکم دیا اور مجھ سے معذرت چاہنے لگا۔ شبّن خاں کے آنے تک میں نے جیلر کے بارے میں چند حقائق بیان کیے تو وہ اور فدوی بن گیا۔ اس نے میرے لیے ناشتہ اور چائے منگوائی۔ تھوڑی دیر میں شبّن خاں اندر آ گیا اور مجھے دیکھتے ہی مچل گیا۔ "واہ اُستاد، تم یہاں؟ میں تو سمجھا تھا بھول گئے۔"

"میں نے تم سے وعدہ کیا تھا شبّن خاں! سناؤ کیس کہاں تک پہنچا؟" میں نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

شبّن خاں نے جیلر کی طرف دیکھا، میں نے محسوس کیا کہ وہ جیلر کی موجودگی سے گھُٹ رہا ہے۔ "اس کا خیال کر رہے ہو؟" میں نے جیلر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کی طرف سے بے فکر رہو، یہ ہماری باتیں نہیں سُن رہا ہے۔"

"کیسے نہیں سُن رہا ہے؟ وہ ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔"

"یہ مت پوچھو کہ وہ کیسے نہیں سُن رہا، وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے شبّن خاں! کام کی بات کرو۔"

"وہ بالکل ٹھیک تو بیٹھا ہے۔" شبّن خاں ڈرتے ہوئے بولا۔

"وہ بہرا ہو گیا ہے، تھوڑی دیر کے لیے میں نے اسے بہرا کر دیا ہے،"

ہمارے ہاں
فنّی مہارت
قوم کی امانت ہے
حکومت کے زیرِ انتظام پاکستان انجنیئرنگ کمپنی انجنیئرنگ کے میدان میں قیادت کے بلند سے بلند مقامات کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یہ قیادت ہمیں پُرمعنی ٹیکنالوجی کے ذریعے پچھلے چالیس برس میں اہم ترین خدمات ادا کرنے کے صلے میں حاصل ہوئی ہے۔ بیکو کے نام سے تیار کردہ برقی موٹریں اور ٹربائن پمپ پاکستان کے وسیع علاقوں میں سیم اور تھور کا مقابلہ کرنے میں مصروف ہیں۔ ہمارے اپنے ہی بنائے ہوتے برقی ترسیل کے فولادی کھمبے ملک بھر میں برق رسانی کے اہم ستون ہیں۔ ہائیڈرولک ریگولیٹر گیٹ اور ہمارے نہری نظام کے آلات بھی بیکو ہی کے نام کو سربلند کیے ہوتے ہیں۔ بھاری مصنوعات کی تیار کنندہ کمپنی کی حیثیت سے ہم اپنے ملک کی بڑی اہم ترین صنعتوں کے لیے مکمل پلانٹ اور متبادل یونٹ تیار کرنے میں ہر دم مصروفِ کار ہیں۔
پاکستان انجنیئرنگ کمپنی لمیٹڈ
GOVERNMENT REGULATED INDUSTRIES
PEC-13/73SL

وہ ہماری باتیں نہیں سن سکتا۔" میں اسے تفصیل کیا بتاتا کہ انکا اس کے سر پر پہنچ چکی ہے۔

شبن خاں نے تصدیق کے لیے جیل کے انتظام پر ایک غلیظ گالی دی، جیلر خاموش رہا، اس پر شبن خاں کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی اور وہ جھکتے ہوئے بولا "تم کیا آدمی ہو خاں صاحب! تم کوئی جادوگر ہو۔"

"میں تمہارا دوست ہوں شبن خاں! اس وقت بس یہی بات ذہن نشین رکھو۔"

"میں تمھیں یہاں سے لے جا سکتا تھا۔ میرے لیے یہ کچھ مشکل نہیں ہے۔ ابھی اسی وقت جیلر تمہاری رہائی کے احکام صادر کر سکتا ہے مگر میں چاہتا ہوں، تم عدالت سے باعزت بری ہو جاؤ اور نئے سرے سے زندگی شروع کرو۔"

مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے" شبن خاں جیل کا پرانا آدمی ہے۔ یہاں اپنے بڑے ٹھاٹ ہیں۔ میں تو کسی دن چھوٹ ہی جاؤں گا، تم بتاؤ استاد! نگینے ملے یا نہیں؟"

شبن خاں کا اشارہ زرافشاں درخشاں کی طرف تھا۔ میں نے اسے مختصراً بتایا کہ دونوں لڑکیاں نہ صرف مجھے مل گئی ہیں بلکہ خیریت سے محفوظ جگہ پہنچ گئی ہیں۔ میں خاموش ہوا تو شبن خاں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا "کہاں سے اڑا لائے تھے انھیں؟"

"فضول باتیں مت کرو، سنو، راحت گینڈا تمہارا دشمن ہے، وہ کھل کر تمہاری مخالفت کر رہا ہے۔ تمہارے چند ساتھی بھی اس سے مل گئے ہیں، کہو تو میں ان سب کو ٹھکانے لگا دوں؟"

"وہ ولدالحرام؟" شبن خاں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ "استاد! میں جیل کے اندر ہوں لیکن باہر کی ایک ایک خبر مجھے اپنے مخبروں کے ذریعے ملتی رہتی ہے۔ مجھے یہاں سے باہر نکلنے دو، راحت گینڈے کی لاش کے ٹکڑے پولیس چوکیوں کے آگے بکھرے نظر آئیں گے۔"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی شبن خاں۔" میں بڑے وثوق سے بولا "تم جب چاہو، باہر جا سکتے ہو۔"

"سچ بتاؤ استاد! تم ہو کیا بلا؟" وہ بائیں آنکھ جھپکا کے معنی خیز لہجے میں بولا "تم کوئی عجیب شے ہو۔"

"تمہاری اگلی پیشی کب ہے؟"

"یہ بھی پولیس والے جانیں، کون تاریخیں یاد رکھے۔"

"ٹھیک ہے، میں پہلے تم سے ملنا چاہتا تھا۔ اب تم بے فکر رہو، میں دلی آ گیا ہوں، ممکن ہے کل یا پرسوں تمہاری پیشی ہو جائے۔ ایک دو پیشیوں میں تمہارا کام ہو جائے گا۔"

"تم جانو۔ میں تم پر اعتماد کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے شبن خاں! اب ذرا توجہ سے ایک بات سنو، عدالت میں اگر تمھیں کوئی دقت پیش آئے تو انکا کا نام لینا، ویسے وہ وہیں موجود ہو گی اور تمہارے سامنے حیرت انگیز باتیں پیش آئیں گی، تم خاموشی سے انھیں دیکھتے رہنا، زیادہ تیزی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔"

"یہ انکا کون ہے؟"

"تمھیں سب پتہ چل جائے گا، میں اب جا رہا ہوں۔"

"ارے یہ جیلر کیسا خاموش بیٹھا ہے خاں صاحب؟ خدا کی قسم کمال کر دیا۔"

"یہ ابھی ہوش میں آتا ہے۔" میں نے انکا کو اشارہ کیا۔ اچانک جیلر ششدر نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھنے لگا۔

شبن خاں نے اسے سلام کیا اور کمرے سے چلا گیا۔ میں نے جیلر کے ساتھ چائے پی اور اسے چند نصیحتیں کر کے چلا آیا۔

شاردا اسپتال کے کمرے میں ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ وہ میرے جاتے ہی ہوش میں آ گئی اور میں اسے وہاں سے لے آیا، اب میں کسی بھی ہوٹل میں ٹھیر سکتا تھا اور شاردا کے ساتھ اطمینان سے چند روز گزار سکتا تھا کیونکہ اب باقی کام انکا کا رہ گیا تھا۔ ہم جب ہوٹل کے ایک شان دار کمرے میں داخل ہوئے تو ماحول بدلنے کی وجہ سے شاردا کی طبیعت کسی قدر لگنے لگی۔ روپے کی کچھ کمی محسوس ہوئی۔ انکا نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ ہوٹل میں ایک شخص کا ایک سراپا شباب لڑکی کے ساتھ تنہا ٹھیرنا اور اس سے کنارہ کش رہنا ایک بہت ہی اذیت ناک امتناع تھا۔ میں اپنے نفس سے لڑتا رہا۔ انکا مجھے چھیڑتی رہی۔ شام کو میں شاردا کو لے کے دلی کی سیر کے لیے نکل گیا۔

پولیس کی فائل شبن خاں کے خلاف ثبوتوں سے بھری ہوئی تھی۔ انکا اس دن بہت مصروف رہی۔ تیسرے دن شبن خاں کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس پر بہت معمولی جرح ہوئی اور اسے باعزت بری کر دیا گیا۔ نہ عدالت میں فائل پیش کی جا سکی نہ سرکاری وکیل کے منہ سے شبن خاں کے خلاف کوئی لفظ نکل سکا نہ جج نے فیصلہ لکھنے میں کوئی تامل کیا۔ انکا مختلف سروں پر کودتی اور شر انگیزیاں کرتی رہی۔ میں اسی طرح شبن خاں کو رہا کرانا چاہتا تھا ورنہ انکا کو جیلر سے رہائی کا حکم صادر کرانے میں دیر نہیں لگتی اور ان کاموں میں، میں اتنا مشاق ہو گیا تھا کہ شبن خاں کا معاملہ تو بہت آسان نظر آتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شبن خاں کس وقت رہا ہو گا۔ چنانچہ میں ہوٹل کا کرایہ ادا کر کے اور

شار دا کو ایک نفیس ساری میں ملبوس کرا کے اسٹیشن پہنچ گیا۔ میں فرسٹ کلاس کی انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ شبّن خاں آموجود ہوا۔ اِنکا اسے وہیں لے آئی تھی۔ راحت گینڈے کے اڈّے پر چھاپا پڑ چکا تھا اور اس کے تمام ساتھی گرفتار کر لیے گئے تھے۔ شبّن خاں نے انتظار گاہ میں قدم رکھا تو انکا اس کے سر سے اُتر گئی اور شبّن خاں ہوش و حواس میں آگیا۔ وہ اپنے چاروں طرف حیرانی سے دیکھنے لگا۔ میں اس کے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ وہ دوڑ کر میرے گلے لگ گیا۔ "خاں صاحب! یہ سب کیا ہوگیا؟" وہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔

"میں نے جو وعدہ کیا تھا شبّن خاں! وہ پورا ہوگیا۔"

"تم وہ نہیں ہو جو مجھے نظر آتے ہو۔" وہ آب دیدہ ہو کر بولا۔ "مجھے بتاؤ، تم کون ہو؟"

"شبّن خاں!" میں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "ہاں میں وہ نہیں ہوں۔"

"پھر تم کیا ہو؟"

"چھوڑو بھئی۔ یہ بتاؤ، اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں اب تمھارے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہوں۔ تم نے ساتھ نبھایا ہے تو اب مجھے اپنے ساتھ ہی رکھو۔"

"سوچ لو۔ تمھارا اڈا، وہ قمار خانہ؟"

"میں اسے جلا دوں گا، تم نے مجھ میں سویا ہوا آدمی بیدار کر دیا ہے، مجھے اپنے قدموں میں رہنے کی اجازت دے دو خاں صاحب!" شبّن خاں رقّت انگیز حالت میں گویا ہوا۔

شبّن خاں جس قماش کا آدمی تھا، اس کا تذکرہ میں پہلے ہی کر چکا ہوں لیکن اس وقت اس سرکش اور فتنہ جو شخص کی حالت کسی نرم و نازک اور سادہ لوح دیہاتی کی سی تھی۔ میں نے شبّن خاں کو اپنے قریب ہی بٹھا لیا، اس کی پشت پر ہاتھ رکھا اور شار دا سے اس کا تعارف کرایا۔ شبّن خاں نے اس بار مجھ سے کسی نگینے کے بارے میں نہیں پوچھا۔ اس نے شار دا کو بہت مہذب لہجے میں سلام کیا۔ میں شبّن خاں کے لیے کپڑے پہلے ہی لے آیا تھا۔ اس نے ویٹنگ روم کے غسل خانے میں جا کے کپڑے تبدیل کر لیے، میں نے اس کے لیے نیا نام تجویز کیا۔ "آج سے تمھارا نام شبّر علی خاں ہے لیکن میں تمھیں شبّن میاں ہی کہوں گا۔"

"آپ جو چاہیں کہیں۔" شبّن خاں مارے احترام کے تم سے آپ پر آگیا تھا۔ "آپ میرے بڑے بھائی ہیں۔"

"تمھیں نئی زندگی مبارک ہو شبّن خاں، کامیابیاں تمھارے قدم چومیں، میں نے بھی تمھیں اپنا بھائی کہا ہے، میں تمھیں اپنے گھر کے لوگوں میں شامل سمجھتا ہوں اور وہیں تمھیں لے جا رہا ہوں۔" میں نے حسرت سے کہا۔

"آپ جہاں چاہیں لے جائیں، اب میری ڈوری آپ سے بندھی ہوئی ہے۔" شبّن خاں نے سر جھکا کے کہا۔

"آؤ چلیں۔" میں نے شار دا کو اشارہ کیا۔

◉

میں پہلے شار دا کو گلبرگے میں چھوڑنا چاہتا تھا، ایک وہی دار الامان ان بدنصیب لڑکیوں کے لیے رہ گیا تھا۔ رکن الدین کے ہاں جاتے ہوئے مجھے جھینپ سی ہو رہی تھی لیکن اس کے گھر کے سوا اور کون سا گھر تھا؟ شبّن خاں اور شار دا کی تطہیر قلب کے لیے رکن الدین کے گھر سے اچھی جگہ کوئی نہیں تھی۔ میں نے پورا ڈبّا ہی اپنے لیے محفوظ کرالیا تھا، ڈبّے کے باہر 'ریزروڈ' کا کارڈ لگا ہوا تھا۔

میں شبّن خاں اور شار دا کو اپنی زندگی کے بعض واقعات سنا کر ان کے دلوں سے اپنا خوف دُور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سفر بہت پُر لطف طریقے سے کٹ رہا تھا۔ اِنکا بھی مزے سے سو رہی تھی۔ میں نے شار دا کی حفاظت کے خیال سے ڈبّا اپنے ایک عمل سے جکڑ دیا تھا۔ ناگپور کے اسٹیشن پر شبّن خاں نے دروازہ کھول دیا اور نیچے اُتر کے کچھ خریدنے چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کئی پتّے تھے۔ اس کے پیچھے ہی ایک دراز ریش سادھو اندر داخل ہو گیا۔ میں اپنی برتھ سے چیخا "چلے جاؤ۔ یہاں کیوں آئے ہو؟"

سادھو مسکرانے لگا اور اس کی ہیبت ناک آنکھوں میں نفرت سمٹ آئی۔ شبّن خاں اور شار دا دونوں سہم گئے تھے۔ میں نے شبّن خاں کے ہاتھ سے تمام پتّے لے کر کھڑکی سے باہر پھینک دیے۔ سادھو نے شبّن خاں کی نظروں کے سامنے پتّوں پر ایک جلتا ہوا کوئلہ رکھ دیا تھا۔ شبّن خاں کو پتہ نہیں چلا اور وہ ڈبّے میں داخل ہو گیا۔ اسی وقت ڈبّے سے میری جکڑ بندیاں ختم ہو گئیں اور سادھو کو اندر آنے کا موقع مل گیا۔

"جمیل احمد خاں! لڑکی مجھے دے دو۔" سادھو نے گرج دار آواز میں مجھے حکم دیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مجھے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا۔ وہ ایک بڑا سادھو تھا۔ میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

"یہ لڑکی مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

"میں کہتا ہوں اسے واپس کر دو۔" سادھو نے برہمی سے کہا۔ "تم بدری ناتھ کو میرے حوالے کر دو۔"

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"میں یہ لڑکی ابھی لے جا سکتا ہوں۔"

"تم یقیناً لے جا سکتے ہو مگر اس سے پہلے تمھیں جمیل احمد خاں کی لاش سے گزرنا ہوگا اور جمیل احمد خاں کو ختم کرنے کے لیے ابھی تمھیں پچاس سال نالکھ آشرم میں گزارنے پڑیں گے۔"

"میں تمھاری لاش سے گزر سکتا ہوں مگر تمھیں مارنا نہیں چاہتا۔" سادھو نے بے نیازی سے کہا۔

"تو پھر تم اس لڑکی کو نہیں لے جا سکتے۔"

"مجھے مجبور نہ کر، مورکھ!"

"یہ لڑکی میری ہے، تم اپنی شکتیاں آزما لو، میں اسے نہیں جانے دوں گا۔"

"یہ ایک ہندو پنڈت کی لڑکی ہے، اس پر تمھارا کوئی ادھیکار نہیں ہے۔" سادھو نے بپھر کر کہا۔

"بدری ناتھ کمینہ بھی تو ہندو ہے؟ تم ایک طرف جرم اور ظلم کی پشت پناہی کرتے ہو اور دوسری طرف ادھیکار کی بات کرتے ہو؟ تم ایک بڑے سادھو ہو۔ یہ لڑکی تمھارے ساتھ نہیں جا سکتی۔"

"مورکھ! یہ لڑکی تمھارے ساتھ خوش نہیں رہے گی۔ تم اسے اس کی مرضی کے بغیر اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔"

"اگر یہ فیصلہ ہو جائے کہ یہ کس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہے تو میں اس سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہوں، سوچ لو تمھیں یہ شرط منظور ہے؟"

سادھو چند لمحے سوچتا رہا، پھر شاردا سے بولا "لڑکی! تو ایک ہندو پنڈت کی لڑکی ہے کیا تو نے خوب سوچ سمجھ لیا ہے کہ تو اس کے ساتھ جانا چاہتی ہے یا میرے ساتھ؟ خوب وچار کر لے۔ یہ مسلمان ہے اور اس نے کئی ہندو پنڈتوں پجاریوں کو مار ڈالا ہے۔ میرے ساتھ ین اور شانتی کے راستے پر چلنا چاہتی ہے یا اس کی طرف؟ بتا! اگر تو اس سے خوف زدہ ہے تو یقین رکھ۔ میں تجھے لے جانے کی شکتی رکھتا ہوں۔"

"ہاں شاردا! بتا دو ـــ تم فیصلہ کر دو۔" میں نے شاردا سے کہا۔ میں اس سادھو سے کوئی لڑائی مول لینا نہیں چاہتا تھا، انکا نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا۔

شاردا دیر تک تذبذب میں مبتلا رہی۔ سادھو اور میں اس سے بار بار پوچھتے رہے۔ شبن خاں اس کی طرف حسرت ناک نظروں سے دیکھتا رہا۔ آخر بڑی مشکل سے شاردا کے لب کھلے، سادھو نے انکا کو بھی اس کے سر پر جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ انکا پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ آخر شاردا نے ہمت کی۔ اس نے میری طرف اشارہ کیا "میں ان کے ساتھ ہی جاؤں گی۔" یہ کہہ کر اس نے گردن جھکالی۔

"تو نے ـــ تو نے فیصلہ دے دیا ہے۔" سادھو چونک کر بولا، پھر آہستگی سے کہنے لگا "ٹھیک ہے، تیری مرضی۔ بھگوان تجھے خوش رکھے۔" وہ بڑبڑانے لگا اور مجھ سے مخاطب ہوا "جمیل احمد خاں! تو جیت گیا۔ میں جا رہا ہوں۔"

میں نے اسے بٹھانا چاہا مگر وہ فوراً پلیٹ فارم پر اتر گیا اور بھیڑ میں گم ہو گیا۔ میں نے شاردا کے سر پر ہاتھ رکھ کے عہد کیا "شاردا! میں تمھیں مایوس نہیں کروں گا۔"

ناگپور سے گاڑی چلی تو میں نے ڈبا دوبارہ محصور کر لیا۔ کلبر گے تک ہر طرف خطرہ ہی خطرہ تھا، گاڑی تیز رفتاری سے چل رہی تھی کہ اچانک ایک گم نام اسٹیشن پر ٹھیر گئی اور کسی نے زور سے میرے دروازے پر ضرب لگائی۔ چٹخنی ٹوٹ کر گر گئی اور دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھل گیا۔ میں چوکنا ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے میری آنکھیں پتھرا گئیں، سید مجذوب لاٹھی پٹختا اوپر کی سمت آ رہا تھا۔ میں دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔ پھر میں نے اسے سہارا دے کر اندر لے جانا چاہا تو اس نے مجھے دھکا دے دیا۔

"پیر و مرشد! تم؟" میں نے اس کے جلال سے مبہوت ہو کے کہا۔

"تمھی یہاں آ سکتے تھے۔"

سید پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ شاردا نے اس کی خدمت میں پانی پیش کیا۔ سید نے اس کے سر پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھا اور آدھا پانی پیتے ہوئے اور آدھا گراتے ہوئے کہنے لگا "یہ میری ہے، اسے مجھے دے دے اور اس کے بدلے میں یہ لاٹھی لے لے۔"

جمیل احمد خاں اور انکا کی اس حیرت انگیز، پُراسرار سرگزشت کا باقی حصہ دو اقساط پر مشتمل ہے، باقی واقعات کے لیے آئندہ شمارہ ملاحظہ فرمائیے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

عورت - نسوانیت
حسن اور لطافت کا پیکر...
مگر یہ مردوں کی طرح شیو کیوں؟

کیسی انوکھی بات! کہ آپ ہیں تو عورت! لیکن اپنے غیر ضروری بالوں کو مردوں کے انداز میں شیو کر کے دور کریں!! اور اب تو این فرنچ کریم یا لوشن آپ کے بازوؤں کے نیچے اور ٹانگوں کے بالوں کو یوں صاف کر دیتی ہے جیسے وہاں بال تھے ہی نہیں۔ این فرنچ بہت ہی محفوظ ہے۔ اس کے استعمال کا فائدہ یہ ہے کہ نہ کٹنے کا اندیشہ۔ نہ جلن کی مصیبت۔ نہ ہی داغ دھبے دیکھئے' آئندہ نہ تو بلیڈ استعمال کیجئے اور نہ ہی بالوں کو نوچئے یہی نسوانیت کا انداز ہے۔ اسی میں دل کشی ہے

این فرینچ

جلد کے غیر ضروری بالوں کو دور کرنے کے لئے سب سے معیاری کریم اور لوشن

لندن - پیرس - روم

BOND AFHR(U)-2-73

خوش ذوق قارئین کے لیے

دُنیا کی چند شاہکار کہانیوں میں سے ایک

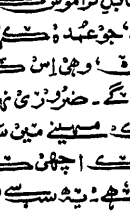

★ ترجمہ ۔ ضیا الرشید

اِس ماہ خاص کہانی کے اِن صفحات میں ایک ناقابلِ فراموش کہانی شائع کی جا رہی ہے، جو عمدہ کہانیوں کے لیے ترستے ہیں، وہی اِس کا لطف اُٹھا سکیں گے۔ ضروری نہیں کہ آپ ایک مہینے میں سو بُری کہانیاں پڑھیں، ایک اچھی کہانی پڑھ لیں تو یہی بہت ہے۔ یہ سب سے قیمتی بات ہے۔

ایک تحریر جسے آپ محسوس کریں گے

کوئلے کی کان کے پہلے سائرن نے گویا اسپرنگ ہل کا سورج بھی بیدار کر دیا ہے۔ اسپرنگ ہل شمالی کینیڈا کا ایک چھوٹا سا شہر ہے جہاں ہزاروں فٹ گہری کوئلے کی کانیں ہیں۔ مشرق کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے آگے اُفق پر قرمزی اودے اور گلابی رنگ نمایاں ہونے لگے ہیں۔ درختوں پر گھونسلوں میں ننھے پرندے چہچہا رہے ہیں اور ماں باپ ان کے معصوم تقاضوں پر گرم گھونسلے چھوڑ کر یخ بستہ فضا میں اُڑتے جا رہے ہیں۔ گلاب کی خوں رنگ پنکھڑیوں پر شبنم کے موتی ٹکے ہوئے ہیں۔ گولر کے ایک درخت تلے ایک گلہری تیزی سے سُرخ پکے ہوئے گولر کا ناشتہ کر رہی ہے۔ برگد کے ایک درخت کے تنے سے چیونٹے اور چیونٹیاں اپنی اپنی مخصوص برق رفتاری کے ساتھ نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ شہتوت کے ایک چھتے سے شہد کی مکھیوں کا سرگرم غول نکل کر ستار پر تمام کلیان کے انتہائی تیز سُروں کی طرح فضا میں پھیل گیا ہے اور بادلوں کے دُھنی ہوئی روئی جیسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے گویا ستار کی ہنس دھن پر ایک دوسرے کی طرف چلنے لگے ہیں۔ سورج مکھی اپنے محبوب کی پہلی جھلک دیکھنے کے لیے اپنا رُخ مشرق کی طرف کیے ہوئے ہیں۔ شبنم اور کُہر میں بھیگی بھیگی خنک ہوا میں مٹی کی سوندھی سوندھی مہک اور گلاب اور موتیے کی بھینی بھینی خوشبو ہے۔ اس میں ناریل کے رس کی شیریں مٹھاس اور نیلوفر کا خمار ہے مگر دم بدم اس روح پرور ہوا میں اسپرنگ ہل کے مکانوں کی چمنیوں سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کی بُو بھی ملتی جا رہی ہے۔

کان کن معمول کے مطابق گھروں سے نکل کر گلیوں اور بازاروں سے ہوتے ہوئے کام پر جا رہے ہیں۔ انھوں نے حفاظتی فل بُوٹ پہن رکھے ہیں اور سروں پر فولادی ٹوپیاں لیے ہوئے ہیں۔ ہر کان کن کے ہاتھ میں اس کا ناشتے دان ہے اور تمباکو نوش دن بھر کا آخری تمباکو پیتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے چہروں پر نہ تو خوشی کے آثار ہیں اور نہ ہی ان سے کسی قسم کے غم کا اظہار ہو رہا ہے۔ ان کی چال میں نہ تو گرم جوشی ہے اور نہ ہی بیزاری شاید یہ لوگ بھی کولھو کے بیل کی طرح زندگی کے اس معمول کے احساس سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔

ان میں چند عورتیں بھی ہیں جو زیادہ تر کان کے باہر ہی کام کرتی ہیں مگر ان میں سے اکثر کو تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے کان کے اندر بھی اترنا پڑتا ہے۔ یہ کانیں کئی جگہ سے کئی برس سے کُھد رہی ہیں اور اب تو بارہ تیرہ ہزار فٹ کی گہرائی میں ایک شہر سا آباد ہو گیا ہے۔ ہر کان کے منہ پر دو دو دُھرے لگے ہوئے ہیں۔ ایک سے زہریلی ہوا کان کے اندر بچھے ہوئے پائپوں کے جال کے ذریعے خارج ہوتی ہے اور تازہ ہوا نیچے جا کر پائپوں کے ذریعے پھیلا دی جاتی ہے۔ دوسرے دُھرے میں دو دو لفٹیں لگی ہوئی ہیں جن میں سے ایک کوئلہ نکالتی ہے اور دوسری مزدوروں کے آنے جانے کے لیے ہے۔ ان کانوں میں کمرے اور ستون کے طریقے پر کھدائی ہوتی ہے۔ کان کن کوئلہ تراشتے ہوئے کمرہ بناتے جاتے ہیں جو تقریباً پندرہ فٹ لمبا، بارہ فٹ چوڑا اور سات فٹ اُونچا ہوتا ہے۔ اس کمرے کی چھت کے سہارے کے لیے دو یا تین ستون تراشے جاتے ہیں اور جب چھت اور دیواروں کا کوئلہ ختم ہو جاتا ہے تو کان کن دوسرا کمرہ تراشنے لگتے ہیں۔ ان کانوں میں

سب رنگ

Waqar Azeem Paksitanipoint.com

اس قسم کے ہزاروں کمرے بنے ہوئے ہیں۔ جن میں سے ہو کر کان کن کھدائی
والے کمرے میں پہنچتے ہیں۔ ان کمروں کا سلسلہ زمین کے اندر میلوں پھیل
چکا ہے اور نہ جانے کتنا اور پھیلے گا۔

اسپرنگ ہل کے بوڑھے کان کن اکثر نئی پود کو اپنے زمانے کے
حالات سناتے ہوئے کہتے ہیں: تم لوگ بہت خوش قسمت ہو۔ زہریلی
گیسیں باہر نکالنے کا انتظام اب بہت بہتر ہے۔ کئی اعلا تنخواہیں پانے والے

ماہرین ہر وقت تم لوگوں کے لیے حفاظتی تدابیر سوچتے رہتے ہیں۔ ذرا خطرہ ہو تو کام بند کر دیا جاتا ہے اور اب تو تمھارے لیے ایسے ایسے سہل اوزار ایجاد ہو گئے ہیں کہ تمھیں بہت کم جسمانی قوت صرف کرنا پڑتی ہے۔ کاش تم نے ہمارا زمانہ دیکھا ہوتا۔ آئے دن دو چار مزدوروں کا دب کے مر جانا معمولی بات تھی۔ ہمیں کام پر جاتے وقت لوٹ آنے کا یقین نہیں ہوتا تھا۔۔۔۔"

کوئی نوجوان اس قسم کی باتیں سن کر کہتا "مگر بڑے میاں! خطرہ تو اب بھی رہتا ہے اور اب بھی اکثر حادثے ہوا کرتے ہیں۔"

مگر یہ بوڑھے دُنیا بھر کے بوڑھوں کی طرح بھلا یہ کیسے مان لیں کہ اس نئی پود کو بھی ان کی طرح موت سے کھیلنا پڑتا ہے اور اکثر تمام حفاظتی تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں۔

کام پر جانے والوں میں ایک شخص جو بھی تھا عمر یہی چوبیس کے قریب ہو گی مگر بیوہ ماں نے ایسی کڑی نگرانی کے ساتھ اس کی پرورش کی تھی کہ وہ بات چیت اور نشست و برخاست سے ابھی اٹھارہ انیس برس کا معلوم ہوتا تھا۔ شرمیلا کم گو اور الگ تھلگ رہنے والا جو گزشتہ چند ماہ سے اسپرنگ ہل میں مشہور ہو گیا تھا۔ شہرت کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی، اگر جو کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو کوئی دھیان بھی نہ دیتا۔ جو کی ماں کو اس کی اس شہرت کا شدید احساس تھا اور وہ ہر ملنے والے سے خود بخود کہنا شروع کر دیتی تھی۔ "آج کل کا زمانہ ہی ایسا ہے۔ اس کم بخت بیوہ نے جو پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے ہیں۔ جو کا باپ ہوتا تو اس ذلیل چھوکری کی خبر لیتا۔" جو کا باپ کان کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ اس وقت جو ماں کے پیٹ میں تھا۔

جو کے ساتھی جب اس معاشقے کے متعلق اس سے پوچھتے تو وہ مسکرا کر نگاہیں چرا لیتا تھا۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ "یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی کیونکہ جو بہر حال ماں کا تابع ہے اور ماں بھی وہ جس نے اپنی جوانی بیٹے کی پرورش کی نذر کر دی۔ وہ بھلا ایک بدنام بیوہ کو اپنی بہو بنانے پر کب تیار ہو گی؟"

کام پر جانے والی عورتوں میں میری بھی تھی۔ میری صرف آٹھ برس کی تھی کہ اس کا باپ ہالینڈ سے اسپرنگ ہل آ گیا تھا۔ وہ ایک اچھا کاریگر تھا اور پہلے پہاڑی کانوں میں کام کر چکا تھا مگر اس کی صحت زیر زمین کان کی مشقت کا بار نہ اٹھا سکی اور وہ کچھ عرصے بیمار رہنے کے بعد چل بسا۔ اس وقت میری کی عمر بارہ برس کی ہو گی۔ کئی سال تک میری کی ماں کان میں کام کرتی رہی اور میری کی پرورش ہوتی رہی۔ میری جب اٹھارہ برس کی تھی تو کان کا جواں سال مزدور بنیٹ اس کی زندگی میں داخل ہوا اور چند ماہ بعد ان کی شادی ہو گئی۔ بنیٹ نے میری کی ماں کا کام چھڑا دیا اور اس طرح ماں بیٹیاں خوش حال زندگی بسر کرنے لگیں۔ بنیٹ کو میری سے والہانہ محبت تھی۔ اس نے میری کو یہ کہہ کر اچھی خاصی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ فلم ایکٹریس انگرڈ برگمین سے ملتی جلتی ہے۔ بنیٹ کا یہ خیال ایک حد تک صحیح بھی تھا کیونکہ مسکراتے وقت میری کی آنکھیں بالکل انگرڈ برگمین کی طرح بچ جاتی تھیں اور اس کے صحت مند رخسار ابھر کر اس کی مسکراہٹ دل نشین بنا دیتے تھے۔ میری نے بنیٹ کے ہمراہ انگرڈ برگمین کی صرف ایک فلم دیکھی تھی مگر بنیٹ میری کو یہ خطاب فلم دیکھنے سے بہت پہلے دے چکا تھا۔

تقریباً پونے دو برس کا عرصہ پلکیں جھپکاتے گزر گیا تھا۔ پھر ایک روز کان کے اندر ایک کمرے کی چھت نے گر کر بنیٹ کو میری سے چھین لیا تھا۔ میری کے سوا سارا اسپرنگ ہل بنیٹ کی موت جلد ہی بھول گیا تھا کیونکہ اسپرنگ ہل والوں کے لیے بنیٹ کی موت کوئی نئی بات نہیں تھی۔

میری اور اس کی ماں پھر اسی مقام پر آ گئی تھیں جہاں سے انھوں نے خوش حالی کا سفر شروع کیا تھا مگر اس مرتبہ ماں کی جگہ میری نے کام شروع کیا تھا۔ میری کو اچھے اچھے کپڑے پہننے اور گھر سجانے کا شوق تھا اور وہ ہر تنخواہ پر سجاوٹ کی کوئی نہ کوئی خوب صورت چیز لے آتی تھی اور اس کی ماں اس کی فضول خرچی پر کڑھتی رہتی تھی۔ میری سے کئی کان کنوں نے شادی کی درخواست کی تھی مگر اس کی نظریں شاید کسی بنیٹ کی تلاش میں تھیں۔ میری دراصل کان کنوں میں رہتے ہوئے اور کان میں کام کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کو عام لوگوں کی سطح سے بلند سمجھتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر اکثر مہربان مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی جس نے اسپرنگ ہل کے چند اوباشوں کو غلط فہمی میں ڈال دیا تھا مگر اس مسکراہٹ میں برتری کا جو احساس پنہاں تھا اسے اسپرنگ ہل کے نوجوانوں میں صرف جو ہی دیکھ سکا تھا۔

میری کو جو کا بنیٹ کی طرح کھویا کھویا رہنے اور کچھ سوچتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دینے کہ [illegible] بہت پسند تھا۔

خشخشی داڑھی والا بھاری جسم کم ٹام اسپرنگ ہل کا مقبول ترین شخص تھا۔ خوش مزاج، خلوص کیش اور دن رات شراب پینے والا ٹام۔ جوزفین کے ساتھ بیس برس پیشتر شادی کے بعد آج تک ٹام گرجا نہیں گیا تھا۔ ٹام کو بعض لوگ دہریہ بھی کہتے تھے مگر جنھوں نے اسے قریب سے دیکھا تھا۔ ان کے نزدیک ٹام میں ہر وہ صفت موجود تھی جو ایک خدا پرست میں ہونی چاہیے۔

ٹام نے پیسے کا کبھی احترام نہیں کیا تھا۔ پیسہ پروانے کی طرح اس

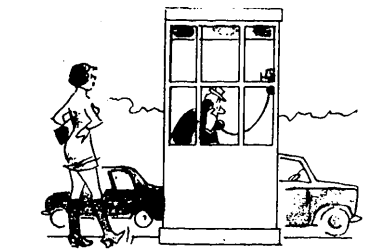

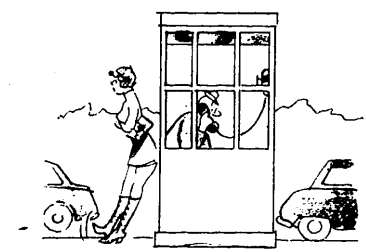

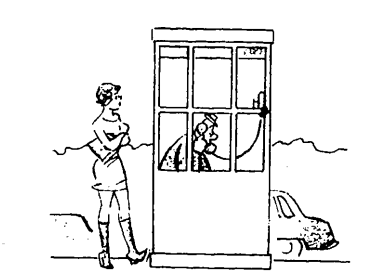

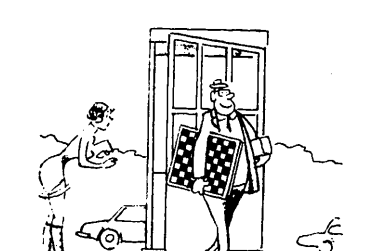

بے وفاشمع کے پاس آ رہا تھا مگر گزشتہ چند سال سے ٹام ایک لگی بندھی آمدنی کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے جوا، سٹا وغیرہ بالکل چھوڑ دیا تھا اور اب وہ بیڑا اور شراب کے سہارے سنجیدہ زندگی بسر کر رہا تھا۔

ٹام کا باپ اسپرنگ ہل میں جوتے بنانے کا ماہر کہلاتا تھا اور اسے ٹام کو اعلا تعلیم دلانے کا جنون تھا۔ باپ کی خواہش کے مطابق ٹام نے تھوڑا بہت پڑھ لکھ لیا تھا اور جب سے اس نے زندگی کی سنجیدہ اور باعزت راہیں اختیار کی تھیں، اخباروں اور کتابوں کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ آج کل سیاست اس کا دلچسپ موضوع تھا اور وہ سیاست پر گھنٹوں بحث کرتے نہیں تھکتا تھا۔ ٹام کا خیال تھا کہ کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بحث معلومات کے سمندر کی طرف ایک قریبی راستے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ملنے والوں میں جو بھی کسی قدر پڑھا لکھا تھا مگر جو کے خیالات ٹام کے خیالات کی ضد تھے لہٰذا وہ دونوں خوب بحث کرتے تھے۔

ٹام اپنا دل پسند نظام باقاعدہ تو کیا پڑھتا اور سمجھتا لیکن وہ اس نظام کی تعلیمات کے متعلق اپنے ذہن میں ایک خاص مفہوم ضرور رکھتا تھا۔ ٹام اپنا مذہب انسانیت بتاتا تھا اور اگر کوئی وضاحت چاہتا تو کہتا: "برادرم! میرے مذہب کی وضاحت بڑی بدنام ہے تم سن کر لو کھلا جاؤ گے۔"

تین برس قبل کان کے مالکوں نے ٹام کے خیالات کی بنا پر اسے ملازمت سے برطرف کر دیا تھا لیکن کچھ عرصے بعد جب کان کے مزدوروں نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے ہڑتال کی تھی تو ٹام نے مزدوروں اور مالکوں کے درمیان صلح کرا کے ہڑتال ختم کرا دی تھی۔ ٹام کو دوبارہ کان میں ملازمت مل گئی تھی اور اسے سردار (ہیڈ مین) بنا دیا گیا تھا۔ وہ ایک عمدہ کان کن تھا مگر بارہ آدمیوں کی سرداری اسے اس کی فنی قابلیت کی بنا پر نہیں ملی تھی۔ ٹام کے دوست اکثر مذاق کے طور پر کہا کرتے تھے کہ ٹام نے ملازمت حاصل کرنے کے لیے مالکوں کے ساتھ مل کر ہڑتال ختم کرائی تھی۔ ٹام کو غصہ آجاتا تھا اور وہ اس مذاق پر چیخ چیخ کر ہاتھ ہلا ہلا کر اور حسبِ عادت پُرخلوص گالیاں دے کر اپنی سچائی کا اظہار کرتا تھا۔

جوزفین اور ٹام ایک دوسرے سے بڑی محبت کرتے تھے اور ہفتے میں ایک دفعہ وہ آپس میں ضرور لڑتے تھے۔ ان کے دونوں لے پالک بچے اس ہفتے وار لڑائی کے بعد ان کی صلح کرا دیتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ہفتے وار لڑائی نہیں ہوئی اور ٹام نے بیٹھے بیٹھے جوزفین کو سنانے کے لیے بچوں سے کہا: "بھئی بچو! تمھاری ماں اب بہت اچھی ہو گئی ہے اس نے لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیا ہے" بس یہیں سے جوزفین اور ٹام کی بحث شروع ہو جاتی تھی اور آخر لڑائی ہو کر چند گھنٹوں کے لیے بات چیت بند ہو جاتی تھی۔

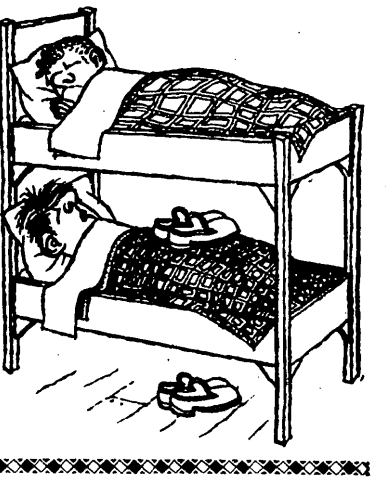

جوزفین ہر اتوار کو پورے اہتمام سے بچوں کو لے کر گرجا جایا کرتی۔ ان کے جانے سے پیشتر ٹام برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز جوزفین کو چھیڑتا رہتا۔ "بھئی جلدی کرو۔ تمھاری مذہبی تجارت کا وقت ہو رہا ہے۔ جوزفین! پادری کے ہیٹ کے پیسے مجھے دے دو۔ میں یہاں پڑا بیئر پیتا رہوں گا اور خدا سے تمھارے گناہ بخشواتا رہوں گا۔"

ٹام اسی قسم کی باتیں کیا کرتا تھا۔ جوزفین اُسے جلی کٹی سنایا کرتی تھی اور ٹام قہقہے لگاتا رہتا تھا۔

ٹام ہم عمر اور بوڑھے لوگوں کے بجائے نوجوانوں کی صحبت میں بیٹھنا پسند کرتا تھا۔ اُن دنوں وہ کان کنوں کی انجمن کا سکریٹری تھا۔ مزدوروں کے حقوق اور جائز مطالبے کان کے مالکوں سے منوا کر ٹام کو دلی خوشی ہوتی۔ ٹام کو مچھلی کے شکار کا شوق تھا اور وہ ہمیشہ مچھلی کا شکار کھیلنے تنہا جاتا تھا۔ ڈوری ڈال کر وہ اخبار پڑھتا رہتا تھا اور بیئر پیتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ پھنسی ہوئی مچھلی نکال کر اس کے حلق سے کانٹا نکالتا اور گھبرائی ہوئی زخمی مچھلی کی طرف غور سے دیکھتے دیکھتے اسے پھر پانی میں چھوڑ دیتا۔ مچھلی ایک لمحے میں نظروں سے اوجھل ہو جاتی مگر ٹام دیر تک پانی کی سطح دیکھتے ہوئے مسکراتا رہتا، سوچتا رہتا۔

جو، ٹام کے عملے میں تھا۔ ٹام کو جب جو اور میری کے تعلقات کا پتہ چلا تو اس نے جو سے کہا: "میرے بیٹے! اگر یہ صحیح ہے تو پھر تم فوراً میری سے شادی کر لو اور اگر تمھاری ماں تمھیں گھر میں نہ گھسنے دے تو بیوی کو لے کر میرے ہاں آ جانا۔ مجھے یقین ہے تم اس بدنصیب بیوہ کو دھوکا نہیں دو گے کیونکہ تم بھیڑ کی طرح معصوم ہو اور میں اسی لیے تمھیں پسند کرتا ہوں۔"

جو نے ہنستے ہوئے کہا: "بوڑھے لڑکے! وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور یہ بوڑھا لڑکا، کام پر جا رہا تھا۔ اس کے منہ میں میلا سا پرانا پائپ تھا۔ وہ کسی کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا، کسی کی مزاج پرسی ہاتھ ہلا کر کر رہا تھا، کسی کو آنکھ مار کر ہلو کہہ رہا تھا۔

ان میں ایک شخص بل بھی تھا۔ دوستوں میں بل مفت خور کہلاتا تھا۔ دبلا پتلا، دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے رخسار، کم گو اور برف قسم کا آدمی۔ لوگ لاکھ مذاق کریں، لاکھ طعنے دیں، بل کے پتلے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حجاب کی جھلک کبھی کبھی اس طرح نظر آ جاتی تھی جیسے چمکتے ہوئے سورج کے سامنے ذرا سی دیر کے لیے بادل کا کوئی ٹکڑا آ جائے۔ بل کی شراب کا خرچ عموماً ٹام ادا کرتا تھا۔ بل اس کے عوض ٹام کو گٹار پر میکسیکو کے لوک گیتوں کی دھنیں سنایا کرتا تھا۔ بل وائلن بھی بجا لیتا تھا اور ٹام کئی بار اس سے کہہ چکا تھا کہ وہ غلطی سے کان کن بن گیا ہے، اس کا تو اپنا آرکسٹرا ہونا چاہیے۔ بل اس قسم کے تعریفی جملے سن کر اکثر ہلکی سی آہ بھرا کرتا اور کہتا۔ "ٹھیک کہتے ہو میرے دوست! کچھ روپے اور جمع ہو جائیں تو میں یہ منحوس اسپرنگ ہل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا۔"

ٹام اس کی ہاں میں ہاں ملاتا مگر جس طرح ٹام کو یہ یقین تھا کہ بل اسپرنگ ہل نہیں چھوڑ سکتا، اسی طرح بل بھی جانتا تھا کہ اس کا یہ خواب کبھی پورا نہ ہوگا۔ بل غیر شادی شدہ تھا اور اس کی عمر پینتیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ لوگ کبھی کبھی اس سلسلے میں بل کو خوب چھیڑتے تھے مگر بل حسب عادت برا نہیں مانتا تھا، مسکراتا رہتا تھا۔ بل اکثر سنجیدگی کے ساتھ ٹام سے شکایت کیا کرتا کہ اس کے ماں باپ بہت فضول خرچ ہیں اور اس کی محنت کی آمدنی بے دریغ اڑا رہے ہیں مگر بل کا بہرا باپ جس سے بات کرنے والوں کو اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر چیخنا پڑتا تھا، ہمیشہ بل کی شکایت کرتا کہ وہ گھر کے اخراجات کے لیے بھی پورے پیسے نہیں دیتا ہے اس لیے اس بڑھاپے میں اسے اور اس کی بیوی کو بڑی تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔ بل کے سامنے ٹام اس کے ماں باپ کو برا بھلا کہتا مگر بل کی عدم موجودگی میں جب وہ اس کے ماں باپ سے اظہارِ ہمدردی کرتا اور بل کی کنجوسی پر اسے گالیاں دیتا تو جوزفین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا اور وہ ٹام پر برسنے لگتی کہ آخر اس نے کیوں اس مفت خور کو پالنا شروع کر دیا ہے۔

انھی میں دُہرے بدن کا، پھولے پھولے گالوں والا ہیری تھا جس نے

اپنے ہونٹوں میں سگار دبا رکھا تھا اور جس کے چہرے سے بشاشت پھوٹ رہی تھی۔ ہیری کا اگر بس چلتا تو وہ اپنی بیوی اور دونوں بچوں کو بھی جوئے کے داؤ پر لگا دیتا۔ ہمیشہ قرض دار رہتا تھا۔ شہر میں اس کی کوئی عزت نہیں تھی۔ اس کی بیوی نے کان والوں کو درخواست دے کر گزشتہ ایک سال سے تنخواہ خود وصول کرنے کا بندوبست کر لیا تھا مگر ہیری اب بھی خوشامد سے یا لڑ جھگڑ کر جوئے کے لیے بیوی سے پیسے لے لیتا تھا۔ اس عادت کے باوجود ہیری کو بیوی اور دونوں بچوں سے دلی محبت تھی۔ جوئے میں پیسے جیت کر پہلے تو وہ جی بھر کر شراب پیتا پھر بازار سے بیوی اور بچوں کے لیے جو چیز اچھی نظر آتی، خریدتا پھر سامان اٹھائے جھومتا جھامتا گھر پہنچتا۔ جس روز ہیری کے گھر میں بچے غیر معمولی شور مچا رہے ہوتے اور باورچی خانے میں اس کی بیوی پھرتی سے کام کر رہی ہوتی، اڑوس پڑوس کے لوگ سمجھ جاتے کہ آج ہیری جوئے میں جیت کر آیا ہے۔ اس روز ہیری کی بیوی بھی میک اپ کرتی اور اپنے بال شیمپو سے دھو کر ربن باندھ لیتی۔ پھر وہ بڑی سمجھ داری سے ہیری کے شرابی لوجی کا جواب دیتے ہوئے اس کی جیبوں کی تلاشی لے لیتی۔ کبھی کبھی اسے مایوسی ہوتی مگر اکثر ہیری کی جیبوں سے کئی دنوں کے گھریلو خرچ کا بندوبست ہو جاتا۔ ہیری کی بیوی ایلن کا خیال تھا کہ ہیری کو جیتے ہوئے پیسوں کا حساب یاد نہیں رہتا لیکن اگر کوئی ہیری سے پوچھتا تو وہ ہنس کر کہتا "میں خود یاد رکھنا نہیں چاہتا۔ جب ایلن کو میری جیبوں کی تلاشی لینے کے بعد مایوسی ہوتی ہے تو اسے پیار کرتے کرتے میں خود افسردہ ہو جاتا ہوں۔"

ہیری کی بیوی ہر اتوار کو اسے زبردستی گرجا لے جاتی۔ ہیری جوئے کے لیے پیسے ملنے کی لالچ میں بادلِ ناخواستہ ساتھ ہو لیتا۔ ٹام اس سے اکثر کہا کرتا "مردود! تم خدا سے جوا کھیلنے گرجا جاتے ہو" اور ہیری اعتراف کر لیتا کہ اس نے اکثر پادری کے ہیٹ میں خیرات ڈالنے کے لیے ایلن سے پیسے لے کر آدھی سے زیادہ خیرات بچالی اور بچائی ہوئی خیرات نے کئی مرتبہ اس کا ہارا ہوا مال اسے واپس دلایا۔ گزشتہ رات بھی ہیری نے جوا جیتا تھا اور اسی لیے صبح وہ سگار پیتے ہوئے بڑا ہشاش بشاش کام پر جا رہا تھا۔

ان میں لارڈ بائرن کا ہیرو ڈان جان بھی تھا۔ ہسپانوی باشندوں کا سا گندمی رنگ اور سیاہ گھنگھریالے بال، مضبوط چوڑی کلائیاں، فراخ سینہ، لمبا قد اور کمر اور پیٹ تو گویا ایک ساتھ ملے ہوئے۔ سیاہ نمایاں ابرو۔ جب اسپرنگ ہل کا یہ ڈان جان جس کا نام رابرٹ تھا، ابرو سکیڑ کر دور سے آتی ہوئی کسی عورت کی طرف دیکھتا تو رابرٹ کو دیکھ کر ہر شخص کو یقین ہو جاتا کہ اس

مشاعرہ

ہو رہا تھا اور ردیف قافیہ تھا "خوگر میں ہوں، دلبر میں ہوں" سامعین میں سے ایک صاحب ایسے بھی تھے جو بار بار "میں ہوں، میں ہوں" کا نعرہ لگا کے شعر کا مزہ کرکرا کر دیتے تھے۔ ایک شاعر ان سے چڑ گیا تھا۔ اس نے اپنا کلام سنانا شروع کیا۔

غم نہ کر تو کہ بڑے رنج کا خوگر میں ہوں

حسبِ عادت سامع غریب نے "میں ہوں" لگا کر داد دینا شروع کر دی۔ سامع کی عادت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاعر نے مصرع پڑھا۔

ناریل ہاتھ لگا جس کے وہ بندر۔۔۔۔۔۔۔

سامع حسبِ عادت زور سے پکارا "میں ہوں" پوری محفل زعفران زار ہو گئی۔

عورتوں سے رابرٹ کے یقیناً تعلقات ہیں اور اگر نہیں ہیں تو ہو جائیں گے۔ رابرٹ کو اپنے خوب رو ہونے کا خود شدید احساس تھا اور چونکہ وہ جاہل تھا اس لیے اپنے اس احساس کا ذکر لوگوں کے سامنے بڑے فخر سے کرتا تھا۔ بدصورت، شریف، بزدل اور دوراندیش لوگ اسے طنزاً ڈان جان کہتے تھے اور رابرٹ کا خیال تھا کہ ڈان جان کوئی اسی جیسا وجیہہ اور خوب صورت انسان ہوگا جو جس عورت کو چاہتا تھا اپنے دامِ محبت میں لے آتا تھا۔ ٹام کا خیال تھا کہ رابرٹ کے ذہن میں ریت بھری ہوئی ہے۔ وہ رابرٹ سے کہا کرتا۔ "وہ تم ریت کے تھیلے پر گھونسے مارنے کی ورزش کرنے کے بجائے اپنے سر پر گھونسے مارا کرو۔"

رابرٹ خود پسند آدمی تھا۔ جس طرح ٹام اپنی محفل کا ہیرو بنا رہتا تھا، اسی طرح رابرٹ کا بھی ایک حلقہ تھا جس کا وہ سرپرست تھا۔ رابرٹ بھی ٹام کی طرح سرپھرا تھا اور اس نے کان کنوں کے سکریٹری کے عہدے کے لیے ٹام کا مقابلہ کیا تھا۔ گو بظاہر وہ ٹام سے ہنس کر ملتا تھا مگر دلی طور پر ٹام سے متنفر تھا۔

رابرٹ کے جنسی رابطوں کے قصے اسپرنگ ہل میں مشہور تھے اور یہ حال تھا کہ جس گھر میں رابرٹ ایک دو مرتبہ آتا جاتا دیکھ لیا جاتا، اس گھر کی کسی بہو بیٹی کے متعلق افواہیں پھیلنے لگتیں۔ رابرٹ کو ان افواہوں پر کبھی غصہ نہیں آیا۔ وہ اپنے متعلق ایسی افواہیں سن کر مسکرایا کرتا تھا۔ رابرٹ نے ایک شادی بھی کی تھی مگر سال بھر بعد اس نے طلاق دے دی تھی۔ کئی دنوں تک لوگوں کو سناتا رہا تھا کہ "مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جیل سے رہا ہوا ہوں۔"

رابرٹ کئی دنوں سے ہیری کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو اکثر رابرٹ کے دانت توڑنے کا کوئی محفوظ اور قانونی طریقہ سوچا کرتا تھا۔ جو نے ٹام کے سامنے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو ٹام ہنستے ہوئے بولا "میرے

دُوراندیش بیٹے ! ابھی اِنتظار کرو۔ ذرا رابرٹ کے دانت کمزور ہو لینے دو۔"
اس پر جو کو غصہ آ گیا تھا اور وہ کئی دنوں تک شام کو ٹام کے ہاں نہیں گیا تھا۔

انھی لوگوں میں بوڑھا پال بھی تھا۔ پال عمر کے لحاظ سے تو ایسا بوڑھا نہیں تھا مگر اس کی مذہبی سنجیدگی اس کی رُوح کے ساتھ ساتھ اس کے جسم پر بھی اثر انداز ہوتی تھی۔ چوالیس برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے ؟ لیکن پال بچپن سے کم کا نظر نہیں آتا تھا۔ پال نے جوانی سے بھی پہلے اپنے لیے زندگی کا اکتا دینے والا سیدھا راستہ منتخب کر لیا تھا اور اکتا دینے والی ثابت قدمی کے ساتھ اسی سیدھے راستے پر گامزن تھا، وہ ہفتے میں صرف اتوار کو ایک انڈا کھاتا اور برانڈی کا ایک جام پیتا۔ ہفتے کی شام وہ ایک سگار سلگا کے اور دوسرا جیب میں ڈال کے ٹام کے ہاں جاتا اور دونوں سگار ختم کر کے واپس لوٹ آتا۔ پال نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کے گھر میں اس کی بڑی بہن رہتی تھی جو بیوہ تھی۔
پال حد درجے کفایت شعار تھا مگر خیرات دیتے وقت ساری کفایت شعاری بھول جاتا تھا۔ وہ بہن کے دونوں بچوں کو کئی برس سے پال رہا تھا۔ بہن کے بڑے لڑکے کو وہ پادری بنانا چاہتا تھا اور اکثر کہتا تھا کہ اگر وہ اسپرنگ ہل میں پیدا نہ ہوا ہوتا تو یقیناً اب تک پادری ہوتا۔ اسے پرانے عہد نامے کے سینکڑوں حصے ازبر تھے۔ وہ ہر رات سونے سے پیشتر مقدس انجیل کی تلاوت کرتا تھا۔ پاپائے روم کے انتقال پر جب تک نیا پاپا منتخب نہیں ہوا، پال کام پر نہیں گیا حالانکہ وہ بیکار بیٹھنا کفر سمجھتا تھا۔ جس وقت ویٹیکن سٹی میں نیا پاپا منتخب ہوا، وہ سڑک پر کھڑا تھا۔ خبر سنتے ہی وہ گھٹنوں کے بل جھک کر دعا مانگنے لگا اور اسپرنگ ہل کے پروٹسٹنٹ مسکرانے لگے۔ پال جس قدر احتیاط سے خرچ کرتا تھا اسی احتیاط کے ساتھ منہ سے بات نکالتا تھا۔ اس کی انتہائی کوشش ہوتی کہ اس کے کسی جملے سے کسی کا دل نہ دُکھے۔ ٹام بھی اس کی موجودگی میں کسی قدر مہذب بننے کی کوشش کرتا اور عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کس کے حق میں اور کس کے خلاف اپنی رائے بیان کر رہا ہے ؟ پال کو بدقماش لوگوں کو راہِ راست پر لانے کا جنون تھا اور اس کوشش میں اکثر اس نے اُن لوگوں کی گالیاں تک برداشت کی تھیں۔ وہ رابرٹ کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور رابرٹ اس کے سائے تک سے گھبراتا تھا۔
پال کی بیوہ بہن بالکل بھائی کے نقشِ قدم پر چل رہی تھی، وہ دن بھر یتیم بچوں کے لیے مفت کپڑے سیا کرتی اور سوئٹر بُنا کرتی۔ پال ٹام کے ہاں نشستوں میں اپنی اس آخری خواہش کا ذکر اکثر کرتا کہ وہ کان میں دب کر مرنے کے بجائے کان کے باہر باقاعدہ طریقے سے دفن ہونے کے لیے آج ہی اسی وقت تیار ہے۔ ٹام سُنا کرتا اور ایک دفعہ تو ساری احتیاط کے باوجود ٹام کی زبان سے نکل گیا۔ "پال ! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ خدا تمھاری اس آخری خواہش کے سوا تمھاری ہر خواہش پوری کرے گا۔"
پال نے حسبِ عادت مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "تم کیسے کہہ سکتے ہو ؟"
ٹام نے جواب دیا "کیونکہ مقدس باپ کو اپنے بندوں کے ساتھ اکثر اس قسم کے مذاق کر کے لطف آتا ہے۔"
پال کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر راکھ دانی میں آدھے سے زیادہ سگار مسل کر بجھا دیا تھا اور زیرِ لب شب بخیر کہہ کر گھر چل دیا تھا۔
دوسرے روز ٹام نے خود پال کے ہاں جا کر اُس سے معافی مانگی تھی۔ پال نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ "ٹام ! میں ناراض نہیں ہوا تھا۔ تمھارے بے باک جملے نے مجھے صرف خوف زدہ کر دیا تھا۔"
ٹام نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ "پال ! بس ہم دونوں میں یہی فرق ہے۔ تم خدا سے ڈرتے ہو اور میں اسے اپنا بے تکلف دوست سمجھتا ہوں۔"
پال نے صلیب کا نشان بنایا تھا مگر اس کے ہونٹوں کی پُرخلوص مسکراہٹ بدستور قائم رہی تھی۔

اسپرنگ ہل کے بازار سُونے اور اُداس تھے۔ گھروں میں بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بچے اسکول گئے ہوئے تھے اور مرد ہزاروں فٹ کی گہرائی میں کوئلہ تراش رہے تھے۔ گھریلو عورتیں معمول کے مطابق خاموشی سے میکانکی انداز میں گھروں کے کاموں میں مصروف تھیں۔ بوڑھے یا تو اخبار پڑھے جا رہے تھے یا دھوپ میں بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔
آٹے کی چکی کی مسلسل بھک بھک اسپرنگ ہل پر مسلط سکوت میں مدغم ہو چکی تھی۔ دُور بچوں کے اسکول سے اُٹھتی ہوئی دعائیہ کورس کی لے بھی اسپرنگ ہل کے سکوت میں گھل مل گئی تھی۔ گھونسلوں میں پرندے چوگ لے کر لوٹ آئے تھے اور بھوکے بچے مسلسل شور مچا رہے تھے مگر پرندوں کا یہ ہم آہنگ مسلسل شور بھی اسپرنگ ہل کے مہیب سکوت کے ایوانوں میں کھو گیا تھا۔ سورج سر پر آ کر گویا ٹھہر گیا تھا اور سورج مکھی جیسے آسمان دیکھتے دیکھتے پتھرا گیا تھا۔ گولر کے درخت کے تنے میں گھستی اور نکلتی ہوئی چیونٹیوں کی قطار ایک ساکت سی جامد لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ ہوا بھی ساکت تھی اور فضا میں چند ابابیل پر پھیلائے معلق سے ہو گئے تھے۔ کوئی آواز نہیں تھی، کوئی شور نہیں تھا، کوئی ہنگامہ نہیں تھا اور اگر کوئی آواز، کوئی شور، کوئی ہنگامہ تھا تو وہ اسپرنگ ہل پر پڑا ہوا سکوت کا بھاری پردہ چیر کر احساس کی سطح چھونے سے قاصر تھا۔
دفعتہً اسپرنگ ہل کا اداس سکوت درہم برہم ہو گیا۔ کان میں حادثے

سب تہنگ

کے سائرن چیخ رہے تھے۔ دکان دار جلدی جلدی دکانیں بڑھا رہے تھے، بچے کتابیں سنبھالے اپنے گھروں کی طرف بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ بوڑھے صلیبوں کے نشان بناتے ہوئے کان کی طرف تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے۔ عورتیں پریشانی کے عالم میں چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو آوازیں دیتی ہوئی کان کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ سائرن گونج رہے تھے۔ مائیں آجڑ رہی تھیں، لاڈلے یتیم ہو رہے تھے۔ کان کی لفٹیں مزدور باہر نکال رہی تھیں۔ جب کوئی لفٹ اوپر آتی، ہجوم دم بخود ہو جاتا۔ پھر چند چہرے کھل جاتے اور باقی مرجھا جاتے۔ ایمبولنس گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی کان کے منہ پر آ گئی تھیں۔ کان کے افسروں اور مالکوں کی کاریں بھی آنی شروع ہو گئی تھیں اور ہزاروں فٹ کی گہرائی میں کوئلے کے ستون گر رہے تھے، چٹانیں گر رہی تھیں، راہیں مسدود ہو رہی تھیں، راہی دب رہے تھے، پس رہے تھے، اسیر ہو رہے تھے۔ ایک اور المیہ تباہ ہو رہا تھا۔

*

"میرے معبود! کیا ہم یہاں سے کبھی نہیں نکل سکیں گے؟" ہیری مایوس نظروں سے تاریکی میں اپنے ساتھیوں کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کبھی نہیں، کبھی نہیں۔" بل اپنے یقین کی آگ میں جل رہا تھا۔

"ایسا نہ کہو، خدا کے لیے ایسا نہ کہو۔" میری رو رہی تھی۔

"بل نے ٹھیک کہا ہے میری! ہم سب کوشش کر چکے ہیں، اب تو یہاں موت کو آنے کے لیے بھی بڑی تگ و دو کرنی ہو گی۔" جو نے بے بسی کے عالم میں اپنا سر دیوار سے لگا دیا اور مکمل تاریکی میں تاریک تر کوئلے کی دیوار گھورنے لگا۔

"ہمیں خدا پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ وہ اس ہزاروں فٹ گہرے تاریک کنویں سے بھی ہمیں نکال سکتا ہے۔" پال نے صلیب کا نشان بنایا تھا اور تاریکی کے بے چین کر دینے والے احساس سے نجات حاصل کرنے کے لیے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"پال ٹھیک کہتا ہے۔ خدا اگر ہمیں نہیں تو ہماری روحیں یقیناً اس قید سے رہا کر سکتا ہے۔" رابرٹ یہ کہہ کر اپنے گھنگریالے بال انگلیوں میں الجھانے لگا تھا۔ تقریباً گھنٹے بھر تک سب خاموش بیٹھے رہے۔ ان عرصے میں ہر شخص کے دماغ پر یہی خیال چھا چکا تھا کہ شاید ایک دن یا دو دن یا زیادہ سے زیادہ تیسرے دن.....

ٹام سوچ رہا تھا: "ہمیں بچانے والے کم از کم تین دن سے پہلے یہاں کیا پہنچیں گے؟ پھر بھی ہمیں انتظار کرنا چاہیے اور انتظار کرنے کے لیے زندہ رہنا چاہیے۔ یہاں ایک عورت اور چھ آدمی ہیں۔ نہ جانے ہمارے جیسے اور کتنے محبوس ہوں گے؟ بہرحال ہمیں زندگی زیادہ عرصے تک گھسیٹنی ہو گی اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہمیں سب لوگوں کا کھانا اکٹھا کر کے چار پانچ دنوں پر

تقسیم کر دینا چاہیے، یہی ایک صورت ہے ورنہ ہم اپنا اپنا کھانا ختم کر کے باری باری مرنے لگیں گے لیکن ....." ٹام کو اچانک خیال آیا، اگر میں نے ان لوگوں کو زندگی کی امید پر زندہ رکھنے کی کوشش کی تو شاید یہ انتظار نہ کر سکیں۔ انسان کے لیے سب سے کڑی ذہنی سزا انتظار ہوتی ہے، یہ لوگ تو سوچتے سوچتے پاگل ہو جائیں گے، یہ انتظار کی شدت سے تڑپنے لگیں گے، رونے لگیں گے۔" ٹام کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے ٹارچ جلائی اور کہا: "دوستو! کہاں ہو؟"

"یہیں۔ اور کہاں جا سکتے ہیں ہم؟" جو کے لہجے میں ملال کی جھنجلاہٹ تھی۔

"ساتھیو! میں پھر کہتا ہوں کہ ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے اور خدا پر بھروسا....."

ٹام نے پال کو ٹوک دیا: "میرے جہاں دیدہ پال! خدا کے لیے تم اس زیرِ زمین قید خانے میں گر جا کے خدا کی رٹ نہ لگاؤ۔"

میری کو ٹام کے الفاظ پر ہنسی آ گئی۔ ٹام خود بھی ہنسنے لگا مگر جب پال بھی ان دونوں کی ہنسی میں شریک ہو گیا تو ہیری، بل اور رابرٹ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی اور اس طرح اس پرہول تاریک ماحول میں فانی انسانوں کی لافانی عظمت کے چراغ کی کانپتی ہوئی لو کو قرار آیا۔ ٹام نے کہا: "ساتھیو! آؤ ہم سنجیدگی سے سوچیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم ہمت کر کے یہاں سے کس طرح نکل سکتے ہیں؟" رابرٹ نے یہ بات کہہ کر گویا اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کی۔

"کیا خوب بات کہی ہے ہمارے ڈان جان نے" جو کو رابرٹ کی بے حسی پر غصہ آ رہا تھا۔

ٹام بولا "ہمیں سب سے پہلے اپنا ایک لیڈر منتخب کر لینا چاہیے۔ اس لیڈر کے احکام قطعی ہوں گے اور ہمیں ان پر ایمان داری سے عمل کرنا ہوگا۔ اس طرح ہم ایک منظم جماعت بن کر اس قید میں زندگی بہتر طریقے سے بسر کر سکتے ہیں۔"

"ٹام نے ٹھیک کہا ہے" ہیری بولا۔

"میں ٹام ہی کا نام پیش کرتا ہوں" پال نے کہا۔

"ہم تائید کرتے ہیں" بل اور ہیری نے ایک ساتھ کہا۔

"پال! اگر تم پہلے نہ بولے ہوتے تو میں تمھارا نام پیش کرتا" جو بولا۔

"شکریہ لیکن اب بہتر ہے تم میرا انتخاب تسلیم کر لو۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" جو نے جواب دیا۔

رابرٹ ہنستے ہوئے بولا "زندگی کو یہ دن بھی دکھانا تھا کہ..."

ٹام نے جلدی سے کہا "میرے نالائق بیٹے! مجھے تمھاری مجبوری کا احساس ہے۔" رابرٹ نے قہقہہ لگایا۔ ٹام نے کہا "دوستو! اس اعزاز کا شکریہ لیکن اگر آپ یہ عزت مجھے نہ بھی دیتے تو میں اسے زبردستی حاصل کر لیتا کیونکہ اس عہدے کے لیے میں اپنے آپ کو آپ سب سے بہتر سمجھتا ہوں۔"

"تمھاری خوش فہمی کا جواب نہیں ہے،" جو نے کہا۔

ٹام بولا "میں اپنی اسی خوش فہمی کے سہارے زندہ ہوں" اور پھر وہ قدرے توقف کے بعد کہنے لگا "دوستو! اب میں آپ لوگوں کے سامنے اس دنیا کی چند سوزہ زندگی کا پروگرام پیش کرتا ہوں جس پر عمل کرنا آپ سب لوگوں کا فرض ہے۔ سب سے پہلے تو میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں یہاں میرے پسندیدہ نظام کے اصولوں پر چلنا ہوگا۔ آپ سب میں سے جو کو خاص طور پر اعتراض ہوگا لیکن جو کو آگے چل کر احساس ہو جائے گا کہ یہاں اس نظامِ حیات کے سوا اور کوئی نظام قابلِ عمل نہیں ہے۔ یہاں ہمارے زندہ رہنے کے ذرائع محدود ہیں اور محدود ذرائع میں شخصی آزادی کے لبادے میں چھپی ہوئی خود غرضی تباہ کن ثابت ہوگی جو پورے معاشرے کے لیے ایک وبا کی حیثیت رکھتی ہے، بہرحال یہ تو سیاسی یا نیم سیاسی باتیں ہیں اور آپ سب جانتے ہیں کہ مجھے سیاست کا جنون ہے، ہاں تو آپ لوگ اپنے اپنے ناشتے دان، تمباکو کی ڈبیاں، پانی اور شراب وغیرہ میرے پاس جمع کرا دیں۔"

سب نے اپنا اپنا سرمایہ حیات ٹام کے سامنے رکھ دیا۔ سات ناشتے دان تھے، پانی کی پانچ چھاگلیں تھیں، چبانے والے تمباکو کی چار ڈبیاں تھیں اور شراب کے دو اَدھے تھے۔ ٹام دیر تک ٹارچ کی روشنی میں کھانا گنتا رہا اور حساب لگاتا رہا پھر اس نے سارا سامان اپنے دائیں طرف کوٹھے کی دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیا اور کوٹھے کے اس دو ستونوں والے کمرے میں ٹارچ کی روشنی پھرا کر معائنہ کرتا رہا۔ وہ اس پندرہ فٹ لمبے اور بارہ تیرہ فٹ چوڑے کمرے میں چھ مردوں اور ایک عورت کے سونے بیٹھنے کی جگہ کا حساب لگا رہا تھا۔ حساب لگانے کے بعد ٹام نے باری باری سب کو اپنی اپنی جگہ منتقل کر دیا۔ ایک کونے میں میری، اس کے چند فٹ کے فاصلے پر جو اس کے برابر بل پھر رابرٹ اور پال کمرے کی چوتھی دیوار کے ساتھ ٹام خود تھا۔ اس انتظام کے بعد ٹام نے کہا "ساتھیو! میرے پاس صرف دو ٹارچیں ہیں اور ہمیں ہر بارہ گھنٹے بعد دو گھنٹے کے لیے ٹارچ روشن کیا کریں گے۔ آپ ٹارچ کی روشنی کو اس دنیا کے سورج کی روشنی تصور کر سکتے ہیں۔ آپ لوگوں کو ہر بارہ گھنٹے بعد کھانا ملے گا اور میری آپ لوگوں کو کھانا پیش کرے گی۔"

"میری تو جو کو سب سے زیادہ کھانا دے گی،" رابرٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔

مگر ٹام سنجیدگی کے ساتھ بولا "میں نے کھانا کھلانے کا کام میری کے سپرد اس لیے کیا ہے کہ عورت کے مہربان اور پُرخلوص ہاتھ سے اگر مرد کو مری ہوئی مکھی بھی ملے تو اس کا پیٹ بھر سکتا ہے۔"

جو کے سوا سب ہنسنے لگے۔ جو لیٹا ہوا ٹارچ کی مدھم روشنی میں چمکتے ہوئے سیاہ کوٹھے کی چھت گھور رہا تھا شاید وہ سوچ رہا تھا کہ جب اتنی چھتیں گری ہیں تو پھر یہ چھت کیوں ہمیں تڑپا رہی ہے؟

ٹام کہہ رہا تھا "دوسری اہم بات یہ ہے کہ آپ لوگ جس طرح جسمانی طور پر بیرونی دنیا سے منقطع ہو چکے ہیں اسی طرح آپ سب کو بیرونی دنیا سے ذہنی تعلق بھی ختم کر لینا چاہیے، آپ اس دنیا کے متعلق جس قدر سوچیں گے، اسی قدر شدت سے بھوک، افسردگی، بے چارگی اور بدبختی کا احساس آپ کو ستائے گا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ سب اپنے آپ کو ایک عارضی منزل پر تصور کریں یہاں آپ ایک دنیا سے ہجرت کر کے دوسری دنیا میں جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر گئے ہیں۔ جہاں سے آپ ہجرت کر کے آئے ہیں وہاں آپ کا لوٹنا ناممکن ہے، اس منزل پر بھی آپ کا قیام عارضی ہے اور آپ کو بہرحال آگے جانا ہے، یہ کام آپ کو بظاہر بڑا مشکل نظر آئے گا لیکن اگر سنجیدگی کے ساتھ اس طرح سوچنے کی کوشش کریں تو آپ کے دلوں کا بوجھ فوراً کم ہونے لگے گا اور جب آپ اپنے احساسات اس سانچے میں ڈھال لیں گے کہ اب آپ کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے اور جس طرح ہر ذی روح کو ایک نہ ایک دن مرنا ہوتا ہے اسی طرح آپ بھی اس دنیا والوں کے لیے مر چکے ہیں تو

یہی تاریک زنداں آپ لوگوں کے لیے جنت بن جائے گا۔ ہم میں سے کوئی بھی مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہمیں یہاں سے نکالا جاسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہماری لاشیں بھی یہاں سے نہ نکالی جاسکیں بلکہ میں تو کہوں گا کہ ہماری لاشیں بھی یہاں سے نہ نکالی جائیں تو اچھا ہے کیونکہ جب تک ہماری لاشیں یہاں سے نکالی جائیں گی ہمارے لیے رونے والوں کے زخم بھرنے شروع ہوجائیں گے ہماری سڑی ہوئی لاشیں نمودار ہوکر ان کے بھرتے ہوئے زخم چھیل کر رکھ دیں گی۔ میرا خیال ہے امید وبیم کی حالت سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی سزا نہیں ہوسکتی اور میں آپ کو اس کیفیت سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس دلدل سے نکل آئیں۔ میں نے مصر کے ایک فرعون کے متعلق ایک فلم دیکھی تھی۔ اس فلم میں فرعون کو اہرام میں دفن کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق فرعون کی لاش کے ساتھ کئی عقیدت مند بھی اہرام میں زندہ دفن ہوگئے تھے۔ اس فلم کا یہ منظر دیکھتے ہوئے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے جب اہرام کے پتھر ایک دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مل رہے تھے تو اندر فرعون کی لاش کے قریب اس کے ساتھ زندہ دفن ہونے والے عقیدت مند بڑے اطمینان سے مذہبی دعا مانگ رہے تھے اور انھوں نے شمعیں روشن کر رکھی تھیں۔ یہ زندہ دفن ہونے والے لوگ ایک خاص پروگرام کے مطابق اپنی خوشی سے دفن ہوا کرتے تھے اور لوگ ان کی طرف رحم کے بجائے رشک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ آج میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ بھی کسی فرعون کے ساتھ زندہ دفن ہونے والے عقیدت مند بن جائیں اور اپنی تسلی کے لیے مجھے مُردہ فرعون تصور کرلیں۔"

سب غور سے ٹام کی باتیں سن رہے تھے لیکن جب ٹام نے اپنے آپ کو مُردہ فرعون کہا تو بِل اور ہیری کو ہنسی آگئی۔ ٹام نے کہا: "آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ لوگوں کو اب سے بارہ گھنٹے بعد اس دُنیا کا پہلا کھانا ملے گا۔ ہر کھانے سے پہلے آپ لوگ پال کے ساتھ مل کے دعا مانگیں گے مگر میں دُعا میں شریک نہیں ہوں گا۔"

"کیوں ؟" پال نے پوچھا۔

"کیونکہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔" ٹام نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

"یہ کیوں ؟" میری اور بِل اور ہیری نے ایک ساتھ پوچھا۔

"بس یہ میرا فیصلہ ہے۔"

"یہ نہیں ہوسکتا۔" ہیری نے تیزی سے کہا۔

"ابھی سے آپ لوگوں کا یہ عالم ہے کہ میری بات ماننے سے انکار کررہے ہیں تو آگے چل کر پتہ نہیں کیا ہوگا ؟" ٹام نے ذرا غصّے سے کہا۔

رابرٹ نے ٹام کو سمجھانے کی کوشش کی "مگر ٹام آخر اس فضول قربانی کی کیا ضرورت ہے ؟"

"میرے دوست! ہمارے نظام میں قائد یا سربراہ کو اپنی بہت سی خواہشات کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ بالکل ویسی ہی قربانی جس کی بیکار توقع ہماری جمہوریت میں عوام چھ سات سو ابن الوقتوں کو ووٹ دے کر ان سے رکھتے ہیں۔ اس اندھیری دُنیا میں تمھارے قائد کی حیثیت سے میں یہی قربانی دے سکتا ہوں۔"

"کسی نے کہا ہے کہ مکمل جاہل سے آدھا جاہل زیادہ خطرناک ہوتا ہے" جو نے آخر جل کر کہہ دیا۔ وہ دیر سے ٹام کی باتوں پر پیچ وتاب کھا رہا تھا۔

ٹام، جو کے طنز کا جواب دینا چاہتا تھا کہ بِل کہنے لگا: "لیکن اس طرح تو تم ہم سب سے پہلے چل بسو گے اور تمھاری یہ قربانی....."

ٹام نے ہنستے ہوئے کہا: "آپ اطمینان رکھیے! میں آپ سب کے ساتھ ہی مروں گا۔"

"یہی خود اعتمادی تمھارا دہریہ پن ہے۔" پال نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم نے غلط کہا پال" "یہی خود اعتمادی میرا مذہب ہے۔"

"خدا تمھارے حال پر رحم کرے۔" پال نے صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔

ٹام ہنستے ہوئے بولا: "پال براہِ کرم یوں کہو کہ میرا خدا میرے حال پر رحم کرے۔ میں تمھارے خدا کا رحم نہیں چاہتا جو گرجا گھر کی قربان گاہ پر بیٹھے ہوئے خوب صورت منقش پردوں میں چھپا ہوا ہے۔"

پال کو غصّہ آگیا اور اس کے جسم میں خنک رو دوڑ گئی۔ اس نے جلدی سے صلیب کا نشان بنایا اور زیرِ لب مقدس انجیل کی کوئی آیت پڑھنے لگا۔

★

ٹام نے ٹارچ روشن کرکے زمین پر رکھی اور کہا: "ساتھیو! تمھاری اس دُنیا کا دوسرا سورج طلوع ہوگیا ہے اور اب تم اس دُنیا کا پہلا کھانا کھاؤ گے۔"

تھوڑی دیر میں جو کے سوا سب ایک قطار میں بیٹھ گئے اور میری نے سب کے سامنے ایک ایک سلائس، ذرا ذرا سا پنیر، انڈے کا چوتھا حصّہ اور اُبلے ہوئے گوشت کا تقریباً دو مربع انچ چوڑا ٹکڑا رکھ دیا۔ ٹام نے ایک بار پھر جو کو کھانے کے لیے کہا۔ جو چیخ کر بولا: "ٹام! آخر تم مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے ؟" جو نے لیٹ کر دیوار کی طرف منہ موڑ لیا۔

ٹام نے آہستہ سے کہا: "جو! تم اس طرح ہم سب سے پہلے مر جاؤ گے اور تمھاری لاش کی بُو ہمارے لیے ایک مصیبت بن جائے گی۔ آؤ، اٹھو اور اپنے حصّے کا کھانا کھالو۔"

مگر جو نے ٹام کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، اسی طرح دیوار کی

طرف منہ کیے خاموشی سے پڑا رہا۔ چند منٹ تک سب خاموشی سے بیٹھے رہے اور ٹام سر جھکائے سوچتا رہا۔ آخر اس نے پال سے دعا کے لیے کہا۔ پال کھنکھار کر دعا مانگنے لگا:۔

"خداوند! ہمارے لب جب بھی وا ہوں، تیری ہی
ثنا کریں۔ تو ہی ہمارا معاون و مددگار ہے۔"

ٹام اور جو کے سوا سب نے پُرخلوص دھیمی آواز میں ایک ساتھ آمین کہا۔ پال نے قدرے تیزی کے ساتھ نثر کے لہجے میں کہنا شروع کیا:۔

"مقدس روح! تو ہی رحمتوں کا منبع ہے۔ اپنی
امان کا دریچہ کھول دے۔
اے یسوع! ان ظلمتوں میں روشنی کی کرن دکھا، کہ
تو ہی سب سے اعلا روشنی ہے۔"

دعا ختم ہونے پر جو کے سوا سب نے آمین کہا۔ ہیری نے حیرت سے ٹام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ٹام! آج تو تم نے بھی آمین کہہ دیا؟"
"حد ہو گئی تم لوگ تو میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو۔ آخر میں بھی انسان ہوں اور انسان سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔" سب ہنس دیے اور دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹا ہوا جو بھی مسکرانے لگا۔ ٹام نے کہا "اچھا اب آپ لوگ میری ہدایت کے مطابق کھانا شروع کیجیے آپ ہر روز اسی طرح کھانا کھائیں گے۔ آپ اپنے اپنے کھانے کے آٹھویں حصے کا ایک لقمہ لے کر منہ میں رکھ لیں اور پھر اسے آہستہ آہستہ چباتے ہوئے نگلیں۔ آپ لوگوں کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ لقمہ چبانے اور نگلنے میں زیادہ وقت خرچ ہو اور آپ کے جبڑے زیادہ سے زیادہ حرکت کریں۔"
یہ کہہ کر ٹام سب کو اپنی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ نوالہ نگلنے کے بعد سب بے صبری سے ٹام کی طرف اس کے دوسرے حکم کے انتظار میں دیکھنے لگے۔ دو منٹ کے وقفے کے بعد ٹام نے سب کو دوسرا نوالہ لینے کا حکم دیا اور اس طرح تقریباً پندرہ منٹ میں سب نے اپنا اپنا کھانا ختم کر لیا۔ ٹام نے ہیری سے سب کو دو دو گھونٹ پانی دینے کے لیے کہا۔ پانی کے بعد ٹام نے شراب کے ادھے میں سب کو ایک ایک گھونٹ شراب کا دیا اور آخر میں اس نے شراب کے دو گھونٹ اپنے حلق میں انڈیل لیے۔ شراب کے دو گھونٹ

پینے کے بعد ٹام بولا "ساتھیو! آپ کو میری اس حرکت پر شاید تعجب ہو رہا ہو مگر آپ کو یاد ہو گا میں نے کھانا نہ کھانے کا وعدہ ضرور کیا تھا لیکن میں نے شراب کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ شراب میری بیوی ہر روز صبح میری جیکٹ میں رکھ دیتی تھی۔ خدا مغفرت کرے اچھی عورت تھی۔" ہیری، بل اور رابرٹ ہنسنے لگے۔ ٹام نے چبانے والے تمباکو کی ایک ایک چٹکی سب کو بانٹتے ہوئے پوچھا "کیا آپ لوگوں کو اپنا اپنا پیٹ بھرا ہوا نہیں محسوس ہوتا؟"
"اگر تم حکم دو تو ہم محسوس کر سکتے ہیں" رابرٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔
ہیری نے کہا "اگر یہاں تاش ہوتے تو میں ---- اپنا حصہ کھانے کے بجائے اس پر کسی کے ساتھ جوا کھیلتا۔"
"کم بخت میں تمھیں اس کی کبھی اجازت نہ دیتا تم ہار کر بھوکے مر جاتے اور تمھارا خدا میرا گریبان پکڑ لیتا" ٹام نے ہنستے ہوئے کہا۔
ہیری بولا "نہیں ٹام! یہ بات نہیں ہے جس طرح تم آج اپنے خیالات کو عملی شکل دے کر خوشی سے بھوکے رہ رہے ہو، اسی طرح میں بھی اپنا شوق پورا کر کے زندہ رہتا۔"
"وہ کیسے" بل نے پوچھا۔
"ہارنے کی صورت میں اگلے روز کا کھانا حاصل کر کے پھر جوا کھیلنے کی آرزو مجھے زندہ رکھتی۔"
ایک مخلوط قہقہہ اس تاریک دنیا میں گونج گیا۔ ٹام کو ایک بار پھر جو کا خیال آیا۔ اس نے محبت آمیز لہجے میں کہا "جو! میرے بچے۔ اٹھو تم بھی کھانا کھا لو۔"
"نہیں، نہیں" جو نے تلخی کے ساتھ جواب دیا۔
"آخر کیوں؟" پال نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔
"پال! میں اس منحوس ٹام کی مجنونانہ باتوں پر زندہ رہنا نہیں چاہتا، فوراً مر جانا چاہتا ہوں اور یہ ٹام چاہتا ہے کہ ہم سسک سسک کر مریں۔"
ٹام کو غصہ آ گیا۔ وہ گرجا "تو پھر اٹھو اور ان سیاہ دیواروں سے سر پھوڑ کر مر جاؤ۔"
چند لمحوں کے لیے موت کی سی خاموشی چھائی رہی۔ پھر ٹام پُراعتماد لہجے میں کہنے لگا "مگر تم کیا اٹھو گے، تم بزدل ہو۔ خودکشی بھی نہیں کر سکتے بدقسمت آدمی! اگر تمھیں میری باتیں بری لگتی ہیں، اگر تمھیں میرے خیالات ناپسند ہیں تو چلو، تم یہ تصور کر لو کہ ... ہائیڈروجن بموں کی جنگ میں ساری دنیا ختم ہو گئی ہے اور بدقسمتی سے ہم سات انسان ابھی زندہ ہیں مگر زہریلے بموں کا اثر ہمارے جسموں پر بھی ہو چکا ہے اور آخر ہم بھی مر جائیں گے، شاید اسی طرح موت کا خوف تمھارے ذہن سے دور ہو جائے اور تم رونے اور سسکنے کے بجائے اطمینان اور سکون سے زندگی کے آخری لمحات گزار سکو۔"

جو واقعی رونے لگا اور گھبرا کر بار بار اپنا سر دیواروں سے ٹکرانے لگا۔ ہیری نے آگے بڑھ کر اس کا سر تھام لیا مگر اس وقت ہیری کے دل میں جو کے لیے محبت اور ہمدردی کے ساتھ ساتھ نفرت کا جذبہ بھی پیدا ہو چکا تھا۔ اسے جو کی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا۔

ٹام کو جو پر ترس آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ آخر یہ ماں کے لاڈلے کس لیے ہیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟ کوئی کیا کر سکتا ہے؟ پھر ٹام نے ٹارچ بجھا دی۔ ہیری جو کو چھوڑ کر اپنی جگہ واپس آ کر لیٹ گئی۔ ٹام سوچتے سوچتے جوزفین کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ دیر تک جوزفین کے ساتھ اپنی لڑائیاں یاد کرتے ہوئے مسکراتا رہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ آج کل جوزفین کس قدر غمگین ہوگی۔ پھر اسے اپنے لے پالک بچے یاد آ گئے۔ ٹام کی داڑھی پر دو گرم گرم آنسو ڈھلک آئے۔ اس کے ذہن میں خیال آیا یہ مُردے بھی میری طرح بے بسی کے عالم میں چت لیٹے اپنے پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں سوچا کرتے ہوں گے۔“

پھر اس نے سوچا ڈیر یہ میں کیا حرکت کر رہا ہوں؟ جس بات سے دوسروں کو منع کرتا ہوں وہی خود کر رہا ہوں۔ یہ سب بھی میری طرح اپنے لوگوں کو یاد کرتے ہوں گے۔ بھلا میں کسی کا ذہن اپنا غلام بنا سکتا ہوں؟ بھلا میرے کہنے پر کوئی سوچنا چھوڑ سکتا ہے؟ کیسی غیر فطری بات کہی ہے میں نے لیکن میرے اس غیر فطری حکم کا اتنا اثر تو ہوا کہ سب چپ ہیں اور ایک دوسرے کے سامنے آہ و بکا نہیں کر رہے ہیں ورنہ مصیبت آ جاتی۔ پھر ٹام سوچنے لگا۔ ابھی تو لوگ مایوس نہیں ہوئے ہوں گے۔ ابھی تو ہماری تلاش جاری ہوگی۔ ابھی تو ہماری تلاش میں کھدائی کا کام تیزی سے ہو رہا ہوگا؟ ٹام دیر تک اسی قسم کی باتیں سوچتا رہا۔

اچانک ہیری کی چیخ گونج گئی۔ ٹام نے فوراً ٹارچ جلائی۔ ہیری نے پوری قوت سے رابرٹ کو پرے دھکیل دیا۔ ہیری کی نیلی جیکٹ کے بٹن ٹوٹ چکے تھے اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ ٹام ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے؟ جو زخمی شیر کی طرح رابرٹ پر اچھلا اور ذرا سی دیر میں دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ ہیری اور بل نے آگے بڑھ کر چھڑانا چاہا مگر ٹام نے گہری سنجیدگی سے یہ کہہ کر انھیں روک دیا۔ ”رہنے دو۔ اگر جو اس بدقسمت شیطان کو مار سکتا ہے تو مار ڈالے۔“

ٹام کے ان الفاظ نے رابرٹ کو بدحواس کر دیا اور اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ جو دیر تک رابرٹ کا سر بالوں سے پکڑ کر فرش پر مارتا رہا۔ آخر رابرٹ بے ہوش ہو گیا۔ ٹام نے اٹھ کر جو کو الگ کیا اور رابرٹ کو کھینچ کر پال کے پہلو میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”پال اس کے لیے دعائے مغفرت کرو۔“ ٹام ٹارچ بجھا کر اپنی جگہ لیٹ گیا۔ وہ دیر تک رابرٹ اور جو کے متعلق سوچتا رہا۔ اسے دونوں اچھے لگ رہے تھے۔ اسے دونوں پر پیار آ رہا تھا۔ اسے اس حادثے پر بچوں کی سی مسرت ہو رہی تھی۔ وہ لیٹا ہوا مسکرائے جا رہا تھا۔ اس کے کانوں میں جو کی آواز آئی: ”ہیری! میں اب تمھاری خاطر اس وقت تک زندہ رہوں گا جب تک یہ ذلیل مر نہیں جاتا۔“

ٹام نے کہا: ”ہیری! اپنے ہیرو کو کھانا کھلاؤ اور اسے شراب کے ایک گھونٹ کے بجائے دو گھونٹ پلا سکتی ہو اور ہاں۔ دو گھونٹ شراب پال کو دو تاکہ اس شریر کو بھی پلا سکے۔“

جو نے پہلی مرتبہ ہنستے ہوئے ٹام کو مخاطب کیا: ”بوڑھے لڑکے! اس رعایت کا شکریہ۔“

آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور ٹام نے ٹارچ روشن کی۔ اس نے قائد کی حیثیت سے باری باری رسمی طور پر سب کا حال پوچھا اور سب نے رسمی طور پر ”فائن، فائن“ کہا۔ پھر ٹام رابرٹ کے پاس گیا اور ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈال کر مسکراتا رہا۔ روشنی کی چمک پر رابرٹ نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اس کے چہرے پر ندامت کے آثار نمایاں تھے۔ ٹام نے پیار سے اس کے رخسار پر طمانچہ مار کر کہا: ”میرا نالائق بیٹا!“

ہیری نے کھانا لگا دیا۔ سب قطار میں آ بیٹھے۔ آج ان میں جو بھی تھا۔ ٹام نے ہیری سے کہا کہ وہ اپنے جو اور رابرٹ کے سامنے باقی سب کے مقابلے میں دگنا کھانا رکھے۔ پھر اس نے ہیری سے اپنے لیے بھی ایک حصہ مانگا۔ سب نے حیرت سے ٹام کی طرف دیکھا۔ ہیری نے پوچھا: ”جو اور رابرٹ کو دوہرا حصہ ملنے کی وجہ تو ہو سکتی ہے مگر مجھے کیوں؟“

”ابھی معلوم ہو جائے گا بچیں“ ٹام نے یہ کہہ کر پال سے دعا کے لیے کہا۔

لڑکی کا باپ اپنے ہونے والے داماد کی ذہانت اور حاضر دماغی کا امتحان لے رہا تھا۔ اس نے لڑکے سے بہت سارے سوالات کیے۔ لڑکا ہر سوال کا جواب نہایت تیزی اور حاضر دماغی سے دیتا رہا۔ آخر ہونے والے سسر نے اپنے داماد پر آخری وار کیا، پوچھا: ”اچھا بیٹے! ایک سوال اور!“

لڑکے نے مسکرا کر کہا: ”ارشاد!“

لڑکی کے باپ نے سوال کیا: ”اگر میری بچی نرگس غریب ہوتی تو کیا تم اس صورت میں بھی اس سے شادی کر لیتے؟“

لڑکے نے انکسار سے جواب دیا: ”جی بالکل، بالکل کر لیتا شادی۔“

ہونے والے سسر نے لڑکے کو فیل کر دیا۔ گرج کر کہا: ”افسوس کہ ہمیں ایسے بے وقوف داماد کی ضرورت نہیں ہے۔“

دعا میں آج وہ خود بھی شریک ہوا اور اس نے سب کے ساتھ آمین کہا۔ اب سب بےتابی سے کھانا شروع کرنے کے لیے ٹام کے حکم کے منتظر تھے۔ ٹام نے کہا: "دوستو! آج ہماری دُنیا کا حسین ترین دن ہے۔ آج میری اور جو اور پال کی دیرینہ آرزوئیں پوری ہو رہی ہیں۔ جو اور میری دولہا دلھن بنیں گے اور پال پادری۔"

میری کی مسرت آمیز چیخوں اور سب کی تالیوں اور قہقہوں سے فضا گونج اٹھی۔ جو جس لیٹا تھا اور اس شور میں ٹام کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا: "اوہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" لیکن جب ذرا شور کم ہوا تو ٹام کے حکم پر پال اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میری نے سنجیدگی سے ٹام کو سمجھانا چاہا مگر ٹام رابرٹ سے کہہ رہا تھا: "تم جو کے گواہ ہو۔" رابرٹ نے فوراً کہا: "مجھے بخوشی منظور ہے" اور پھر اس نے آگے بڑھ کر جو کے ساتھ گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

میری کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

ٹام نے بےپروائی سے کہا: "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ خوشی کے آنسو ہیں اور اس وقت بہت ضروری تھے۔" پھر وہ پال سے مخاطب ہوا۔ "جناب پادری صاحب! شادی کی رسم بس مختصر ہی ہو کیونکہ سب کو بھوک لگ رہی ہوگی۔ کہیں تم پادری بن کر لورپی انجیل ہی نہ پڑھ ڈالنا۔"

سب ہنسنے لگے۔ پال نے مسکراتے ہوئے نہایت پُر وقار انداز میں شادی کی رسم شروع کی۔ رسم ختم ہونے پر سب نے تالیاں بجائیں۔ میری اور جو نے ایک دوسرے کا بوسہ لیا اور رابرٹ نے ادب سے جھک کر میری کا ہاتھ چوما۔ اس کے بعد ٹام نے ناشتے دانوں کے خالی ڈبوں میں سب کو شراب کا ایک ایک گھونٹ بانٹا اور سب نے میری اور جو کی مسرتوں کا جام نوش کیا۔ کھانے کے دوران میں ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ ٹام، پال کو چھیڑتا رہا کہ اس نے پادری بنتے ہی شادی کرائی ہے مگر آج اسے افسوس ہو رہا ہوگا کہ وہ اب خود شادی نہیں کر سکتا۔ پھر سب پل کو چھیڑنے لگے اور اس کی کنجوسی اور مفت خوری کے لطیفے ایک دوسرے کو سنا سنا کر ہنستے رہے۔ کھانے کے بعد میری اور پل نے میری سے گانے کے لیے کہا اور پھر سبھی اس فرمائش میں شریک ہو گئے۔ میری انکار کرتی رہی کہ میں بےسُری ہوں لیکن جب ٹام نے کہا کہ اس دُنیا میں وہی ایک عورت ہے اور وہی ملکۂ ترنم ہے تو میری گانے کے لیے تیار ہو گئی اور اس نے سب کو ساتھ دینے کے لیے کہا۔ دیر تک میری اور سب مِل کر گاتے رہے۔ گیت اُداس تھے اور لَے پُر درد تھی۔ ان گیتوں میں طوفانی راتوں کا ذکر تھا۔ برف باری ہو رہی تھی اور ہیولیں کے شوہر اور دوشیزاؤں کے محبوب ابھی تک شکار سے نہیں لوٹے تھے اور آتش دانوں کے انگاروں پر سفید راکھ جمتی جا رہی تھی، ان اداس گیتوں کے

ایک سلسلے کے بعد ٹام نے گھبرا کر مسرت سے لبریز گیتوں کی فرمائش کی اور اب دیہاتوں میں کرسمس کی تفصیلات والے گیت تھے جن میں سانتا کلاز کے تحفوں کا انتظار تھا۔ ان گیتوں میں طلوعِ آفتاب کی منظر کشی تھی۔ ان میں ستارے پلکیں جھپکتے تھے اور چاندنی کی شرابِ رنگین پھولوں کو مدہوش کر دیتی تھی، ان میں سمندر کی لہریں تڑپا دینے والا رقص کرتی تھیں، ان گیتوں میں محبت کرنے والوں کے دہکتے ہوئے انگاروں سے باہمی پیمان تھے اور انتظار کی سلگتی ہوئی طویل راتیں تھیں، ان گیتوں میں فراق کی کسک بھی تھی اور وصال کی لگن بھی، اور آنسوؤں کی جھڑی بھی تھی کہ سب کی آنکھوں میں لگی ہوئی تھی۔

ٹام نے بچی کھچی شراب سب میں برابر تقسیم کر دی۔ پل نے ہنستے ہوئے کہا: "ٹام تم نے عیاشی شروع کر دی ہے۔"

ٹام شراب کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے بولا: "میرے دوست! ہمارے نظام میں انسانی تہواروں اور خوشیوں کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے۔" پھر ٹام نے شراب ختم ہونے کا اعلان کرتے ہوئے کہا: "ساتھیو! شراب ختم ہونے کی خوشی میں یہ خالی ڈبے سیاہ بدبخت دیواروں پر کھینچ کر مارتا ہوں، آپ لوگ ڈبے ٹوٹنے پر جی بھر کر خوش ہوں۔ ان دیواروں کے چوٹ لگے گی اور ہم قہقہے لگائیں گے۔"

ان سب نے شراب کے خالی ڈبے ٹوٹنے پر دیوانہ وار قہقہے لگائے۔ پھر میری فرطِ مسرت سے اٹھ کر والہانہ رقص کرنے لگی اور سب تالیاں بجا بجا کر جھومتے رہے۔ میری کے رقص پر تال دیتے رہے۔ آخر میری تھک کر گر پڑی اور ذرا سی دیر میں سب ایک بار پھر بھیانک خاموشی میں ڈوب گئے۔ ٹام نے دبی دبی پُراسرار ہنسی کے ساتھ ایک بار پھر وہ پُرہول سکوت توڑا۔ اگرچہ ٹام کو اپنے دل پر بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ لیٹ کر خاموشی سے آنسو بہاتا رہے، روتا رہے لیکن وہ بڑی مشکل سے کھوکھلی زندہ دلی کا اظہار کرنے کے بعد بولا: "بھئی اب ہمیں میاں بیوی کے آرام کا بندوبست کرنا چاہیے۔ یہ دونوں ہمیں دل ہی دل میں گالیاں دے رہے ہوں گے۔"

جو اور میری ہنسنے لگے۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ جو اور میری کے لیے جگہ خالی کر دی گئی اور پال اور رابرٹ دوسری طرف آ کر لیٹ گئے۔ ٹام نے ٹارچ بجھا دی اور کہنے لگا: "بھئی آپ لوگ اپنے اپنے کان بند کر کے سو جائیں اور دولہا دُلھن کی سرگوشیاں سُننے کی کوشش نہ کریں۔" یہ کہہ کر ٹام حسبِ عادت ہنسنے لگا۔ پل، میری اور رابرٹ بھی ہنسنے لگے مگر جلد ہی ٹام کا ساتھ چھوڑ گئے۔ ٹام کی تنہا ہنسی کسی دُکھی شخص کی سسکیوں کی طرح آہستہ آہستہ تاریکی میں ڈوب گئی۔

سب رنگ

بھاری اور طویل خاموشی میں میری کی سہمی ہوئی سرگوشی اُبھری
"جو! کبھی تو ختم ہوگی۔"
"ہاں کبھی تو ہوگی۔" جو کے لبوں سے ہلکی سی آہ نکل گئی۔
دفعتہ میری کو خیال آیا۔ "جو فرض کرو، یہاں باہر سے آنے والی ہوا کا پائپ بھی بند ہوجاتا تو پھر کیا ہوتا؟"
"پھر؟"
"ہاں پھر؟"
جو نے آہستہ سے میری کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔ "پھر ہماری تمنائیں گھٹ کے مرجائیں۔"

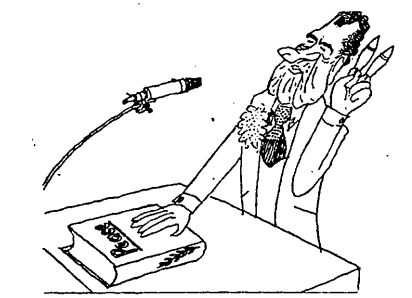

آج کے کھانے میں ایک ایک سلائس کے علاوہ تھوڑا سا گوشت تھا جس میں سے اُٹھتی ہوئی بساند کسی کو محسوس نہیں ہورہی تھی۔ پال کی دُعا کے بعد رابرٹ کے مشورے پر سب نے اپنے اپنے سلائس کا ایک ایک لقمہ توڑ کر میری اور جو کے سامنے رکھ دیا۔ "نئے شادی شدہ جوڑے کو اچھی خوراک ملنی چاہیے۔" رابرٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔
آج سب کو پانی کا صرف ایک ایک گھونٹ ملا۔ ٹام کی نقاہت زیادہ بڑھ چکی تھی۔ جو نے اس کے احتجاج کے باوجود اس کے منہ میں پانی کا ایک گھونٹ ڈال دیا۔ پال نے کہا۔ "ٹام! کیا سوچ رہے ہو؟"
"میں سوچ رہا ہوں کہ آخر تم لوگوں کو کس طرح زیادہ سے زیادہ عرصے تک زندہ رکھا جائے؟"
"آخر اس کی کیا ضرورت ہے؟ شراب ختم ہوچکی ہے کھانا اور پانی بھی ختم ہونے والا ہے۔" ہیری نے کہا۔
"ہیری ٹھیک کہتا ہے۔" رابرٹ چبانے والا تمبا کو منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔
"لیکن میں تم لوگوں کو آنسو بہانے اور ایڑیاں رگڑنے کی اجازت بھی تو نہیں دے سکتا۔" ٹام پشیمانی کے عالم میں بولا۔
"میرے خیال میں اب ہم لوگوں میں ایڑیاں رگڑنے کی طاقت بھی نہیں رہی ہے۔" پال نے کہا۔
"اور چیخنے یا آنسو بہانے کے قابل بھی ہم نہیں رہے ہیں۔" جو بولا۔
"اس کی وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ کل تمھاری شادی ہوئی ہے۔"
ٹام کے اس جملے پر سب ہنسنے لگے۔
میری ہنستے ہنستے بولی۔ "بوڑھے لڑکے تم بہت بے شرم ہو!"
ٹام آہستہ آہستہ ہنستا رہا۔

یوں ہی وقت گزرتا رہا۔ گاہے گاہے وہ آپس میں بچوں کی سی بیکار معصوم باتیں کرتے رہتے۔ کبھی کسی کے جسم کا کوئی حصّہ سُن ہوجاتا تو وہ اسے بار بار ہلانے لگتا۔ کبھی کوئی اُٹھ کر ٹہلنے لگتا اور دو چار مرتبہ کمرے میں چل کر تھک جاتا اور پھر بیٹھ جاتا۔ پھر وہ اونگھنے لگتے، پھر وہ سو جاتے لیکن ذرا سی دیر میں آنکھ کھل جاتی اور وہ کچھ سوچنے لگتے۔ سوچتے سوچتے جب ان کی کنپٹیوں کی نسیں زخمی پرندے کے دل کی طرح پھڑکنے لگتیں اور ان کا دل ڈوبنے لگتا تو وہ گھبرا کر ایک دوسرے کو مخاطب کرکے سیاہ خاموشی کے سینے کی فولادی ڈھال پر وار کرتے اور پھر نڈھال ہوکر رہ جاتے۔ ٹام نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ساتھیو! تمھیں اس دُنیا کا پانچواں دن مبارک ہو۔" اس نے ٹارچ جلادی۔ سب خاموشی سے بیٹھے رہے۔ میری نے کھانا تقسیم کرنے کے لیے اُٹھنا چاہا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی ڈولتی ہوئی کشتی میں کھڑی ہو۔ میری سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ جو نے اُٹھ کر ایک ایک آخری سوکھا ہوا سلائس اور پانی کا ایک ایک گھونٹ سب کو دیا۔
آج سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے، پال نے آہستہ سے دعا ختم کی۔ سب پانی کے اس ایک ایک گھونٹ میں سلائس تر کرکے کھانے لگے۔ پانی کے دو گھونٹ بچ گئے تھے۔ وہ ٹام نے پی لیے پھر اس نے تمباکو کی ایک آخری چٹکی سب کو دے کر اعلان کردیا۔ "دوستو! تمھیں یہ جان کر خوشی ہونی چاہیے کہ آج سے ہم کھانے پینے کی مصیبت سے چھوٹ گئے۔"
"شکر ہے خدا کا۔ اب نجات کی کوئی صورت تو نظر آئی۔" پال نے کہا۔
ٹام کھانستے ہوئے بولا۔ "دوستو! شاید میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہم خودکشی نہیں کریں گے اور مرتے دم تک زندہ رہنے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا اب آپ لوگ پانی کی خالی چھاگلوں میں پیشاب جمع کرتے رہیں۔ آپ لوگوں کو اس وقت پیشاب کے تصور پر کراہت محسوس ہورہی ہوگی لیکن جب آپ کا حلق خشک ہوجائے گا اور مرنے سے پیشتر آپ پانی کی صرف ایک

بوند کے لیے ترس رہے ہوں گے، اُس وقت یہی غلیظ پانی آپ کے لیے بپتسمے کے پانی سے بڑھ کر مقدس ثابت ہوگا۔"

پال نے ٹام کے الفاظ سے ڈر کر صلیب کا نشان بنایا۔ سب خاموش رہے۔ ٹام بھی چپ ہوگیا اور پال سوچنے لگا کہ گزشتہ حادثے میں دو دن تک تو سرگرمی سے تلاش جاری رہی تھی لیکن پھر سب مایوس ہوگئے تھے۔ عورتوں نے کان پر آنا چھوڑ دیا تھا اور کھدائی کرنے والوں کی رفتار بھی بہت سست ہوگئی تھی کیونکہ دفن شدہ لاشیں نکال کر پھر سے دفن ہی تو کرنا تھا۔ اسپرنگ ہل کے گھروں میں بہتے ہوئے آنسو ٹھہر گئے تھے اور صرف چہروں پر تازہ زخموں کی تکلیف کے آثار باقی تھے اور پھر رفتہ رفتہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ یتیم بھی کسی نہ کسی طرح پلتے رہے۔ ادھیڑ اور بوڑھی بیوائیں بھی زندہ رہیں اور جوان بیواؤں کو نئے شوہر بھی ملتے گئے۔ ٹام سوچ رہا تھا جوزفین اب تو روتے روتے بھی تھک چکی ہوگی۔ اور بچے یہ سمجھ کر کہ ان کے باپ تو ہمیشہ ہی کان میں دب کر مرجایا کریں گے، اب پھر کسی قدر اداس اور مغموم اسکول جانے لگے ہوں گے۔ جوزفین نے اب تو میری لاش ملنے پر دفنانے کے لیے تابوت اور قبر کا انتظام شروع کردیا ہوگا۔ کاش اسے میری لاش نہ ملے۔ میری سڑی ہوئی لاش دیکھ کر وہ کس قدر دکھی ہوگی؟ لیکن دوسری طرف جوزفین کی میری لاش دفنانے اور کبھی کبھی پھول لے کر قبر پر آنے کی آرزو بھی تو پوری نہیں ہوگی۔ ہائے اب سیاہ لباس پہن کر گرجا جاتے وقت وہ کس قدر اداس اور دکھی ہوگی؟ اب اسے کون چھیڑے گا؟ کون اس کی عبادت کے پُرخلوص اہتمام کا مذاق اُڑائے گا؟

وہ کس پر بگڑے گی؟ وہ کس سے روٹھے گی؟ اسے کون منائے گا؟

ہیری بھی چھٹی ہوئی دنیا کے تصورات میں ڈوبا ہوا تھا "جان ابھی تک مجھے یاد کرکے روتا ہوگا۔ ریٹا شاید بہل گئی ہو؟ ابھی بچّی ہے نا۔ ایلن کی گزر اوقات کے لیے ابھی تو گھر میں پیسے ہوں گے۔ میں کافی رقم جیت کے گھر لوٹا تھا اور ایلن نے حسبِ عادت میری تلاشی لے لی تھی پھر ایلن کو کمپنی سے بھی روپے مل جائیں گے۔ میں بچوں کے لیے بہت سے کھلونے لے گیا تھا۔ عینا کی نائیلون کی بلّی تھی مگر جان کی بیٹری سے چلنے والی کار کی بیٹری ابھی نہیں ملی تھی۔ ایلن کیا سوچتی ہوگی؟ کیا کرتی ہوگی؟ بس ہر وقت اداس کھوئی کھوئی رہتی ہوگی؟ کوئی تعزیت کرنے آتا ہوگا تو اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑتے ہوں گے۔ ابھی وہ جوان ہے۔ چند دن ہوئے وہ میرے سر کا ایک سفید بال توڑ کر ہنس رہی تھی اور کہہ رہی تھی "میری ڈارلنگ! تم کس قدر تیزی سے بوڑھے ہوتے جارہے ہو۔" اور شاید کچھ عرصے بعد ایلن ایک بار پھر دلھن بن کر گرجا چلی جائے؟ پھر وہ کسی اور ہیری کے سر کا سفید بال توڑ کر ہنسا کرے گی۔

رابرٹ کو بار بار ڈورتھی کا خیال آرہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ عجیب بے پروا قسم کی لڑکی ہے؟ میرے ماضی کا کوئی قصّہ اس سے چھپا ہوا نہیں ہے پھر بھی وہ میرے بالوں کو پیار کرتی ہے اور میرے ہاتھ چومتی ہے اور کہتی ہے "رابرٹ! میرے سامنے جو بھی تمھاری بُرائی کرتا ہے میرا جی چاہتا ہے اُس کا منہ نوچ لوں۔" وہ اکثر کہا کرتی تھی "رابرٹ مجھے دھوکا نہ دینا۔" اور میں بڑی خوب صورتی سے اسے اپنی جھوٹی محبّت کا یقین دلایا کرتا تھا۔ ڈورتھی پرسوں تک روتی رہی ہوگی اور اس کے ماں باپ میری موت پر دل میں خوش ہوں گے۔ آج ڈورتھی صرف اُداس ہوگی اور کل؟ کل؟

بل کو یاد آیا ایک مرتبہ کان میں چند آدمی دب گئے تھے۔ تلاش کرنے والوں میں میں بھی تھا۔ پہلے دن تو میں گرم جوشی سے کھدائی کرتا رہا مگر دوسرے دن میری رفتار سست ہوگئی تھی اور مجھے مرنے والوں پر غصّہ آنے لگا تھا۔ آج بھی اگر اب تک ہماری لاشوں کی تلاش میں کان کے مالکوں کے حکم پر کھدائی ہو رہی ہوگی تو کھدائی کرنے والے دل ہی دل میں کوس رہے ہوں گے۔ کس قدر مشکل ہوتی ہے ایسی کھدائی۔ مسلسل محنت کے باوجود ہر شخص دن بھر میں دس بارہ یا پندرہ فٹ سے زیادہ نہیں کھود سکتا۔ پھر بل اپنی بینک میں پڑی ہوئی بچت کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے امیر بننے اور اپنا بینڈ مرتب کرنے کی دھن میں زندگی کی ہر ضرورت کی توہین کی۔ میں نے مفت نوشی اور مفت خور کہلانا پسند کیا۔ میں دُنیا کے طعنوں پہ بے شرم بن کر مسکراتا رہا۔ میں نے ٹام کی بیوی کی غصیلی نظریں دیکھ کر نظریں جھکالیں اور میرے ہاتھ ٹام کے گھر کے کھانے کی طرف بڑھتے رہے۔ میرے بہرے باپ کے کوٹ میں پیوند لگ گئے اور لوگوں کے گھروں میں جا کر برتن صاف کرتے ہوئے میری بوڑھی ماں کے ہاتھوں کی کھال اُترگئی۔ میں نے شادی نہیں کی اور میں کنجوسوں کے ساتھ پیسے جمع کرنے کے لیے بحث کرتا رہا۔ وہ مجھے گالیاں دیتی رہی۔ میں بے شرموں کی طرح ہنستا رہا۔ میں نے ایک ایک سگریٹ ملنے کی اُمید پہ لوگوں کی خوشامد کی۔ ان کی زبان سے نکلنے والی ہر بات درست قرار دی اور ان کی غلط باتوں پر ان سے بحث کرنے والوں کی مخالفت کی۔ میرے معبود! میں کس قدر ذلیل ہوں۔ اب میرے بینک کی رقم کا کیا ہوگا؟ بینڈ کون مرتّب کرے گا؟ اپنا بینڈ لے کر کون سارے یورپ کا دورہ کرے گا؟ کون؟ کون؟

ہیری نے جو سے کہا "میرے دونوں پاؤں سن ہوگئے ہیں۔ کیا اب میں مرجاؤں گی؟"

"نہیں نہیں ہیری! ابھی تو تم نے پانی پیا ہے۔ ابھی تو تم نے ایک سلائس کھایا ہے... ابھی تو میں زندہ ہوں۔ آؤ میں تمھیں سہارا دے کر چلاؤں۔ تمھارے پاؤں ٹھیک ہوجائیں گے۔" جو ہیری کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے تھوڑی دیر تک چلاتا رہا۔ آخر ہیری کو پیروں میں زندگی محسوس ہونے

Pakistanipoint
Waqar Azeem

لگی اور دونوں بیٹھ گئے۔

میری نے کہا "جو۔ فرض کرو..." وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

"ہاں، ہاں۔ کہو"

"میرا مطلب ہے..." وہ پھر بھی نہ کہہ سکی۔

"کہو۔ میری! کہہ دو"

"فرض کرو۔ جو ہم نہ مرے تو کیا پھر بھی تمھاری امّی مجھ سے نفرت کریں گی ؟"

"اگر ان کا دل پتھر کا نہیں ہے تو نہیں کریں گی"

میری اور جو خوب صورت تصوّرات میں کھو گئے۔ اچانک میری کے دماغ میں ایک خیال آیا اور اس نے جو سے پوچھا "جو ہمارے بچّے بھی تو ہوں گے ؟"

اس سے پہلے کہ جو کچھ کہتا۔ ٹام کی آواز آئی "یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ میری اور جو، یقین کی مثال تمھارے سامنے ہے" ٹام ہنسنے لگا۔ میری اور جو بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگے اور پھر رابرٹ اور ہیری بھی اس ہنسی میں شریک ہو گئے۔

"ہم لوگوں کے اندر جیسے کوئی چیز مر گئی تھی —
اور جو چیز مر گئی تھی وہ اُمّید تھی" (آسکر وائلڈ)

ٹام نے ٹارچ روشن کی اور بڑی مشکل سے اُٹھ کر بیٹھا۔ اُس نے پوری کوشش کر کے آنکھیں کھولیں مگر اسے کسی کی صورت واضح دکھائی نہ دی۔ اس نے رسمی طور پر ہر ایک کا نام لے کر اس کا حال پوچھا۔ کسی نے جواب دیا۔ کوئی صرف "ہوں" کہہ کر چپ ہو گیا۔ ٹام ساری جسمانی قوت جمع کر کے اُٹھا اور اس نے پیشاب کی چھاگل لے کر ہر ایک کے ہونٹ اپنی اُنگلی سے تر کیے پھر وہ اپنی جگہ لوٹ کر دیر تک بے حس پڑا رہا۔ آخر اس نے کہا "دوستو! ٹارچ بھی آخری دموں پر ہے اس لیے میں اسے بند کرتا ہوں"

رابرٹ بولا "بڑے ظالم ہو ٹام! ٹارچ کو بھی نہیں مرنے دو گے ؟"

ٹام آہستہ سے ہنس کر چپ ہو گیا اور سب خاموشی سے پڑے موت کا انتظار کرتے رہے۔ کبھی کبھی کوئی کہتا "میں شاید مر رہا ہوں۔ سارا جسم سُن ہو گیا ہے میرا"

کوئی جواب دیتا "بڑے خوش قسمت ہو۔ میری تو ابھی ٹانگیں ہی سُن ہوئی ہیں"

اور وہ سوچتے رہے، اونگھتے رہے، کھانستے رہے، کروٹیں بدلتے رہے باری باری اُٹھ کر اپنے اور دوسروں کے لب پیشاب سے تر کرتے رہے اور مرنے کی دُعائیں مانگتے رہے۔

وہ ساتوں کسی قبر کے باسی پھولوں کی طرح پڑے تھے۔ ان کے خیالات مر چکے تھے، خواب جیسے خود کہیں سو گئے تھے۔ ہر جسم زندگی کی کشتی ہار چکا تھا۔ ہر جسم پر جیسے منوں بوجھ پڑا ہوا تھا۔ نیم وا آنکھوں کو تاریکی میں زرد اور نیلے سُرخ اور سلیٹی دھبّے دکھائی دیتے تھے۔ کبھی یہ رنگین دھبّے پھیلنے لگتے تو پھیلتے جاتے اور کبھی سکڑنے لگتے تو گھٹتے گھٹتے نقطے سے بن کر رہ جاتے۔ وہ تنگ آ کر آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرتے مگر وہ بھی بند ہونے یا پھر پوری طرح کھلنے سے انکار کر دیتیں۔ کبھی کبھی وہ ایک دوسرے کو مخاطب کرتے مگر اب انھیں ایک دوسرے کی آواز بھی مشکل سے سنائی دیتی۔ ہر ایک کو یوں محسوس ہوتا جیسے دوسرا بہت دُور سے بول رہا ہے۔ ان کے ذہنوں سے زندگی اور موت کا احساس مٹ چکا تھا۔ اب تو انھیں اپنے وجود تک کا احساس نہیں رہا تھا۔

دھپ۔ دھپ۔ دھپ

پال کے ہونٹ لرزے۔

دھپ۔ دھپ۔

ٹام نے بڑی مشکل سے ایک بار آنکھیں کھول دیں۔

دھپ۔ دھپ۔

جو کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز آئی "میر۔ ی... کیا... کیا ؟"

ٹام نے جو کی آواز سُن کر کہا "تو کیا موت کے قدموں کی آہٹ تم نے بھی سُن لی ؟"

"ہاں۔ میں بھی سُن رہا ہوں" رابرٹ کی خوف زدہ آواز آئی۔

"میں تو دیر سے سُن رہا ہوں" ہیری کا لہجہ مضطرب تھا۔

"اس کا مطلب ہے، ہماری دعا آخر قبول ہو گئی" پال کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

چند لمحے سب خاموش پڑے رہے۔ سب کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں سب کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ سب کے کان موت کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔

دھپ، دھپ، دھپ۔

ٹام نے ٹارچ روشن کر دی، ہیری چیخا "کیا کر رہے ہو ؟... ٹارچ بجھا دو"

"نہیں" ٹام نے مطمئن اور فیصلہ کن لہجے میں کہا "میں آج موت کا چہرہ دیکھوں گا"

"پاگل۔ پاگل" پال کو غصّہ آ رہا تھا۔

دھپ، دھپ،

"سُن رہے ہو ؟" ٹام نے کہا

"ہاں۔ ہاں" سب نے ایک ساتھ تیزی سے جواب دیا۔

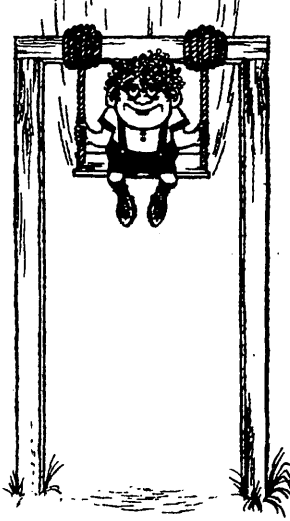

"ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے موت یہاں آنے کے لیے پتھروں میں اپنا راستہ بنا رہی ہے۔" ٹام نے زیرِ لب کہا۔

وھپ۔ وھپ، وھپ،

ٹام کی نظریں کمرے کے ایک کونے کی طرف اٹھ گئیں، جہاں ہوا کا پائپ لگا ہوا تھا۔ وھپ۔ وھپ؛

ٹام تیزی سے اٹھ کر اس کونے کی طرف بھاگا۔ اس نے لوہے کے چھ انچ موٹے پائپ کے ساتھ کان لگا دیے۔ سب آنکھیں پھاڑے ٹام کو تک رہے تھے۔ وھپ وھپ؛

ٹام چیخا۔ "ساتھیو! دوستو! آؤ، یہ موت نہیں ہے، یہ تو زندگی ہماری تلاش کر رہی ہے۔"

ذرا سی دیر میں ساتوں انسان ایک دوسرے پر گر کر پائپ سے کان لگائے ہوئے تھے۔ جب کوئی ضرب پائپ کے عین اوپر پڑتی تو ان کے کان جھنجھنانے لگتے۔ اچانک رابرٹ نے فرش پر لیٹ کر پائپ سے منہ لگا دیا اور بُری طرح چیخنے لگا۔ وہ چیخ رہا تھا کہ ٹام نے اسے کھینچ کر خاموش ہونے کے لیے کہا اور وہ خود پائپ کے منہ سے کان لگا کر رابرٹ کی چیخوں کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ انتظار کا ایک لمحہ دوسرا لمحہ سب کو ایسا لگ رہا تھا جیسے تین دن گزر گئے ہوں۔ آخر زندگی نے آواز دی "میں یہاں اکیلا ہوں۔ گھنٹے بھر تک مدد لے کر پہنچ جاؤں گا، انتظار کرو۔"

ٹام پائپ کے نیچے لیٹا رہا۔ بل نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کوئی بیچارہ کمپنی کے حکم پر ہماری لاشوں کی تلاش میں آہستہ آہستہ کھدائی کرتا چلا آ رہا تھا۔"

"اس وقت وہ عین پائپ کے منہ پر کھدائی کر رہا ہوگا۔" ٹیری نے کہا۔

"یہ جگہ ائیر اسٹیشن نمبر بائیس ہے۔ میں یہاں کام کر چکا ہوں" جو نے بتایا۔

"مگر اس اسٹیشن سے ذرا سی دور تو لفٹ لگی ہوئی ہے۔ پھر اسے آتے جاتے ایک گھنٹہ کیوں لگے گا؟" پال نے کہا۔

"لفٹ خراب ہو گی۔ وہ بیچارہ اپنے تراشے ہوئے راستے سے ہو کر جائے گا۔" ہیری نے کہا۔

تقریباً پورے دو گھنٹے بعد پائپ میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور ذرا سی دیر میں تار کے ساتھ ایک ہیڈ فون اور چھوٹا سا اسپیکر نکل آیا۔ ٹام نے جلدی سے اسپیکر لے کر "ہلو ہلو" کرنا شروع کر دیا پھر اس نے ہیڈ فون کان سے لگا لیا۔ "ہم یہاں آٹھ ہیں" ٹام نے کہا مگر ٹام کی اس غلطی کا کسی کو احساس نہیں ہوا۔ ٹام مسکرا رہا تھا۔

پھر ٹلنبے کی ایک پتلی سی نالی پائپ میں سے ہوتی ہوئی آئی۔ اوپر سے ڈاکٹر ہدایات دے رہا تھا۔ "یہ سوپ ہے تم لوگ باری باری صرف ایک ایک گھونٹ پیو۔"

ٹام نے ڈاکٹر سے اس کی ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کر کے اسپیکر ایک طرف رکھ دیا اور بولا۔ "یہ ڈاکٹر بھی آدھے پاگل ہوتے ہیں۔" پھر اس نے سب کو باری باری پانچ پانچ گھونٹ پینے کے لیے کہا۔ پال نے کہا۔ "ٹام سب سے پہلے تم پیو۔"

ٹام ہنستے ہوئے بولا۔ "تم لوگ میری فکر نہ کرو۔ میں تو اب آٹھ دن تک اور کچھ کھائے پیے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں۔"

تقریباً بارہ گھنٹے بعد تین سو کان کنوں کی مسلسل کھدائی نے نو دن ان سات انسانوں کو ایک بار پھر چاند اور سورج کی دنیا میں پہنچا دیا۔ سٹام اسپرنگ اہل قدرت کا یہ کرشمہ دیکھنے کے لیے کان کے باہر جمع تھا۔ ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئی تھیں تاکہ سورج کی چمک ان کی بینائی نہ چھین لے اور باہر ایک ڈاکٹر کان کے منیجنگ ڈائریکٹر کو ٹام کا لطیفہ سنا رہا تھا کہ میں نے جب ٹام سے پوچھا کہ تم نے تو کہا تھا ہم آٹھ ہیں۔ آٹھواں کون ہے؟ تو ظالم کہنے لگا آٹھویں کے متعلق جو اور ٹیری سے پوچھو۔ ان کی شادی کو آج پانچ چھ روز ہو چکے ہیں۔"